

ناول پر مبنی ٹی وی سیریل کی عنقریب پیشکش

پیرائے

رفیعہ منظور الامین

ناشر: انجمن ترقی اردو آئندہراپردیش
اردو ہاں - حمایت نگر حیدرآباد

پیرائے

(ناول)

مصنفہ	_____	رفیعہ منظورالامین
سرورق	_____	رفیعہ منظورالامین
ناشر	_____	انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش
سن اشاعت	_____	۱۹۹۵ء
قیمت	_____	۱۲۵ روپے
تعداد	_____	ایک ہزار
مطبع	_____	بیکن پبلیکیشن اینڈ کمونیکیشن حیدرآباد
جملہ حقوق	_____	بجق ناشر محفوظ ہیں

ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش
 پبلکیشن حبیب اردو ہال، حمایت نگر
 حیدرآباد ۵۰۰۰۲۹

ساری لڑکیوں کے نام جنھیں
اس کا بل نہیں بنایا جاتا کہ ان
میں خود اعتمادی پیدا ہو۔

رفیقہ —

عرض ناشر

زیر نظر ناول کی مصنفہ کا نام ہندوستان کے ادبی حلقوں میں جانا پہچانا ہے یہ ان کا تیسرا ناول ہے اس سے پہلے ان کے دو ناول مقبول ہو چکے ہیں۔ پہلا ناول ”سارے جہاں کا درد“ اور دوسرا ”عالم پناہ“۔ موخر الذکر ناول کے تین ایڈیشن شائع ہوئے ہیں اور چوتھا زیر طبع ہے۔ ”عالم پناہ“ کو ہندوستان گیر شہرت ہوئی یہ ہندی اور کنڑی زبانوں میں بھی شائع ہوا اور ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ ہندی میں اب اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہونے کو ہے۔ عالم پناہ پر مقبول عام ٹی وی سیریل ”فرمان“ کے نام سے دور درشن سے چودہ قسطوں میں پیش کیا گیا نیشنل چینل پر اور پھر میٹرو چینل پر بھی اسے دکھایا گیا۔ اس سیریل نے قومی سطح کے چار ایوارڈ جیتے۔

انہوں نے دہڑھ سو سے زائد کہانیاں لکھی ہیں جو ملک کے مقتدر رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ بیرون ملک بھی ان رسائل میں چھپی ہیں جو امریکہ اور یورپ سے نکلتے ہیں۔ ان کہانیوں کا ملک کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ ان میں تلگو، کنڑی، ملیالم، مراٹھی، ہندی اور انگریزی قابل ذکر ہیں۔ انگریزی ترجمے Indian Express اور Times of India جیسے مقتدر روزناموں میں شائع ہو چکے ہیں۔ اور انگریزی زبان میں جلد ہی کتابی شکل میں منظر عام پر آ رہے ہیں۔ اردو میں ان کہانیوں کا مجموعہ ”دستک سی درد دل پر“ شائع ہو چکا ہے۔

انہوں نے اسٹیج، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لئے بھی ڈرامے لکھے۔
 ریڈیو اور ٹی وی نائٹ ملک کے کئی ریڈیو اسٹیشنوں اور دور درشن
 کیندروں سے نشر ہو چکے ہیں اور بہت مقبول ہوئے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو کے
 قومی پروگراموں میں ناول عالم پناہ پر مبنی ریڈیائی سریل (۱۸) قسطوں میں نشر
 ہو چکا ہے۔ انھیں یو پی اردو اکیڈمی اور آندھرا پردیش اردو اکیڈمی سے اوارڈ
 بھی مل چکے ہیں۔

یہ سائنس کی طالبہ ہیں انھوں نے عام فہم زبان میں سائنس کے کئی
 موضوعات پر مضامین لکھے جو ”سائنسی زاویے“ کے نام سے کتابی شکل میں
 شائع ہو چکے ہیں ان مضامین کا تبصیر ایڈیشن ترقی اردو بورڈ کی طرف سے دلی
 سے شائع ہونے جا رہا ہے۔

موصوفہ ایک اچھی براڈ کاسٹر ہیں۔ ان سے لئے گئے انٹرویو ملک کے
 کئی ریڈیو اسٹیشنوں اور دور درشن کیندروں سے نشر ہوتے رہتے ہیں۔ پچھلے
 دنوں جب وہ لندن گئیں تو BBC نے بھی ان سے انٹرویو لیا جو ان کی
 General Overseas Service میں نشر ہوا۔

مصنفہ دنیا کے کئی ملکوں میں گئی ہیں امریکہ اور انگلستان میں کافی
 عرصہ رہی ہیں اور ہمارے ملک کی اہم media personalities میں
 ان کا شمار ہوتا ہے

بر صغیر ہند میں مغربی گھاٹ کا سلسلہ دور دور تک چلا گیا ہے۔
 بائیس سو چھیاسی میٹر کی بلندی پر خوشگوار نیلگیری پہاڑیوں میں ایسا لگتا ہے
 جیسے وہاں قدرت کی چابکدستی کے کئی راز پوشیدہ ہیں۔۔۔۔۔ بحیرہ عرب سے
 چھاگلین بھر بھر کر بادل اڑتے پھر چائے اور کافی کے باغات پر فراخ دلی سے
 برس جاتے ہیں۔ یوکلپٹس کے جھنڈ جب ہلکی ہوا میں سرسراتے ہیں تو وہاں
 ماحول پر اسرار اور رنگین ہو جاتا ہے۔ یہاں نہ گرمی سوختہ گلو ہے نہ سردی تلخ
 بستہ۔ سال بھر ٹیپر پھر بارہ اور بیس ڈگری سیلیس کے مابین ہی اٹھکیلیاں کرتا
 ہے۔

برگڈیر اختر بخت جب اپنے عہدے سے سبکدوش ہوئے تو انہوں نے
 مغربی گھاٹ میں واقع، خوبصورت ہل اسٹیشن اوٹی میں ہی سکونت اختیار
 کر لی۔ اس کی ایک وجہ ان کی بیگم تھیں جن سے گرمی بالکل برداشت نہیں
 ہوتی تھی۔ اپنے شوہر کے دوران ملازمت تو انہوں نے کٹھن سے کٹھن
 تعیناتی کو خندہ پیشانی سے برداشت کر لیا تھا جس کا احساس اختر بخت کو تھا۔
 عام طور پر نوکری سے سبکدوش ہونے پر لوگ اپنے وطن مالوف کا رخ

کرتے ہیں لیکن اختر بخت کا تعلق شمالی ہندوستان سے ہونے کے باوجود انہوں نے جنوب کو اپنا مسکن بنایا۔ الہ آباد میں ان کا آبائی بزنس تھا اور جاسیداد بھی تھی لیکن شروع ہی سے انہیں خرب کوڑیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بیگم کے ماسوا خود انہیں نیلگری کے نیلگوں ماحول سے عشق ہو گیا تھا۔ ان کا قول تھا کہ:

پو تھی پڑھ پڑھ جگ مو اپنڈت بھیانہ کوئے

بڈھ اکھشپر بریم کا پڑھے سو پنڈت ہوئے
(کبیر)

خاندانی مخالفت کے باوجود انہوں نے ڈیفنس اکیڈمی کا کڑا امتحان دیا تھا اور پاس بھی ہو گئے۔ مگر جہاں ہر وقت لین دین، روپیہ پیسہ معرض بحث میں آتا، وہاں اختر بخت کا فیصلہ ان کی قوت ارادی اور ثابت قدمی کو ظاہر کرتا تھا۔ یہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ تھا۔ کیونکہ ان کی زندگی نے بزنس کی پوتھیوں کو پھلانگ کر ایک نیاموڈ لیا تھا۔ اکیڈمی کا یہ قابل فخر کیڈٹ، ترقی کی منزلیں طے کرتا گیا۔ پھر محبت اور شادی بھی کی تو بیگم نے ان کی زندگی کی رہی سہی کسر پوری کر دی۔ شادی کے بارے میں بھی ان کے پیمانے بڑے تھے۔ اس لئے جب تک بیگم جیسی ہستی ان کے پیمانے پر پوری نہ اتری انہوں نے کئی ممکنات و مسماتہ کو رد کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ شادی شدہ زندگی کی سرحد میں انہوں نے کافی توقف کے بعد ہی قدم رکھا۔

جب نوکری سے سبکدوشی کا وقت آیا تب قدرت نے اوٹی جیسا مرغزار ان کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

وطن واپس ہوتے ایک انگریز سے انہوں نے اس کی کوٹھی جوں کی توں معہ ساز و سامان خرید لی۔ نہ صرف یہ بلکہ اطراف و اکناف میں چائے کے باغ بھی انہیں حاصل ہو گئے۔ اپنی بیوی کے علاوہ اگر انہوں نے کسی حسین چیز سے محبت کی تھی تو وہی کوٹھی اور اس سے ملحق باغات تھے۔ وہ کشادہ اور ہوادار کوٹھی چائے کے سبزہ زار میں نیگینے کی طرح جہی تھی۔۔۔ جالی دار بالکونیاں۔ فرانسسی درجے اور اونچی چھتوں والا بنگلہ، مشرق اور مغرب کے آرکٹیکر کا بہترین امتزاج تھا۔ آنچل پسارے دو ب کی چادریں ہزار ہا رنگین پھولوں کو سمیٹے رہتیں۔ شوقین بدلیسی نے جہاں فیض آباد گلاب باڑی کے گلاب سجا رکھے تھے وہیں ہالینڈ کے ٹیولپ بھی تھے جن کے کٹورے پاکیزہ تابندہ شبنم سے بھر جاتے۔ ہائی سینتھ کے جھنڈ کے جھنڈ بھی ضرور اس کے پسندیدہ پھول رہے ہونگے۔ مغربی بالکونی سے سورج کے غروب ہونے کا نظارہ قابل دید ہوتا۔

شام کی چائے وہ اور بیگم وہیں لیا کرتے۔

ان کی لڑکی شاہ نور اسی ماحول کی دین تھی جبکہ لڑکا التمش جبلیور میں پیدا ہوا تھا۔ التمش، شاہ نور سے پورے چھ سال بڑے تھے۔ شاہ نور نازک حسین گلخوار طرحدار اور اپنی ماں جیسی تھیں جبکہ التمش بالکل اپنے والد پر گئے تھے۔ قد اور وجاہت میں وہ بے لاگ بڑھتے گئے کہتے ہیں کہ انسان لاکھ

بدل جائے لیکن اس کا خمیر وہی رہتا ہے۔ التمش جبل پور کی پیداوار تھے جہاں کے بھیرا گھاٹ، مشہور زمانہ ہیں۔ سنگ مرمر کی سنگلاخ چٹانیں اور ان کی آغوش میں زربد اکا ساکت پانی جو بزبان خود اپنی گہرائی کا غماز ہے جو کہیں نیلگوں نظر آتا ہے تو کہیں سبزگوں، کہیں اس میں سرخی کی شوخی جھلکنے لگتی ہے ناؤ میں بیٹھے، جھک کر اس پانی میں دیکھئے تو عکس نظر نہیں آتا، وہ ان

رنگوں میں گپھل کر مدغم ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔ ایسے ہی تھے التمش بچپن سے! خود سر، زبردست قوت ارادی کے مالک، مطلق العنان یہ سب کچھ ان کی نکھرتی ہوئی شخصیت پر بجا بھی تھا۔ ان کی یہی تہہ دار شخصیت، اختر بخت کے لئے فکر کا باعث تھی کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ بیٹے کے یہ اوصاف اما کی بلندیوں کو چھو جائیں۔

کوٹھی میں تیسرا بچہ مسیح تھا۔ بڑی بڑی نیلی آنکھوں اور گوری گوری رنگت والا۔۔۔ اسے بھی بیگم اور اختر بخت کا پیار حاصل تھا۔ اس کی آنکھیں تھیں ہی ایسی جو غیروں کو بھی ملتفت کر دیتی تھیں لیکن ان آنکھوں میں ایک عجیب سا شہراؤ تھا۔ ایک بے نام سی جھجک۔۔۔۔۔ التمش، شاہ نور اور مسیح جیسے ماؤتھ آرگن کے تین سر تھے جس میں مسیح مدہم تھا لیکن ایسا سر جس کے بغیر راگنی مکمل نہیں ہوتی کئی موقع ایسے آتے تھے جب کسی احساس کے تلے وہ دب کر رہ جاتا تھا کبھی اختر بخت اور بیگم بالکونی میں بیٹھے چائے پی رہے ہوتے اور تینوں بچے اچھل پھاند کرتے وہاں پہنچ جاتے۔ ان کے تہمتائے چہرے بتاتے کہ وہ ابھی دوڑ لگا کر آرہے ہیں۔ سانس پھولا ہوا، قدم لڑکھڑائے۔۔۔ آتے ہی

التمش اور شاہ نور بسکٹ کی پلیٹ پر ہاتھ مارتے لیکن مسیح وہیں ریلنگ کے پاس ٹھٹک جاتا اور جب تک بیگم یا اختر بخت خود اسے بسکٹ اٹھا کر نہیں دیتے وہ اس پلیٹ کی طرف دیکھتا تک نہیں۔

کیونکہ مسیح، ڈورا کا بیٹا تھا جو اس کو ٹھی کی ملازمہ تھی۔ اس دنیا میں خدا نے سب کو مساوی بنایا ہے۔ لیکن کچھ لوگ دوسروں کے مقابلے میں شاید زیادہ، مساوی، ہوتے ہیں۔

جب اختر بخت اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ اس پر فضا کو ٹھی میں فروکش ہونے کو آئے تو بیگم اچانک بیمار پڑ گئیں۔ چائے باغاں میں شہر سے دور کوئی خاص طبی سہولتیں میسر نہیں تھیں۔ تب ڈاکٹر نارٹن کی تجویز پر مشن ہسپتال سے ڈورا کو طلب کیا گیا۔ ڈاکٹر نارٹن کو اس پر پورا بھروسہ تھا بیگم کے صحت یاب ہونے پر ڈور انعام و اکرام کیساتھ واپس ہوئی لیکن اپنی خدمت گزاری کی یاد بیگم اور اختر بخت کے دلوں میں چھوڑ گئی۔ اس کے جانے کے بعد بیگم کو اور کوئی پسند ہی نہیں آتا تھا۔ باغ میں کام کرنے والی کئی عورتیں خدمت کے لئے تیار تھیں لیکن ان میں اور ڈورا میں استنا ہی فرق تھا جو ایک خود رو بوٹی اور ایک سینچے ہوئے پودے میں ہوتا ہے۔ ڈورا کا احساس ذمہ داری، چستی اور کارکردگی اسی کا حصہ تھی، جس کی بیگم عادی ہو گئی تھیں۔ پھر شاہ نور پیدا ہوئیں۔ کئی آیائیں بدلی گئیں، کوئی بھی ڈورا کی جگہ نہ لے پایا۔ ڈورا کو بلایا گیا لیکن اس نے عذر داری کر دی۔ پھر بھی بیگم کی خاطر اختر بخت نے ہمت نہیں ہاری۔ سچ نہیں کیوں انہیں یقین تھا کہ

ڈورا ضرور آئے گی۔

”ہم اسے اس کی توقع سے زیادہ تنخواہ دیں گے۔۔۔ انہوں نے اپنے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

لیکن جب وہ خود ڈورا کو لینے کے لئے پہنچے تو سہ چلا کہ ڈورا کی مجبوری پیسہ نہیں بلکہ اس کا دو سال کا بچہ تھا۔

”سرکار میں آتا تھا۔۔۔۔ ڈورا نے چادر سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا۔
”مگر یہ، میرا بچہ مسیح۔۔۔۔ اس نے پاس بیٹھے گول مٹول، سرخ و سپید رنگت والے بچے کی طرف اشارہ کیا۔۔۔ بچہ اپنی بڑی بڑی نیلی آنکھوں سے کبھی اختر بخت اور کبھی ڈورا کو دیکھتا رہا۔

”۔۔۔۔۔ یہ تمہارا بچہ ہے؟“۔۔۔۔۔ اختر بخت اپنا تعجب نہ چھپا سکے۔
انہوں نے سمجھا تھا کہ ڈورا کس بدیسی کے بچے کی آیا گری کر رہی ہے۔
رات کے بطن سے صبح ہوتی تو سب دیکھتے ہیں لیکن مسیح ڈورا کا بچہ ہے یہ ماننا ذرا مشکل ہی تھا۔

”سرکار!“ ڈورا نے کچھ کھسیا کر کچھ زچ ہو کر کہا۔۔۔۔ وہ لوگوں کی نظروں میں حیرت و استعجاب اور غیر یقینی دیکھ دیکھ کر تنگ آ گئی تھی۔۔۔۔
”اسے ہی تو کہیں نہیں چھوڑ سکتی!“

”اس میں پریشانی کی کیا بات ہے“۔۔۔۔۔ اختر بخت کا برسوں کا ڈسپلین کام آیا ”تم اسے ساتھ لے آؤ۔ لقمش اور شاہ نور کو ایک ساتھی مل جائے گا۔“

”بے بی کسکا مانگ ہے؟“۔۔۔۔۔ ڈورانے بات کا دھارا موڑا ”آپ کا یا مسم صاحب کا؟“

”اب تم خود چل کر دیکھ لو“۔۔۔۔۔ اختر بخت نے مسیح کے موٹے پیٹ میں انگلی گھسیڑ کر کہا اور گد گدی سے وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

”چلے گا ہم“۔۔۔۔۔ ڈورانے غور سے مسیح کو دیکھا اور حامی بھر لی۔
گو یا اس کا جانا یا نہ جانا مسیح کی قبولیت پر منحصر تھا۔

اور اختر بخت ڈورا اور مسیح کو ساتھ لے آئے۔ طے یہ پایا کہ ڈورا مسیح کے ساتھ انیکسی میں رہے گی جو کچن کے پچھواڑے سے سیدھیاں اتر کر جانے پر کچھ ہی دور بنی تھی۔ ڈورا کو اب مسیح کی کوئی فکر نہیں تھی کیونکہ وہ اختر بخت اور بیگم کی فراخ دلی سے واقف تھی۔

اسی خوشگوار ماحول میں مسیح بھی پرورش پانے لگا۔ حتیٰ کہ جب وہ اسکول جانے کے قابل ہوا تو اختر بخت اس کے گارڈین بن کر التمش ہی کے اسکول Love Dale میں اسے پڑھانے کے لئے تیار تھے۔ جہاں ممتول گھرانوں ہی کے لڑکے تعلیم پاتے تھے۔ لیکن ڈورانے اسے عیسائی مشن اسکول میں داخل کروانے پر زور دیا۔ چنانچہ اختر بخت اور بیگم نے اس کی خواہش کا احترام کیا۔

جب اختر بخت اور بیگم کسی پارٹی میں گئے ہوتے تو شاہ نور پیا نو پر جا بیٹھتی، مسیح بانگو سنبھالتا اور التمش گٹار اور پھر وہ موسیقی جہنم لیتی کہ باخ اور بیٹھوون بھی نخل ہو جاتے ہونگے۔ وہ دھملجو کڑی محتی کہ ڈورا کا احتجاج

نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کر رہ جاتا۔ دوسری مصروفیات میں شاہ نور کو صاف کاٹ دیا جاتا۔۔۔۔۔ مثلاً دوپہر میں گر گٹوں کی دم پکڑ کر چپک پھیریاں دینا یا نیلگہری کی اودی اودی پہاڑیوں میں گھوڑے دوڑاتے وقت شاہ نور کو اس کے عورت ہونے کا شدید احساس دلایا جاتا۔ مسیح کی سفارش کا بھی التمش پر اثر نہیں ہوتا اور آخر کار ٹھنکتی۔ بسورتی شاہ نور کو مسیح چکار کر یقین دلاتا کہ بلندیوں سے واپس ہوتے ہوئے اس کے لئے آرکڈ کے پھول لائے گا۔ کسن شاہ نور آرکڈ اور سورج مکھی کے فرق سے ناواقف تھی لیکن چونکہ بیگم آرکڈ کی دلدادہ تھیں تو وہ بھی اس کی اہمیت کو آنکھ بند کر کے مان لیتی۔

”پریوں والا پھول ہوتا ہے یہ!“ مسیح اسے مٹھارتا۔

”اور تم کیا لاو گے تامش؟“ مسیح کو آزاد کر کے وہ التمش سے بھی تاوان وصول کرنا چاہتی۔

”تربوز۔۔۔۔۔ چریل کہیں کی۔۔۔۔۔ التمش گھوڑے کو ایڑ لگا کر یہ جا وہ جا ہو جاتے اور وہ پہاڑی بلندیوں کے سبزہ زار میں دور تک سفید گھوڑوں کی ہوا میں لہراتی ہیں دیکھتی رہ جاتی اور دل ہی دل میں تازہ ترین قسم کھاتی کہ ”اگر آج می سے اس تامش کے بچے کی شکایت ناک ہو تو شاہ نور نام نہیں۔۔۔۔۔ وہ التمش کو تامش ہی کہا کرتی تھی۔۔۔۔۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوتا کیونکہ جب وہ ہانپتی گھر پہنچتی تو پیاس کی شدت اسے ریفریجریٹر کی طرف کھینچ لے جاتی اور پھر پانی میں سارا غصہ ڈھل جاتا۔ ایک روز تو اس نے طے کر لیا

تھا کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹے گی نہیں۔ التمش اور مسیح کے جانے کے بعد وہ اسی طرح پتھر پر ڈٹی رہی کہ غصہ اپنی جگہ بنا رہے۔۔۔ ملزموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کا یہی طریقہ ہو سکتا تھا۔

”التمش جب واپس آئے تو دیکھا شاہ نور وہیں پتھر پر تتلی کی طرح جمی ہو گئی تھی۔ مسیح اور التمش نے ایک دوسرے کو دیکھا اور گھوڑوں سے اتر آئے۔ مسیح کی نظر کہہ رہی تھی، ہم نہ کہتے تھے لے چلو اسے بھی، التمش کو بھی احساس جرم تھا لیکن وہ اسے ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے گھوڑے کی لگام مسیح کو تھمائی اور جھک کر بہن کو اٹھالیا۔ انہیں سوئی ہوئی شاہ نور پر بڑا محبت بھرا ترس آیا شاہ نور نے آنکھیں کھولیں اور بھائی کے گلے میں بائیں ڈالے پٹ گئی۔ شاید اس نے التمش کے دل کی کیفیت جان لی تھی۔۔۔ لیکن انہیں سزا دلوانے کا زرین موقع ہاتھ سے جاتا رہا۔

”ان تینوں کا بچپن بائیسوں میں بائیس ڈالے گزرا لیکن ہوشمندی نے طبقاتی فرق کی بنیاد رکھی۔

”کھلنڈر ا زمانہ ختم ہوا تو اختر بخت نے فیصلہ سنایا کہ التمش کو اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان جانا ہوگا۔ بیگم اپنے کچی عمر کے لڑکے کو ہر قید و بند سے آزاد انگلستان بھیجنے کی سخت مخالف تھیں اور خود التمش عمر کے اس دور سے گزر رہے تھے جہاں مانیپ اور فیملی کے بندھن بہت مضبوط ہوتے ہیں اور گھر جنت مقام۔ انہوں نے خود اس ظلم کے خلاف آواز اٹھائی، لیکن اختر بخت کے ارادے پتھر کی لکیر ہوتے تھے ان کا خیال تھا کہ آنچل کی اوٹ میں دیا بن

کر جلنے والا لڑکا مردانگی سے دور ہو جاتا ہے۔۔۔ ایک حد تک ذہنی نشوونما کے بعد ہر لڑکے کو اس وسیع و عریض دنیا میں جھونک دینا چاہیئے جہاں تجربوں ہی سے وہ اپنی شخصیت بنا کر خود کو مستقبل کے لئے تیار کر سکتا ہے۔ انہوں نے خود اپنی فوجی تربیت انگلستان میں سینڈہرسٹ کے شہرہ آفاق ادارے میں حاصل کی تھی۔ ان کی تمنا تھی کہ انکا بیٹا بھی ان کی طرح ایک کامیاب فوجی بنے لیکن انہوں نے ایک سلجھا ہوا اور متین دماغ پایا تھا۔ وہ گھوڑ دوڑ میں غلط گھوڑے پر داؤں لگانے کے نتائج سے واقف تھے۔ زبردستی التمش پر اپنی آرزو کا بوجھ لادنا، التمش کے مستقبل کو ہلاک کرنے کے مترادف ہوتا۔ گو التمش میں ایک کامیاب فوجی بننے کی ساری ہی صلاحیتیں موجود تھیں۔ لیکن انکار حجان آرکیالوجی کی طرف تھا۔ انکی دلچسپی دیکھ کر اختر بخت نے اپنی پیش بہالائبریری کے آرکیالوجی گوشے میں کارآمد اور مشہور کتابوں کا اضافہ کیا تھا۔ ان دنوں انگلستان کے مشہور آرکیالوجسٹ سر مارٹین و ہیلر کی کتاب انڈس ویلی سویلنائزیشن کا بڑا چرچا تھا۔ اخباروں میں اس پر کافی بحث مباحثے ہو رہے تھے۔ اپنی چھوٹی عمر میں ہی آرکیالوجی کے ایک سیمینار میں التمش نے اس پر اپنا پیپر پڑھا۔ پیپر بہت پسند کیا گیا تب اختر بخت کو یقین آیا کہ التمش میں واقعی ایک اچھے آرکیالوجسٹ بننے کی صلاحیت موجود تھی، التمش نے وطن چھوڑ دیا۔

اوٹی کی رنگین ماحول سے دور سطح مرتفع دکن میں کاکل رہتی تھی۔۔۔ کاکل کا اصلی نام کاکل اسکے شاعر والد فدا حسین فدائے ہی رکھا تھا۔ زندگی میں

شاید یہی ایک کام انہوں نے قرینے کا کیا تھا۔ کیونکہ اس خوبصورت لڑکی کا نام جس کی ریشمی شب گیر زلفیں تھیں کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

زندگی کے نام پر جو کچھ بھی کا کل کو سیر تھا، کچھ ایسا برا بھی نہیں تھا۔ گو باپ امیر کبیر نہیں تھے لیکن اسکی ماں شاہدہ کی تنخواہ میں بھلی بری گزر رہی جاتی تھی۔ ہم اگر خود خوش رہنا چاہیں تو یہ بہت آسانی سے ہو سکتا ہے لیکن جب ہم دوسروں سے زیادہ خوش رہنا چاہیں تب مشکل پیش آتی ہے کیونکہ ہم جہنیں خود سے زیادہ خوش سمجھتے ہیں درحقیقت وہ اتنے خوش نہیں ہوتے شاہدہ خوشی کی اس گردان کو زرین قول سمجھتے ہوئے صبر اور شکر کے ساتھ زندگی کا تانا بانا جوڑتی رہیں۔

فدا حسین جیسے بھی تھے شاہدہ نے ان سے دل کا سودا کیا تھا۔ کالج کی بہت سی ایسی لڑکیاں تھیں جو ان پر مرتی تھیں۔ انکی رومانی شاعری کو کلچے سے لگائے رکھتی تھیں لیکن جیت شاہدہ کی ہی ہوئی تھی۔

یہ تو شاہدہ کو بعد میں پتہ چلا کہ فدا حسین نے شاعری کے علاوہ کچھ سیکھا ہی نہیں تھا۔ شاعری بھی ان کی اتنی جاندار کہاں تھی۔ بس ترنم اٹکا غضب ڈھاتا تھا۔ سننے والوں کو مسحور کر دیتا اور پھر ان کی جاذب نظر شخصیت اس لئے جہاں سامعین کو اکٹھا کر کے مشاعرے برپا کرنے والی بات ہوتی وہاں فدا حسین کو ضرور مدعو کیا جاتا۔ ان کی شراب، شباب، کباب والی شاعری پر ٹکٹ خرید کر آئے لوگ بل کھا کھا کر ”پھر سے پڑھے جی“ کے تابڑ توڑ نعرے لگاتے۔۔ اچھے اچھے شاعروں کی چھٹی ہو جاتی اور میدان ان کے ہاتھ

رہتا۔ وہ شراب کا ذکر کچھ اس طرح کرتے کہ معمولی ٹھرا بھی نشیلا غبار بنکر محفل پر چھا جاتا۔ شباب، زلف و رخسار کی تکرار پر عورتوں کی محفل میں پش پڑ جاتی جیسے فدا کا ہر شعر ان پر چسپاں ہو رہا ہو۔

زندگی میں کوئی کام فدا نے سنجیدگی سے نہیں کیا۔ ایک بار کسی تاجر کی نوکری کی۔ شومئی قسمت سے وہ بھی شاعری میں مبتلا نکلا۔ فدا نے اسکی شاعری پر تصحیح کے وہ وہ کوڑے برسائے کہ وہ ادھ موا ہو گیا پھر بھی شاعری کے میدان میں ڈنار ہا لیکن فدا کی چھٹی ہو گئی۔

اچھا کھانے اور اچھا پہننے کا انہیں بہت شوق تھا۔ جامہ زیب تھے۔ ہر لباس میں سجیلے لگتے تھے۔ ان کے سارے ہی شوق بیوی کے سہارے پورے ہوتے۔ پھر بھی کاکل نے اپنی ماں سے کبھی کوئی حرف شکایت نہیں سنی۔ دراصل انسانوں میں بھی کچھ اکاس بیلین ہوتی ہیں جو کسی پیر کے سینے میں اپنی جڑیں گڑودیتی ہیں اور سدالپنے میزبان کی زندگی کا رس چوستی ہیں۔ پھر بھی وہ پیر انہیں جھٹک نہیں پھینکتا۔ اپنا دامن نہیں چھڑاتا Empathy ایٹھتی اسے ہی تو کہتے ہیں۔ سچ تو اس وقت چلتا جب میزبان پیر اپنی زندگی کے لبو کی آغری بوند بھی خود غرض مہمان کو سونپ دیتا ہے۔۔ سوکھ جاتا ہے

کاکل کی ماں کی زندگی سے صرف اسکے والد ہی استحصال نہیں کرتے رہے بلکہ دروازہ کھلا دیکھا تو ایک رہزن اور بھی گھس پڑا جس نے بالاخر انکی جان ہی لیکر چھوڑی۔ پیٹ کا درد بہانہ بن گیا جسے وہ مالتی رہیں۔ شاہدہ کی ذمہ داریاں ہی کچھ ایسی تھیں کہ وہ چھٹی لیکر آرام نہیں کر سکتی تھیں، علاج

تو در کنار فدا نے خود کے علاوہ کب کسی اور کو قابل توجہ سمجھا تھا؟ شاہدہ تو ایسی مشین تھی جو انکے خیال میں کبھی خراب ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ بھی نہیں تھا کہ فدا بیوی اور بیٹی کو پیار نہیں کرتے تھے۔۔۔۔۔ کرتے تھے، لیکن انکا اپنا ڈھنگ تھا۔ کبھی کبھار مشاعروں سے سو دو سو کمالات تو شراب کی دوکان کے سامنے سے لپٹاتے ہوئے گذر جاتے۔ کیونکہ اس پیسے پر انکی بیوی اور بیٹی کا حق تھا۔ یہ انکے تتیں بہت بڑی قربانی تھی۔ اور یوں لاکر پیسے شاہدہ کے ہاتھ میں تھما دیتے جیسے کسی امیر کبیر کے خزانے پر ہاتھ صاف کر آئے ہوں۔ شاہدہ کبھی تھکی ہوئی اور اداس نظر آتیں تو کندھے پر پیار سے ہاتھ رکھ کر کہتے ”شاہدہ تم بس ہنسی رہا کرو۔ تمہاری مسکراہٹ کے دیوانے ہیں ہم تو۔۔“ وہ اس حقیقت سے بے بہرہ تھے کہ بعض وقت ہنسی خریدنا کتنا مہنگا پڑتا ہے۔ شاہدہ پھر بھی انکی خاطر گھانے کا سودا کرتی رہیں حتیٰ کہ پیٹ کا کینسر لا علاج ہو گیا۔ اور ایک دن وہ مسکراہٹ جسکے فدا دیوانے تھے شاہدہ کے ہونٹوں پر دوامی ہو گئی۔

شاہدہ کے مرنے پر فدا نے دردناک شاعری ضرور کی لیکن بیوی کی موت سے جو کٹھنایاں کھڑی ہوئیں انکے لئے سنیہ سپر نہیں ہو سکے۔

زندگی کا جو ڈھانچہ شاہدہ نے تیار کیا تھا بہت دنوں تک افتاد زمانہ سہہ نہ سکا۔ کچھ پیسہ جو انکے مرنے پر ہاتھ آیا تھا اس سے کام چلتا رہا۔ جب جمع پونجی برف کی طرح پگھل کر ختم ہو گئی تب زندگی کی حقیقتوں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔ لیکن تب بھی فدا حسین نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ

اور کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ قدرت نے انہیں گوندھا ہی ایسی مٹی سے تھا کہ ہمیشہ انہیں سنوارے رکھنے کیلئے کسی اور کے دو ہاتھوں اور فدائیت کی ضرورت تھی۔ شاہدہ کمال خوبی سے یہ فرض انجام دیتی رہی تھیں۔ ایک غیر مشروط فدائیت۔۔۔۔۔ کبھی فدا حسین کی نااہلی کی وجہ سے شاہدہ کے ابرو پر بل نہیں آیا۔ شائد سچی محبتیں ایسی ہی ہوتی ہیں کہ انسان کانٹوں کو بھی پھولوں کی طرح سینے سے لگا لیتا ہے۔

بیٹیاں ماں کے اوصاف بڑی خاموشی سے اپنالیتی ہیں۔ کاکل نے بھی ماں کا حوصلہ پایا تھا۔ چھوٹی سی عمر میں وہ اپنے گھر کے حالات بہت اچھی طرح سمجھ گئی تھی اس نے اپنی ماں کا استحصال ہوتے دیکھا تھا۔ لیکن یہ بھی جانتی تھی کہ اسکے والد نے جان بوجھ کر اسکی ماں سے لاپرواہی نہیں کی تھی۔ ایک بار جب اسکی ماں بیمار ہوئیں تو بسنے اپنے والد کی پریشانی دیکھی تھی۔ وہ رات بھر شاہدہ کے سرہانے بیٹھے رہے لیکن انہیں سلیقہ تک نہیں تھا کہ دوائی کب اور کتنی دینی ہوگی۔

اور اب، شاہدہ کی موت کے بعد وہ تاش کے پتوں کا گھر ہو کر رہ گئے تھے جسے ہوا کا ہلکا سا جھونکا بھی لرزادیتا ہے۔

کاکل نے بھی ماں کا غم جھیلا تھا لیکن کتنا فرق تھا دونوں کے المیہ میں۔ بجائے اسکے کہ فدا حسین بیٹی کے لئے ڈھال بن جاتے۔ ڈھارس بندھاتے، خود کاکل کو اپنا غم سینے میں دبائے باپ کی دل جوئی کرنی پڑی۔ ان ہی حالات میں بسنے جیسے تیسی بی، اے کا امتحان دیا۔ وہ جانتی تھی وہ ہرگز کامیاب نہیں

ہوگی لیکن امتحان دینا تو بہر حال ضروری تھا۔ فیس دی جا چکی تھی۔ اور آثار بتاتے تھے کہ وہ اب کبھی فیس دینے کے قابل نہیں ہوگی۔ لیکن جب نتیجہ نکلا تو کاکل کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا کیونکہ وہ اچھے نمبروں سے پاس ہو گئی تھی۔

اب سب سے بڑا سوال آمدنی کا تھا۔ شاہدہ کی ملازمت اور کارکردگی کا جو کچھ معاوضہ ملا تھا۔ اسی پر گزر بسر ہو رہی تھی۔ چند ہی مہینوں میں اسکی تمت بالآخر ہو گئی۔ یہ بات بھی نہیں کہ فدا حسین وقت کے ہاتھ میں ننگی تلوار نہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اچکن میں پہلا پیوند ابھرنے سے پہلے انہیں کچھ کرنا ہوگا۔ مانکا تو پہلے ایک ہی ادھر رہتا ہے اور پھر دامن کو تار تار ہوتے دیر کہاں لگتی ہے!۔ لیکن جدوجہد اور جھیننا جھپٹی کی اس دنیا میں وہ بالکل اجنبی تھے صبح کام کی تلاش میں جاتے اور شام میں تھکے ہارے گرد راہ سفر جو توں پر لئے واپس آتے لمبے لمبے لیٹ کر اپنے جو توں کو تاسف کی نظر سے دیکھتے جن کا بخیہ ایک ایک کر کے ادھرنے لگا تھا۔ کاکل کو ان پر ترس آجاتا۔ جوتے اتار کر وہ ان کے پاؤں دباتی تو سکون سے آنکھیں بند کر لیتے۔ یہ آنکھیں بھی عجیب چیز ہیں کبھی تو ان میں دنیا سما جاتی ہے اور کبھی دنیا اور اس کا ہر خطرہ ہلکوں پر ہی ٹھٹک جاتا ہے۔

کاکل سو حتی کاش وہ خود کسی قابل ہوتی لیکن اسے تو اپنی مائپنگ اور شارٹ پسٹڈ کی ٹریننگ ادھوری چھوڑنی پڑی تھی۔ اسے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ تاریخ اس کا محبوب سبجیکٹ تھا۔ عام مطالعے نے اسے کچی عمر میں غضب کا شعور دے دیا تھا۔ وہ اپنے باپ اور ان کی کمزوریوں کو اچھی طرح سمجھتی تھی

کچھ رشتے، کچھ بندھن کسی کی نااہلی سے ٹوٹ نہیں جاتے۔ لیکن دوسروں کی کمزوریوں کو اپنا سہارا نہیں بنایا جاسکتا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے باپ اسے وہ پدرانہ سہارا کبھی نہیں دے پائیں گے۔ جس کی اسے ضرورت تھی بلکہ پابجائی اسے خود کرنی ہوگی۔ لیکن کاکل کا خیال غلط نکلا۔

ایسے میں الہ آباد کے ایک مشاعرے نے فدا حسین کو ایک ایسے موڑ پر لا کھڑا کیا جس کے آگے بس چھین ہی چھین تھا۔

الہ آباد کے مشاعرے ان کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ نہ ہی وہ حویلی جہاں مشاعرے منعقد ہوتے۔ اس حویلی کی مالک حور بانو ایک متمول بیوہ تھیں۔ وہ ایک تاجر شاہ احمد حسین کی تیسری بیوی تھیں۔ پہلی دو بیگمات اپنا سہرے بغیر ہی دارفانی سے کوچ کر گئی تھیں۔ لیکن وہ خود حور بانو کے لئے اپنا سب کچھ چھوڑ کر سدھار گئے۔ حور بانو شاعری کی دلدادہ تھیں۔ شکل و صورت سے اچھی اور عمر میں بس دوپہر کی دہلیز چھونے کو تھیں۔ انہوں نے فدا حسین کو پہلے بھی سنا تھا۔ مل بھی چکی تھیں۔ ان کے ترنم ہی نہیں تبسم کی بھی دلدادہ تھیں۔ لیکن انہوں نے کبھی فدا حسین کو اس نظر سے نہیں دیکھا تھا جیسے ان کی بیوی کے مرنے کے بعد دیکھا۔

شاہدہ کو مرے چار مہینے گزر چکے تھے۔ چار مہینے۔۔۔۔۔ طویل چار مہینے جبکہ چار گھنٹے ہی مرد کے محل جانے کو کافی ہوتے ہیں۔ کچھ تو چار منٹ میں ہی چھلک جاتے ہیں۔ اسی لئے بیوی کی موت کو کہنی کی چوٹ کہا جاتا ہے۔ لگی تو کاری۔ پل بھر میں بساری۔

فدا حسین حور بانو کی لگاوٹ کی نظر پہچان گئے۔ شاہدہ کے مرنے کے بعد وقت کے اہر من نے انہیں یوں کس کس کر پکھاڑا تھا کہ الامان۔ ننا اہل اور کاہل دماغ بھی کبھی اس تیزی سے چل پڑتا ہے جیسے کئی برسوں سے بند مشین میں نو من تیل ڈال دیا گیا ہو۔ اور یہاں تو رادھا بھی تیار تھی۔ حور بانو کا التفات دیکھ کر انہوں نے بڑی انکساری سے خود کو نکاح کے لئے پیش کر دیا۔

خود اپنے ملک میں جہاں ہم وطنوں کی لیاقت کو استہزا و استحقا کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور اکثر اس کا اعتراف ہوتے چل چلاؤ کا وقت آجاتا ہے وہاں مغرب میں کھلے دل سے کسی کی لیاقت کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ الشمس بھی کامیابی کی منزلیں طے کرتے رہے۔ وہ انگلستان میں تھے لیکن ہندوستان کے دور غلامی کے خاتمے کے بعد انگلستانی ذہنیت میں تبدیلی کی رفتار سست تھی اہل انگلستان اب بھی اس فراخ دلی سے کسی ہندوستانی کی کامیابیوں کو تسلیم نہیں کر رہے تھے جس کا وہ مستحق تھا۔ الشمس کو وہاں دنیا کچھ تنگ سی لگ رہی تھی اسی لئے بہتر مرغزاروں کی تلاش میں وہ انگلستان سے امریکہ چلے گئے جہاں انہیں زیادہ صحت بخش ماحول میں کام کرنے کا موقع ملا وہاں وہ آر کیا لو جسٹوں کے ایک ایسے گروپ سے منسلک ہو گئے جو بڑی سنجیدگی سے اپنی ذمہ داری نبھاتا تھا۔ اس گروپ کو فیڈرل سرپرستی حاصل تھی۔ الشمس کی مصروفیات بڑھتی گئیں اپنے کام کے سلسلہ میں انہیں دنیا بھر کا تجربہ حاصل

ہونے لگا حتیٰ کہ شاہ نور کی شادی میں بھی وہ مشکل سے دودن کے لئے آپائے کیونکہ آثار قدیمہ کے ایک ایکسپڈیشن کے سلسلہ میں وہ سیریا میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ مصروف کار تھے۔ ان چند برسوں میں ان کی شخصیت نکھر کر کچھ اور ہی ہو گئی تھی لڑکپن کی چربی مکمل طور پر چھٹ چکی تھی۔ دراز قد اور ستا ہوا بدن اور چہرے کی گولائیوں نے زاویوں کا روپ دھار لیا تھا۔ آنکھوں کی شرارت میں ٹہراؤ آ گیا تھا۔ لیکن ان کی مغزوراء کشش وہی تھی۔ صرف جب وہ مسکراتے تھے تو ان کی آنکھوں میں ایک گرمجوشی اٹھانے لگتی تھی جو ان کے مخاطب کو دوستانہ حدود میں کھیچ لاتی۔ پیچھے سے مسلسل یگانگت کی وجہ سے انکا سرخ و سفید رنگ سانولا ہو گیا تھا۔ لیکن ٹی شرٹ کی آستین کھسکنے پر ان کے مضبوط بازوؤں سے وہی گوار رنگ جھلکنا لگا گھنے ابرو جب وہ غور و فکر میں ڈوبے رہتے تو عقاب کے پروں کی طرح تن جاتے جن کے مابین ایک شکن سی ابھر آتی۔

”میسح تم کافی بدل گئے ہو“ میسح کے ساتھ گھوڑ سواری نے انہیں ماضی میں لوٹا دیا میسح نے ان چند سالوں میں نوجوانی کی منزلیں طے کر لی تھیں۔ اب وہ بھی ایک وجہہ شخصیت بن کر ابھرا تھا۔

”آپ بھی تو بدل گئے ہیں تاملش“ میسح نے گھوڑا روک کر نیچے اترتے ہوئے جواب دیا۔ وہ دونوں غیر ارادی طور پر اس مقام پر پہنچ کر رک گئے تھے۔ جہاں ماضی میں ہمیشہ رک کر گھوڑوں کو سستانے کا موقع دیا جاتا تھا وہیں قریب میں ایک جھرناتھا جہاں گھوڑے اپنی پیاس بجھاتے۔

”شادی کی مصروفیات میں تم سے بات ہی نہیں ہو سکی اور کل صبح میں چلا جاؤں گا۔“ التمش کو واقعی افسوس تھا کہ بچپن کے ساتھی کے ساتھ زیادہ وقت نہ گزار سکے۔

”اتنی جلد“ مسیح نے تعجب سے کہا۔

”ہاں، سنا تم پادری بننے جا رہے ہو“ التمش نے اچانک پوچھا۔

”بس یہی انسان اور خدا کے بیچ فاصلہ پالنے کی کوشش کر رہا ہوں“

مسیح نے ہنس کر کہا۔

منصور کا حشر جانتے ہو“ التمش نے منصور حلاج کی طرف اشارہ کیا ”وہ مشہور شعر یاد ہے۔“

فتویٰ دے کر کفر کا تم نے قتل کیا اک عاشق کو
لفظ انا الحق بول کے بے خود، دار کے اوپر تمہیں ہو

”ہاں، حشر تو سبھی کا ایک ہے راستے الگ الگ ہیں“ مسیح نے ہنس کر بات کو ملتے ہوئے کہا، لیکن التمش نے مزید کر دیا۔

”ڈور اکا کیا خیال ہے؟“

”آئی نہیں چاہتیں کہ میں پادری بنوں“ مسیح ڈورا کو ”آئی“ ہی

کہا کرتا تھا۔ ”وہ چاہتی ہیں میں شادی کر لوں“

”تو کر لو شادی۔۔۔۔۔ تم سے تو کوئی بھی لڑکی شادی کرنا اپنی

خوش قسمتی سمجھے گی“ التمش زیر لب مسکرائے۔

”اور آپ خود؟“ مسیح، التمش کے فیصلے سے واقف تھا کہ وہ شادی کو زنجیر سمجھتے تھے۔

”میری بات اور ہے۔۔۔۔۔ میں کسی لڑکی کے ساتھ نا انصافی نہیں کرنا چاہتا“

”نا انصافی؟ میں سمجھا نہیں“

”مسیح میں ایک آر کیا لوجسٹ ہوں“

”تو کیا آر کیا لوجسٹ شادی نہیں کرتے۔؟“

”اگر کرتے ہیں تو پچھتاتے بھی ہیں۔ ایک آر کیا لوجسٹ کی زندگی کھنڈروں کی کھدوائی اور سمیناروں میں بسر ہوتی ہے۔ وہ خود کو گھر کی بھول بھلیوں میں گم نہیں کر سکتا۔ اور مجھے اپنے پیشے سے محبت ہے“

عجیب بات ہے لوگوں نے محبت کی خاطر پیشے بلکہ تاج و تخت کو ٹھکرا دیا اور آپ پیشے کو محبت بنائے ہوئے ہیں“

”محبت کئی طرح کی ہوتی ہے۔ محبت کسی عورت ہی سے کی جائے میں اسے ضروری نہیں سمجھتا اسے اردو میں تضييع اوقات کہتے ہیں“ التمش نے مسکرا کر جملہ پورا کیا۔

”اسے انگریزی میں Male Chauvinism بھی کہہ سکتے ہیں“

مسیح نے اپنا سنہری فریم کا چشمہ درست کر کے کہا۔

”کوئی نئی بات کہو، یہ الزام مجھ پر کئی بار لگ چکا ہے“، التمش نے ہنس کر بات کو ناال دیا۔

ان کا کہنا درست تھا، التمش راہب نہیں تھے کہ نسوانی قربت سے دور بھاگتے کئی عورتیں ان کی گرویدہ تھیں۔ مغرب میں جہاں کھلے عام اظہار عشق معیوب نہیں سمجھا جاتا وہاں التمش جیسے وجہہ شخص کا صنفِ نازک سے گریمز مشکل تھا۔ انکے دوستوں میں کچھ عورتیں ایسی بھی تھیں جو خوبصورت تھیں بلکہ عقل و زیر کی میں بھی ان کا جواب لانا مشکل تھا التمش ان کے مداح بھی تھے لیکن اب تک کوئی دام ایسا نہیں تھا جس میں وہ پھنس کر رہ گئے ہوں۔

کاش، کوئی لڑکی، کبھی ان کا یہ مغرور سر نیچا کر دے،! مسیح نے التمش کو یہ خوبصورت بدو عادی، وہ جو خود گروہست زندگی سے دور پادری بننے جا رہا تھا۔

”ڈاکٹر نارٹن کہہ رہے تھے ڈیڈی کو اب راسیڈنگ نہیں کرنی چاہیے، التمش نے موضوع بدل کر کہا۔

”ہاں پچھلے دنوں ان کا بی پی بہت ہائی ہو گیا تھا، میں نے بڑی مشکل سے ان کا ٹینس کھیلنا بند کر دیا“ مسیح دونوں گھوڑوں کو واپس لاتے ہوئے بولا۔

وہ التمش کو کسی خیال میں ڈوبے گھوڑے کی نگام تھا مے آگے آگے بڑھتا دیکھتا رہا ان کی سملتی حیثیت میں طبقاتی فرق ہو تو ہو پھر بھی دونوں نے بچپن اور لڑکپن ساتھ گزارا تھا۔ کتنا فرق تھا اس التمش اور اس التمش میں۔۔۔۔۔ بھرے بھرے جسم کی جگہ ایک سنگلاخی نے لے لی تھی، برتاؤ میں

ٹہراؤ آگیا تھا، مسح اپنے لڑکپن کی پستابی یاد کر کے مسکرا دیا جب وہ اور التمش ہر روز اپنا قد ناپا کرتے تھے کہ چوبیس گھنٹوں میں کون کتنا بڑھا۔ اس کے لئے صاف ستھری دیوار پر پنسل سے لکیریں بنائی جاتیں۔ ڈورا دونوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرتی اور بڑبڑاتے ہوئے لکیریں صاف کرتی، اب التمش کا قد چھ فٹ سے تجاوز کر گیا تھا۔ جبکہ مسح کو اپنے درمیانی قد سے کوئی شکایت نہیں تھی اس کی سرخ و سپید رنگت ویسی ہی باقی تھی جبکہ التمش کا گورا رنگ جو سردیوں میں سرخی پر اتر آتا تھا اب مٹا ہوا گندمی لگ رہا تھا۔ یہ تبدیلی یقیناً ان کی مصروفیات کا عطیہ تھی۔ ان کے بال البتہ اب بھی اتنے ہی گھنے تھے لیکن شاید دھوپ میں زیادہ رہنے کی وجہ سے کہیں کہیں ان میں سنہرا پن جھلکنے لگا تھا۔ بیگم ان کے احتجاج کے باوجود انہیں چھوٹا تر شواہد بتی تھیں کیونکہ جس اسکول میں التمش پڑھتے تھے وہاں کالہ ہی ڈسپلین تھا۔ شاید یہی ڈسپلین تھا جس نے انہیں اپنی راہ معین کرنے کا شعور دیا تھا۔

دراصل متمول بیوائیں ہی ایسی نایاب جنس ہوتی ہیں جن کے سکنڈ پینڈ ہوتے ہوئے بھی نئے کے دام لگتے ہیں۔ حور بانو خوش مزاج و خوش شکل تھیں۔ کئی ٹٹ پونجئے شاعر جوان سے عمر میں کئی کئی سال چھوٹے تھے، ان سے نکاح کے خواہشمند تھے۔ حور بانو گو متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں لیکن ان کی کچھ صفات تھیں۔ مالدار شوہر ملنے پر بھی ان میں دولتیا پن نہیں جاگا تھا۔ وہ ٹھسے سے رہتی تھیں۔ بوڑھے شوہروں کی جوان بیویاں ہمیشہ چالاکی کی حد تک سمجھدار ہوتی ہیں سو وہ بھی تھیں۔ انہوں نے غمر غوں کرنے والے

کبوتروں کو دانہ ہی نہیں ڈالا۔ اٹکا کیا! پیروں میں ہوا بھری کہ شوئیں، شوئیں یہ جاوہ جا!۔۔۔۔۔ ان لونڈوں کی نظر ان پر نہیں ان کی دولت پر تھی۔ حور بانو کو تو اپنی چو کھٹ پر سنگ آستاں کی ضرورت تھی۔۔۔۔۔ اور فدا کو انہوں نے کسوٹی پر کس لیا تھا۔

لیکن حور بانو اس وقت تک نہیں جانتی تھیں کہ کوئی کاکل شبگیر، بھی فدا کی دامن گیر تھی۔ یہ ان کے لئے لمحہ فکر یہ تھا۔۔۔۔۔ وہ تو فدا کو بلا شرکت غیرے اپنانا چاہتی تھیں۔ قرین قیاس یہ بات تھی کہ فدا مانا یا دادا ہونے کی بزرگی پا چکے ہونگے۔ لیکن ظاہر ہے ان کا خیال غلط نکلا۔ ادھر فدا حسین خوش تھے کہ ان کی موثر شاعری نے ان کا مسئلہ حل کر دیا۔ جب انہوں نے بڑی مسرت سے حور بانو کے گوش گزار کیا کہ ”جہیز“ میں وہ اپنی ایک عدد بیٹی بھی ساتھ لا رہے ہیں تو حور بانو کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ اپنی اقلیم کی سرتاج تھیں۔ ایک جوان چھو کری (جو یقیناً خوبصورت بھی ہوگی) ان کی عالیشان چھت کے نیچے مسلسل انہیں ان کی عمر رفتہ کی یاد دلاتی رہے۔ انہیں کیسے گوارا ہوتا! ہاں اگر وہ چھوٹی سی گڑیا جیسی پیاری بچی ہوتی تو وہ اس سے اپنی خالی گود ہری کر لیتیں۔ جس سے ان کے مرحوم شوہر نے انہیں محروم رکھا تھا۔

وہ کچھ دیر اپنی نازک جوتی سے زمین بجاتی رہیں۔

”آپ اس کی شادی کیوں نہیں کر دیتے؟“ حور بانو نے فدا حسین سے

کہا۔

”اسے آگے پڑھنے کا بہت شوق ہے۔۔۔۔۔ ہاسٹل میں رہ جائیگی“

۔۔۔ فدا حسین نے اپنی متمول منگیتر کا تامل دیکھ کر اپنی دانست میں بڑی صائب رائے دی۔

حور بانو نے انہیں وزدیدہ نظروں سے تولا۔۔۔۔۔ یعنی ابھی بننے نے تولا بھی نہیں اور گاہک کہتا ہے جھکتا تول۔۔۔۔۔ واہ!، انہوں نے سوچا۔

”ہاسٹل اور فیس کا تو خرچہ بیٹھے گا“۔۔۔۔۔ انہوں نے ہونٹ بھیج لئے۔ اور فدا حسین بغلیں جھانکنے لگے ”بہتر یہی ہو گا کہ اس کی شادی کر دی جائے“۔ حور بانو نے کچھ دیر ان کے چہرے کا تاثر پڑھ کر کہا۔

”شادی؟“۔۔۔۔۔ فدا حسین چونکے۔۔۔۔۔ جیسے حور بانو نے کوئی انوکھی بات کہ دی ہو۔

”جب لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں تو بڑی ہونے پر ان کی شادی کرنی پڑتی ہے“ حور بانو نے تحمل سے کام لیکر کہا۔۔۔۔۔ ویسے فی الحال انہیں فدا کی یہ کھوئی ہوئی ادا بھائی تھی۔

”لڑکا۔۔۔۔۔ لڑکا کہاں ہے؟“ انہوں نے ایسے کہا جیسے فوراً کوئی دلہا اس دیوان کے نیچے سے رینگ آئے گا جس پر حور بانو ٹھسے سے بیٹھی تھیں۔

”آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں“۔۔۔۔۔ حور بانو کے ذہن میں وہ دو تین پھیپچر نوجوان شاعر ابھرے جو ان کی شان میں قصیدے لکھ لکھ کر سناتے اور انعام میں ”نان نمک“ کے حقدار بن جاتے۔

”ایک دو لڑکے میری نظر میں ہیں۔۔۔۔۔ لین دین کا سوال بھی

نہیں پیدا ہوگا۔۔۔ تھوڑا بہت جو خرچہ ہوگا میں اٹھا لوں گی۔۔۔۔۔ ” وہ بڑی
 خداترس تھیں۔۔۔ کئی غریب لڑکیوں کی شادیاں کروائی تھیں۔۔۔۔۔
 لڑکوں میں کسی کو سائیکل کی دکان لگوا دی تو کسی کو پان کا ڈبہ کھلوا دیا۔
 فدا حسین نے اپنی نئی بیساکھی پر تشکر کی نظر ڈالی۔ کتنا مزہ ہے خود کو
 کسی کے حوالے کر دینے میں!

التمش کی غیر حاضری میں مسیح ہی اختر بخت کا دست راست تھا۔
 اسٹیٹ اور بزنس کے ہر داؤں پیچ سے واقف۔ اختر بخت کی رہنمائی میں وہ
 بہت جلد کام پر حاوی ہو گیا تھا۔ جس کا اسے بہت معقول معاوضہ ملتا تھا۔ یہ
 ذمہ داری اس نے اختر بخت اور بیگم کی شفقت اور احسانوں کے بدلے میں
 سنبھالی ہوئی تھی۔ ورنہ چرچ اور مشن کا کام ہی اسکے لئے بہت زیادہ تھا۔
 مسیح میں سنجیدگی اور بردباری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ باغاں کے
 کارندوں نے اسے کبھی اونچا بولتے نہیں سنا تھا۔ لیکن ڈورا کے دل میں جو
 بات پھانس بن کر کھنکتی تھی وہ اسکے پیٹے کا خود اپنے مستقبل کے بارے میں
 فیصلہ تھا۔ مسیح نے لڑکپن میں ہی طے کر لیا تھا کہ وہ پادری بن جائیگا۔ ڈورا
 کو ہرگز یہ گوارا نہیں تھا۔ کہ اس کا خوب رو بیٹا راہب بن جائے۔ دنیا تاج دے۔
 لیکن جب بھی وہ مسیح سے اس بارے میں بات کرنا چاہتی تو چپ سادھ لیتا۔
 اتوار کو چرچ کی سرویس میں کیسی کیسی چلبلی حسین لڑکیاں اسکی ایک نظر
 کی محتاج ہوتیں۔ لیکن مسیح ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ اسکا

لباس سادہ ہوتا جس میں اسکی شخصیت کی متانت اور بھی نکھر آتی۔ سنہری چشمے کے پیچھے ذہین اور سنجیدہ آنکھیں بتاتی تھیں کہ اسنے دنیا کو کبھی رنگین چشمے کا فساد نہیں سمجھا۔ نیلی آنکھوں میں ایسا لگتا تھا جیسے بسیط آسمان کی گہرائیاں سمٹ آئی ہوں۔

جب ڈوراکے احتجاج کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو اسنے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ بشپ سے جا کر ملیگی اور درخواست کریگی کہ مسیح کو پادری بننے کی اجازت نہ دے۔ اسکا الٹا ہی اثر ہوا۔ بشپ، مسیح اور اسکے اہل ارادے سے واقف تھے۔ انہوں نے لئے ڈوراکے سرزنش کی کہ وہ اپنے پیٹے اور خدا کے بیچ حائل نہ ہو۔

مسیح ابھی پریسٹ ہو ڈکی ابتدائی مراحل سے گزر رہا تھا۔ اسٹیٹ کے کاموں سے فرصت پاتا تو کلیسیائی قوانین کی کتابوں میں الجھا رہتا۔ اوٹی میں کیسی کیسی میوزک پارٹیاں ہوتیں۔ شراب میں شباب گھلتا رہتا لیکن مسیح کو ان سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ پاک و صاف با اصول زندگی کا دلدادہ تھا اسنے چرچ کے پھانک پر ایک بورڈ پر لکھ کر لگا دیا تھا۔

TRESSPASSERS WILL NOT BE PROSECUTED

بیشک وہی تو ایک گھر ہے خدا کا جہاں جرم کی پاداش عفو و درگزر ہے۔ آو، کبھی تو آو، بھولے بھٹکے ہی سہی، کدے ندامت اور بازار فضیلت جاتے تو تمہارے پاؤں نہیں تھکتے۔ کبھی ادھر کا رخ بھی تو کر دیکھو!

حور بانو نے آخر کاکل کے لئے لڑکا ڈھونڈ ہی لیا۔ اور مہیں سے اسکے

اور اس کے والد کے راستے الگ ہو رہے تھے۔ وہ تھکی تھکی سی وہیں اس پرانے ادھرے ہوئے صوفے کے دستے پر ٹک گئی جسے کچھ دیر بعد کباڑیالے جانے کے لئے آنے والا تھا۔ اور تب ہی اس کے والد فدا حسین گھر میں داخل ہوئے۔ کاکل نے انہیں پہلے ہی گھر چھوٹا سا گیٹ کھول کر داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس گیٹ سے ابھی تک اس کی ماں کا پیٹھ کیا ہوا رنگ نہیں چھوٹا تھا۔ حتیٰ کہ اس پر سے دو برس میں گزر چکی تھیں

صبح سے وہ کتابیں چھانٹ رہی تھیں۔ کتابوں کا چھوٹا سا ڈھیر جو اسکی ملکیت تھا۔ اسکی اور اسکے والد کی کتابیں الگ الگ۔ کیونکہ اب انہیں الگ الگ ہی رہنا تھا۔ وہ گھر جسے وہ بچپن سے اپنا سمجھتی آئی تھی، اسکا نہیں تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسکی ماں کے مرنے کے بعد وہاں کی ہر چیز یکٹ اسکے لئے پرانی ہو چکی تھی۔ جانے والے اپنا دامن ایسے ہی چھڑاتے ہیں کیا؟ سب کچھ سمیٹ لے جاتے ہیں! محبت، سکون، دلار خود غرض کہیں کے! جو کچھ بچتا ہے وہ یہیں ایک پریشان کن خلا جہاں نہ پاؤں زمین پر ٹکتے ہیں نہ ہاتھ کو ہاتھ سمجھائی دیتا ہے۔ جو کچھ نظر آتا ہے وہ بھی کسی کام کا نہیں ہوتا بس ایک دھن ایک خیال کہ کاش ایسا نہ ہوتا۔ وہ چھوٹا سا گھر جو کبھی کاکل کی جنت تھی۔ بس اب ایک چار دیواری ہو کر رہ گیا تھا۔ اسکی دیواروں کا چوکھٹا جیسے کستا ہی جا رہا تھا

چھوٹے سے گیٹ میں داخل ہونے پر جو باغیچہ اسکی ماں نے لگایا تھا۔ اسکے اب بھی کچھ نشان باقی تھے۔ ہالی ہاک کے کٹورے اب بھی شبنم سے بھر جاتے تھے۔ جو ہی کی کلیاں اب بھی مہکتی تھیں۔ جیسے اسکی ماں خوشبو بن کر

ان پھولوں میں سما گئی ہو

کاکل نے اپنے والد کے خوش باش چہرے کی طرف دیکھا۔ چند دنوں سے اب وہاں ایک نئی جلا آگئی تھی۔ یوں بھی وہ اپنی عمر سے کافی چھوٹے لگتے تھے ایسی جواں سالی بے فکری کی دین ہوتی ہے جو حور بانو نے انہیں بخشی تھی۔

باپ کو اندر آتا دیکھ کر کاکل کا فوری ردِ عمل یہی ہوا کہ وہ دوڑ کر ان کے سینے سے لگ جائے اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔ شمع کی لو خوش رنگ سی لیکن اس سے لپٹنے کا انجام سبھی جانتے ہیں۔ خاص کر کاکل کو اگر سر پھوڑنا تھا تو وہی دیوار کافی تھی جس پر اسکی ماں کی دھندلی تصویر اب بھی لٹک رہی تھی۔

وہ اپنے باپ سے پوچھنا چاہتی تھی کہ کیوں۔۔۔۔۔ آخر کیوں اسکی قسمت کا فیصلہ اس جلد بازی میں کیا جا رہا تھا۔ لیکن اپنے باپ کے مسرور و تابندہ چہرے کو دیکھ کر اسے اپنا ارادہ بڑا ظالمانہ لگا۔ وہ ایک معصوم بچے کی طرح خوش تھے جسکے آگے خود اسکا لڑکپن ماند تھا۔ انہوں نے خود ہی آگے بڑھ کر کاکل گلے لگالیا اور کاکل نے ایک غیر مرئی قوت سے اپنے آنسوؤں پر قابو پایا۔

”کاکل میری بچی۔۔۔ ہر چیز کا انتظام ہو گیا۔“۔۔۔ ”انہوں نے کہا۔“
اور یہ سب کچھ۔۔۔۔۔

”..... حور بانو کی وجہ سے ہوا ہے نا“۔۔۔۔۔ کاکل نے چابی

بھرے کھلونے کی طرح کہا۔۔۔ کیونکہ اسکے والد اس سے احسانمندی کے دو بول سننا چاہتے تھے کہ وہ کاکل کے لئے بھی ہر لحاظ سے فائدہ مند ہے۔ کاکل نے رندھے ہوئے گلے سے وہی کہا جو اسکے والد سننا چاہتے تھے۔ رنگین پردوں کے پچھے کبھی جو قیامت چھپی رہتی ہے اسے بہت کم لوگ دیکھ پاتے ہیں۔ پردے اسی لئے تو ہوتے ہیں! خوبصورت چیزوں پر کہاں پردے ڈالے جاتے ہیں؟

”کون ہے بابا وہ؟“۔۔۔۔۔ کاکل سے رہا نہ گیا۔ اسنے جاننا چاہا کہ اسکی قسمت کسکے ساتھ باندھی جا رہی تھی۔

فدا حسین سنائے میں آگئے۔ انہیں معلوم ہوتا تو بتاتے کہ اپنی اکلوتی لڑکی کا ہاتھ وہ کسکے ہاتھ میں تھما رہے تھے۔ انہیں تو حور بانو کا ایک مختصر سا خط ملا تھا کہ انہوں نے کاکل کے لئے مناسب رشتہ تلاش کر لیا تھا اور نکاح کی تاریخ بھی انہوں نے خود مقرر کر دی تھی۔ لکھا تھا کہ وہ خود مقررہ دن لڑکے کو لے کر پہنچ جائیگی۔ مزید یہ بھی لکھا تھا کسی زیر باری کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔

”کیوں بابا؟“ کاکل نے جواب نہ پا کر پوچھا ”کیا میرا شادی کرنا ضروری ہے؟“

فدا حسین کے اڑتے ہوئے گھوڑے نے گویا ٹھوکر کھائی۔ وہ حیرت سے بیٹی کو تیکنے لگے۔

”تم نے ایسا سوال کیوں کیا جسکا جواب تم خود جانتی ہو۔“

ہاں۔ کاکل اپنے سوال کا جواب جانتی تھی۔ لیکن ہمیشہ ایک سوال کا ایک ہی جواب تو نہیں ہوتا۔ لیکن بظاہر اسکے والد کے پاس اسکے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ کیونکہ وہ دوسری شادی کر رہے تھے۔ اور حور بانو کی حویلی کشادہ ہوتے ہوئے بھی اسکے لئے تنگ تھی۔ جب سے فدا حسین نے اسے اس کی شادی کی غیر متوقع خبر سنائی تھی اس نے کئی زاویوں سے اس سے بچنے کی کوشش کی تھی۔ زندگی کی کشمکش کا اسے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے ملازمت ڈھونڈنے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ گھر کی آمدنی عمتا تھی کیونکہ گھر کرائے کا تھا تو کرایہ نہ ملنے پر مالک مکان کی نوٹسوں سے پٹا پڑ رہا تھا اور اب انہیں خالی کرنے کے لئے کورٹ کی نوٹس مل چکی تھی۔

”ہو سکتا ہے حور بانو ہی مجھے کوئی نوکری دلا سکیں“۔ لسنے ڈوبتے دل سے پوچھا ”پھر مجھے خود ذرا سا وقت مل جائے تو کوشش کر دیکھوں؟“ باپ کا پس و پیش دیکھ کر لسنے جملہ پورا کیا۔

”اس میں تو بڑا وقت لگیگا“۔ فدا حسین فکر مند ہو کر بولے۔ انہوں نے جیسے تیسے مالک مکان کو راضی کر لیا تھا کہ جو نہی کاکل کی شادی ہو جائے وہ گھر چھوڑ دیں گے۔ بیٹی کی بات سن کر وہ کچھ خفا سے ہو گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کاکل خواہ مخواہ اچھے بھلے تصفیے میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کیوں کر رہی تھی۔ ”لڑکیاں تو اپنی شادی کے خواب دیکھا کرتی ہیں“ کتنا کم جانتے تھے وہ اپنی بیٹی کو ایسے ان کی فکر بجا تھی۔ بیٹی کی رخصتی کے بعد وہ خود الہ آباد رخصت ہونے والے تھے۔ اب کاکل کا: کچا: بچا: انداز انکے سارے

منصوبوں پر پانی پھیرتا نظر آ رہا تھا۔ وہ بحسن و خوبی ایک باپ کی طرح اپنا مقدس فرض پورا کرنا چاہتے تھے اور یہ لڑکی!..... اسکی ماں بھی کبھی کبھی ایسے ہی سمجھ جایا کرتی تھی۔

”ٹھیک ہے بابا۔ جیسی آپکی مرضی“۔ کاکل نے انکے تیور بھانپ کر بے دلی سے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ حالانکہ اس طرح ہتھیار ڈال دینا اسکی سرشت میں نہیں تھا۔ لیکن ماں کی موت کے بعد حالات نے کچھ ایسی کروٹ لی تھی کہ اسکی ناتجربہ کار زندگی لٹھ کر رہ گئی تھی۔ بسنے غور کیا تو اس نتیجہ پر پہنچی کہ واقعی وہ لڑکا جس سے اسکی شادی ہو رہی تھی پڑھا لکھا اور سلٹھا ہوا انسان نکلا تو زندگی لاشم پشتم گزر رہی جائیگی۔ زندگی میں کہیں نہ کہیں حالات سے سمجھوتہ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ لیکن فی الحال تو اسے ایک اندھی گلی سے گزرنا تھا۔ کیونکہ اسکے والد خود اس لڑکے کو نہیں جانتے تھے جسکے ہاتھ میں وہ اسکا ہاتھ دینے راضی ہو گئے تھے۔

وہ رندھے گلے سے چھت پر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اس نے اچانک سردی محسوس کی اور وہیں پڑی اپنی ماں کی پرانی شال سے سر اور کندھوں کو ڈھک لیا جیسے وہ اپنے گرد ماں کی باہنوں کی کمی سختی سے محسوس کر رہی تھیں۔ ماں کی شال پرانی۔ دو جگہ رفو والی تھی۔ ویسے ماں کے کپڑے، ماں کے جوتے ہمیشہ ہی پرانے ہوتے۔ تبھی تو اسکی اور اسکے والد کی نئی چیزیں آسکتی تھیں بسنے کھڑکی سے باہر نیچے صحن میں نارنگی کے پیز کو دیکھا۔ روز صبح اسکی نو خیز کلیوں کی مہک اسے نیند سے جگاتی تھی۔ اور ساتھ

ہی نیچے کچن سے اٹھتی کافی کی خوشگوار پلشیں جو اس کی ماں تیار کر رہی ہوتی۔
 بیٹے ہوئے دنوں کی یادیں کچھ زیادہ ہی خوشگوار لگتی ہیں۔ کچھ خوشبوئیں۔ انہی
 قاصدوں کے دوش پر تو یادوں کی پریاں آکر چھیز جاتی ہیں۔ سخت محنت اور
 تنگدستی کے باوجود اسکی ماں کا مسکراتا چہرہ اور کام کرتے وقت مسلسل
 گنگنانے کی عادت۔ باپ کی آرام پسندی اور سہل انگاری کے باوجود جتنا
 مکمل بچپن اسکی ماں نے اسے دیا تھا وہ اسی کا حصہ تھا۔ کاش وہ اسی ماضی کو
 لوٹ سکتی! لیکن اگر کوئی ماضی میں لوٹ سکتا تو ماضی، ماضی کیوں کہلاتا۔ اور
 مستقبل بد قسمتی سے ہمیشہ ہی گل تر کی شکل میں سامنے نہیں ہوتا کہ کوئی
 اسکی آرزو کرے۔ یہی کیفیت اس وقت کا کل کی تھی۔

مردوں کو اس نے اپنے باپ کے پیمانے پر تو لایا تھا۔ جنہوں نے زندگی
 میں اسکی ماں کا استحصال کیا۔ یا پھر اپنی ساتھی لڑکیوں کے خوابوں کے ان
 شہزادوں کو دیکھا تھا جو کالج کے گیٹ پر انتظار میں پینترے بدلتے رہتے تھے۔ کچھ
 لڑکیاں جب کوئی نہ ملا تو لڑکیوں کے کالج کے اکلوتے مرد ٹیچر، چار بچوں کے
 باپ پر فدا تھیں۔ اب انہیں کون سمجھاتا کہ بیچارہ کالج میں کوڑھ مغز
 چھو کر یوں کے پیچھے سرکھپا کر جاتا ہو گا تو چار بچے اور کھنسن بیوی اس پر یلغار
 کرتے ہونگے۔ وہ سب چھپورے عشق کے عارضے میں مبتلا تھیں۔ ایسے
 مشاہدوں نے اسے شادی سے متنفر کر دیا تھا۔ اور اب حالات ایسے پیدا ہو گئے
 تھے کہ اسکے لئے شادی ہی ایک ایسا راستہ بچ رہا تھا۔ کیا واقعی وہ اتنی مجبور
 ہو گئی تھی؟

کہیں بھاگ کھڑی ہو۔! کہاں؟۔ شادی سے صاف انکار کر دے!۔
 کہاں رہیگی؟۔ آمدنی کی کیا صورت ہوگی؟ اور اس سے کیا حاصل ہوگا آخر وہ
 اتنی مجبور کیوں ہو؟ کیا کمی ہے اس میں۔؟ اسکی نظر سامنے رکھے قد آدم لیتے پر
 گئی۔ وہ شیشہ ابھی ابھی ٹوٹا تھا۔ آندھیاں چلتی ہیں تو شیشے تو ٹٹتے ہی ہیں۔
 لسنے ٹوٹی ہوئی دھار سے خود کو بچا کر دیکھا۔ وہاں ایک چھریرے بدن، سبک
 سین نقش والی کھڑی تھی۔ کھلتی ہوئی رنگت، حسین چہرہ کھنچی کمان جیسی
 ابروؤں کے نیچے بادامی آنکھیں، ستواں ناک کے نیچے قدرے بھرے بھرے
 ہونٹ۔ ڈھیلے گوندھے بالوں کی سیاہ لٹ جو ہمیشہ رسہ کشی پر آمادہ رہتی۔
 اسکے گھنے خوبصورت بال ہی تو اسکے نام کی وجہ تسمیہ تھے۔ وہ نام اسکے والد کی
 دین تھی۔

کاکل فروختند وچہ ارزاں فروختند، اس نے ایک کھسیانی مسکراہٹ
 کے ساتھ سوچا۔

قدرت کی اس فیاضی کے باوجود کشمکش کی اس دنیا میں اسکا حسن
 اسکے کسی کام کا نہیں تھا۔

ایک بار کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔ اپنی ساتھیوں کے ساتھ وہ
 بھی تماشا دیکھنے چلی گئی تھی۔ تماش بینوں کے جمگھٹ میں گوہر شناس ڈائرکٹر
 کی نظر اس پہ پڑی اور اس نے فوراً کاکل کو اپنی اگلی فلم کی ہیروین کے کارول
 پیش کر دیا۔ کاکل وہاں سے بھاگ نکلی۔ اس ڈائرکٹر کا تعارفی کارڈ اب بھی
 اسکی کسی کتاب کے بیچ دبایا تھا۔ کیا وہ فلموں میں اپنی جگہ ڈھونڈے؟ لیکن

وہاں بھی تو اسکے دام لگتے اشتہاروں میں لکھا جاتا، لاکھوں دلوں کی جانی۔ کاکل رانی۔ ہراس کے باوجود اسے ہنسی آگئی۔ اور موتیوں کی طرح اسکے دانت چمکے۔ مسکراہٹ دراصل خوبصورت دہانوں کا پیدائشی حق ہوتی ہے۔

اب رہی ارمانوں اور آرزوؤں کی بات تو کیا اسے کسی پرنس چارمنگ کی تلاش تھی اور اگر وہ کبھی اسکے بارے میں سوچتی بھی تو فوراً خود کو ٹوک دیتی۔ اول تو آج کے زمانے میں پرنس چارمنگ ہوتے ہی نہیں۔ اور اگر ہوں بھی تو ہو سکتا ہے انکا بوسہ اندرائن کا زہریلا بوسہ ہو جو اسکے خوابوں میں زہر گھول دے۔

جب انسان خود سوچ سوچ کر کسی نتیجے پر نہیں پہنچتا تو دوسروں کی رائے میں خوبیاں ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے۔ حور بانو نے اسکے لئے لڑکا ضرور چاہتا تھا لیکن اسکے والدین غیر ذمہ دار تو نہیں ہو سکتے تھے کہ انہوں نے آنکھ بند کر کے حور بانو کی رائے سے اتفاق کر لیا ہوا۔ کیا شریف لڑکیاں اپنے والدین کا کہا نہیں مانتیں؟

دن کے گیارہ بج رہے تھے اور دلے کا اب تک سہ نہیں تھا۔ حالانکہ ٹرین کو صبح نو بجے پہنچنا تھا۔ فدا حسین بار بار دور تک جاتے اور دیکھ آتے۔ آتی جاتی ہر ٹیکسی میں جھانکتے اور وہ گذر جاتی۔ قاضی اور گواہ بھی بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگے تھے۔ فدا حسین کو حور بانو کا حکم تھا کہ انہیں اسٹیشن آنے کی ضرورت نہیں۔ ایک کاکل ہی تھی جسے کسی کا انتظار نہیں تھا۔ پھر بھی جب گھر کے سامنے ٹیکسی آکر رکی تو اسکا دل دھڑکنے لگا مگر اسکی ہمت نہیں ہوئی کہ

اتھکر دیکھے۔

فدا حسین ہانپتے کانپتے کاکل کے پاس پہنچے

”وہ لوگ آگئے ہیں۔“ انہوں نے کمال دلچسپی سے کہا۔ جیسے برات کا

انتظام انہی کے ہاتھوں میں ہو۔

ان کے چچھے ہی سچ سچ کر سیدھیاں چرمھتا ہوا کوئی آ رہا تھا۔ کاکل نے

سر اٹھا کر دیکھا تو دروازے میں حور بانو کھڑی تھیں۔ درمیانہ قد، بھرا بھرا

بدن، گورا رنگ، آنکھوں میں غضب کا اعتماد۔ ایک گال میں شاید گلوری

تھی۔ ہونٹ قدرے بھنجے ہوئے۔ چتون کشیلی۔ کاسنی رنگ کا بیل دار غرارہ

اور اسی رنگ کا فرنچ شیفان کا دوپٹہ۔ جسے انہوں نے سر پر لیا ہوا تھا۔ خاصی

قبول صورت تھیں۔

کھنڈر بتا رہے تھے عمارت عظیم تھی!

کاکل انہیں دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ سرتا پا کاکل کا جلیزہ لے رہی

تھیں۔ انہوں نے جسے چنگاری سمجھا تھا وہ تو شعلہ نکلی۔

کاکل نے سلام کیا جسے انہوں نے آنکھ کے اشارے سے قبول کیا۔

”بڑا نیک لڑکا ڈھونڈا ہے ہم نے تمہارے لئے۔“ وہ بولیں ”تم اسکے ساتھ

خوش رہو گی۔ انہوں نے جیسے گیر نئی دی۔“ ہم ہی نے اسے چائے خانہ لگا کر

دیا ہے۔“

کاکل چونکی۔ حور بانو اچھی خاصی God Father ثابت ہو رہی

تھیں۔

”میں، میں اپنی پڑھائی جاری رکھنا چاہتی ہوں۔“ کاکل نے آخری کوشش کر کے دیکھنا چاہا۔

”یہ شاید ممکن نہیں ہوگا“ حور بانو نے ہاتھ کے اشارے سے بات کو آئی گئی کر دیا۔ ”حفظ کی ماں فریش ہیں، بستر سے اٹھ نہیں پاتیں۔ اس کی بس یہی ایک شرط ہے کہ تم ان کی خدمت دل و جان سے کرو گی۔“

کاکل کو دھچکا سا لگا۔ وہ تو اپنی قسمت پر شاکر ہونے چلی تھی لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ کس شرط پر اسکی شادی ہو رہی تھیں۔

”میں حفظ صاحب سے ملنا چاہتی ہوں۔“ کچھ دیر بعد وہ سناٹے سے نکل آئی اور دل کڑا کر کے کہہ ڈالا۔

”دیکھ لو گی، دیکھ لو گی۔ کسی لنگڑے لوے سے تمہاری قسمت نہیں باندھی جا رہی ہے۔“ حور بانو نے قدرے ناگواری سے کہا۔ کاکل کا حسن انہیں کچھ کے لگا رہا تھا۔ ”وہ تمہارے والد کے ساتھ اوپر آ رہا ہے۔“

حور بانو کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کاکل نے خود سیدھیوں پر قدموں کی چاپ سن لی تھی۔ پہلے کچھ کھسپائے سے فدا حسین اور انکے چچھے، دلہا داخل ہوا۔

سڑکوں بازاروں میں ہزار ہا شکلیں نظر آتی ہیں کوئی انہیں درخور اعتناء نہیں سمجھتا لیکن جو شخصیت کاکل کی ساری زندگی کی ساتھی بننے والی تھی وہ نظر کی آماجگاہ بن گئی۔ جب ہم نے کسی رسی سے کوئی یونہی سا بندل باندھا ہو تو ہمیں کوئی تکلف نہیں ہوتا۔ لیکن وہ رسی اگر خود اپنی زندگی

بچانے کے لئے استعمال کرنی ہو تو ہم اسکی مضبوطی کو سو طرح آزما تے ہیں۔
 کاکل نے حفیظ میں جو کچھ دیکھا اسے ششدر کرنے کیلئے کافی تھا۔
 سب سے پہلے توسستے پر فیوم کی بھپکار نے اسکے آنے کا اعلان کیا پھر جوشنے،
 اسکے سامنے آئی وہ کسی گہرے سبز رنگ کے لباس میں کھوئی ہوئی تھی، وہ
 سفاری سوٹ بھی ہو سکتا تھا۔ کلائی پر چوڑی چکلی گولڈن گھڑی۔ ہاتھوں تک
 زلفیں جنہیں ماتھے پر کلفی کی طرح ابھارا گیا تھا۔ پسینے سے شرابور چہرہ جسے
 جیب سے سرخ رنگ کا رومال نکال کر صاف کیا گیا۔

”کیسا چل رہا ہے تمہارا کام؟“ گویا کاکل کی معلومات بڑھانے کے
 لئے حور بانو نے پوچھا۔

”جی آپکی دعا ہے۔“ کمال انکساری سے جواب ملا۔ ”جب سے میں نے
 اپنے چائے خانے پر لاوڈا سپیکر لگایا ہے دور دور تک میرے ہی فلمی گیتوں کی
 آواز گونجتی ہے۔ بہت لوگ آتے ہیں۔“

حور بانو نے فاتحانہ انداز میں کاکل کی طرف دیکھا۔

اسی وقت کاکل کی نظر جب حفیظ سے ٹکرائی تو اسے جھرجھری سی آگئی
 وہ آنکھیں اسے دیکھ کر رال ٹپکا رہی تھیں۔ کاکل کو بدن پر چھپکلیاں سی
 ریٹکتی محسوس ہوئیں۔

”لو اب جلدی تیار ہو جاؤ“ حور بانو نے حکم صادر کیا اور پلٹ کر
 خراماں خراماں واپس، نیچے چلی گئیں۔

فدا حسین مکمل طور پر ایک سوالیہ نشان بن گئے تھے۔ ان کے دل

میں دوسو سے اٹھ رہے تھے۔ تھوڑی سی حسرت بھی تھی۔ کہ حور بانو نے یہ کس طرح کا رشتہ انکی تعلیم یافتہ بیٹی کے لئے ڈھونڈا تھا۔ لیکن زندگی کے تقاضے بھی تو پورے کرنے تھے۔

حور بانو نے جان بوجھ کر یہ نہیں کیا تھا۔ انہوں نے دو تین نوجوان شاعروں پر جھانپ ڈالنے کی کوشش کی تھی جو خود ان سے نکاح کے ممتنی تھے لیکن ناکام رہے۔ وہ بھوکے ننگے ان سے زیادہ ان کی دولت کے مداح تھے وہ ان کے کہنے سے خود پر ذمہ داریوں کا بوجھ کیوں سوار کرتے؟ تب حور بانو کی نظر کرم حفیظ پر پڑی جو کئی بار بیگم صاحبہ کو سلام کرنے کے لئے آچکا تھا۔ غرض وہی تھی کہ کچھ کرم ہو جائے۔۔۔۔۔ حور بانو نے اس شرط پر اسے چائے خانہ لگوادیا کہ وہی اس کی شادی بھی کروائیں گی۔ اب کاکل کو دیکھنے کے بعد وہ بھی اپنی خجالت پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اپنی جلد بازی میں انہوں نے اندازہ ہی نہیں لگایا تھا کہ فدا حسین لاکھ نمکے اور غیر ذمہ دار باپ کیوں نہ ہوں۔ ان کا خاندان بہت اچھا تھا۔۔۔۔۔ لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ انہوں نے پیسہ خرچ کر کے حفیظ کو ہوٹل کھلوادیا تھا جسے چائے خانہ کہنا زیادہ مناسب تھا۔ اور اب کاکل کو دیکھ لینے کے بعد حفیظ کی ریشہ خطمی بھی دیکھ چکی تھیں۔

کاکل کو تیار ہونے میں کوئی وقت نہیں لگا۔ کیونکہ وہ تیار ہی تھی۔ ہر طرح تیار۔ وہ دھیرے دھیرے سیدھیاں اتر آئی۔ قاضی صاحب اور گواہ بھی سنبھل کر بیٹھ گئے۔ وہ سخت بور ہو رہے

تھے وہ بھی کیا شادی جیسی شادی تھی کہ ایک پیالہ چائے تک نصیب نہیں ہوئی۔ وہ دہن بھی کیسی تھی جو سمٹی سمٹائی الگ کرے میں نہیں بیٹھی، ساتھ نہ کوئی سکھی نہ سہیلی، بے شرمی سے منہ اٹھائے محفل میں چلی آئی۔

حفیظ کے ساتھ گواہوں کی طرح آئے ان کے دوست بھی بس ان ہی کی قبیل کے افراد تھے۔ وہ کاکل کو دیکھ کر دل میں سوچ رہے تھے کہ واہ کیا ہاتھ مارا ہے یار نے، پری چہرہ بیوی اور جہیز میں چائے خانہ،

”کاکل فدا حسین“۔۔۔ قاضی صاحب نے تیز رفتاری سے کہا کیونکہ انہیں جانے کی جلدی تھی۔ ”بعوض ڈھائی ہزار روپے سکے رائج الوقت مہر تمہارا نکاح حفیظ محمد ولد رئیس محمد سے کیا جاتا ہے۔۔۔ کیا تمہیں منظور ہے؟“ کاکل کے جواب کا انتظار کئے بغیر انہوں نے جلدی جلدی تین بار اپنی بات دہرائی اور اپنا رومال جھٹک کر چپٹ ہونے ہی کو تھے کہ کاکل کی آواز اٹھی۔

”جی نہیں مجھے یہ نکاح منظور نہیں ہے“۔۔۔ اس کی آواز بہت صاف تھی اور ہر لفظ نیا ملتا تھا۔

اٹھارویں صدی نے جہاں تاریخ کو عظیم فلسفی دئے اسفل ترین غدار بھی اسی صدی میں پیدا ہوئے۔ فرانس کو اسی صدی نے روسو اور والٹیر جیسے فلسفی ادیب دیئے جنہوں نے اپنی نگارشات سے فرانسیسی انقلاب کے بیج بوئے۔ اسی دور میں اہل فرانس کو وہ مشہور نعرہ ملا جس نے عوام کو منظم

کر دیا۔ یعنی آزادی، مساوات اور اخوت LIBERTY . EQUALITY FRATERNITY اسی دور میں فرانس میں لوئی شانزدہم حکمران تھا۔ اس کی ملکہ اینتولینے نے فرانس کے ساتھ غداری کر کے آسٹریا کو (جس کے ساتھ فرانس کی جنگ تھی) فرانس کے جنگی راز بتادیئے جس کی پاداش میں لوئی اور میری اینتولینے کو گلوٹین پر چڑھا دیا گیا۔

جب نپولین فرانس میں برسرِ اقتدار آیا تو اس نے آسٹریا کو ۱۷۹۶ء میں شکست دی اور فرانس کا اقتدار دوبارہ قائم کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مشرق میں ٹیپو سلطان انگریزوں سے برسہا برس بیکار تھا تو ادرہ نپولین مغرب میں اسی قوم سے نبزد آزما تھا۔ اسی لئے ٹیپو کی درخواست پر چلتے ہوئے بھی وہ مدد کو نہیں پہنچ سکا۔

پیرس میں ایک سمینار منعقد ہوا جس کا مقصد یہ تھا کہ ان وجوہات کی شناخت کی جائے جن کی بناء پر نوآبادیاتی دور میں جہاں بعض ملکوں، مثلاً انڈوچائنا میں فرانس اپنا اقتدار قائم کرنے میں پوری طرح کامیاب ہوا وہاں ہندوستان میں فرانس کے قدم کیوں جم نہیں پائے۔ اور انگریزوں کے مقابلے میں دو پلے جیسے عظیم فرانسیسی جنرل کو شکست کا منہ کیوں دیکھنا پڑا اور سوائے چند رانگر اور پانڈپچری جیسے چھوٹے علاقوں کے ہندوستان پر اسکا تسلط قائم نہیں ہو سکا۔

اس سمینار میں مشہور تاریخ دانوں اور آثارِ قدیمہ کے ماہروں کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ التمش بھی ان میں شامل تھے۔ خاص کر اس

لئے بھی کہ وہ ہندوستانی نژاد آرکیالوجسٹ تھے۔ سمینار میں طے پایا کہ اراگان اور وردو (دو فرانسیسی تاریخ دان) اور التمش پر مشتمل ایک ٹیم جنوبی ہند جائے اور اس موضوع پر ہونے والی ریسرچ میں مزید معلومات حاصل کر کے جمع شدہ مواد فرانس کے تاریخ نویسوں کو فراہم کرے۔

یہی وجہ تھی کہ التمش سال بھر بعد ہی گھر آئے تھے ورنہ ان کا اگلا Expedition برازیل کے دور دراز علاقوں میں مقرر تھا جہاں وہ دو سال کے لئے مصروف ہو جاتے۔

بیگم اور اختر بخت کے لئے التمش کی آمد ایک خوش آئند اتفاق تھا۔ شاہ نور کی شادی پر التمش صرف دو دن کے لئے آئے تھے۔ جو بہت ناکافی تھے اس بار بھی وہ زیادہ تر اپنے ساتھیوں کے ساتھ مصروف رہتے لیکن پھر بھی فیملی کے لئے کچھ وقت نکل ہی آتا۔ ان کے دونوں ساتھی، خاص کر اراگان ہندوستانی پکوان کا زبردست دلدادہ ہو گیا تھا۔ خانساماں اس کی تعریف کے ہر لفظ کا ترجمہ کر کے سنتا اور جواب میں فرانسیسی میں Merci Monsieur شکریہ جناب کہنا سیکھ گیا تھا۔

التمش کے آنے کی خبر سن کر شاہ نور اور اس کا شوہر ہمایوں بھی ملاقات کے لئے چلے آئے تھے۔ شاہ نور اب دو بہت ہی پیارے توام بچوں شہزاد اور زینو کی ماں تھی۔

”میں جانتی ہوں، تمہیں بچے بور کرتے ہیں لیکن انہیں تو تمہیں سنبھالنا ہی ہوگا۔۔۔ شاہ نور نے کہا اور دونوں بچوں کو التمش کی گود میں

دھنسا دیا اور ان کا دودھ لینے چلی گئی۔

”ڈورا۔۔۔۔۔ ڈورا کہاں ہے۔۔۔۔۔“ التمش نے ادھر ادھر بے بسی

سے دیکھا،

”ڈورا جہاں بھی ہو۔۔۔۔۔ وہ اب بوڑھی ہو رہی ہے۔۔۔۔۔ گھٹیا کی

مریض ہے۔“ بیگم نے ہنس کر بچوں کو لے لیا اور التمش کی رہائی کی۔

”کوئی بوڑھی نہیں ہو رہی ہے ڈورا۔۔۔۔۔“ می ”خوش مزاج

ہمایوں نے کہا“ میں اب بھی اس کے ساتھ فلرٹ کر سکتا ہوں۔۔۔۔۔

”ٹھیک ہے میں تمہارے لئے اس سے Date لے لوں گی۔“ شاہ نور

دونوں ہاتھوں میں دودھ کی بوتلیں ہلاتی چلی آئی۔

وہیے ڈورا اب بھی تنومند لگتی تھی لیکن گھٹیا نے اسے مجبور کر دیا تھا

جہاں اسکے مضبوط ہاتھوں میں شاہ نور نے پرورش پائی تھی۔۔۔۔۔ وہی ہاتھ

اب اسکے دونوں بچوں کو سنبھالنے سے قاصر تھے۔

”لایے ایک کو مجھے دیجئے گا۔“ اراگان نے فرانسیسی لہجے میں

انگریزی جملہ کہا۔

”YOU!“ ۔۔۔۔۔ اختر بخت حیرت سے بولے۔

”تجربہ مت کیجئے برگیزیر۔“ اراگان بولا ”جارج آرویل کہتا ہے

ہر چٹان میں ایک صنم پوشیدہ ہوتا ہے میرے اندر بھی ایک آیا چھپی ہے۔“

”یہی بچے تو بڑے ہو کر تاریخ بناتے ہیں۔۔۔ ان کا احترام کرو۔“
تاریخ داں وردو نے بڑھ کر دوسرا بچہ اٹھالیا۔ التمش نے اس کی بات کا
انگریزی میں ترجمہ کیا۔

”دیکھو موسیٰ نے کتنی مشاقی سے اسے تھاما ہے۔“ بیگم بولیں ”تم
نے تو انہیں یوں پکڑا تھا جیسے کھدائیوں میں سے نکلے برتن ہوں۔“
”میں تو سوچتا ہوں کہ بچے بڑے ہو کر ہی پیدا ہوں تو کیا حرج ہے۔“
التمش بولے۔

اگلے پندرہ دن التمش اپنے ساتھیوں سمیت بہت مصروف رہے۔
شاہ نور چند دنوں کے لئے دالدین کے پاس رک گئی کیونکہ ”کونور“ میں
ولنگڈن کے ڈیفنس سرویئر اسٹاف کالج میں ہمایوں کا کورس چل رہا تھا اوٹی
سے ولنگڈن کچھ خاص دور نہیں تھا۔ یہی کوئی چودہ پندرہ کیلو میٹر۔ چند دن
بعد ہمایوں آکر اسے اور بچوں کو لجا سکتے تھے ورنہ اختر بخت خود بیگم اور بچوں
کو ساتھ لیکر چلے جاتے بیگم کو نور کا چھوٹا سا مارکیٹ پسند کرتی تھیں۔ چند
سیدھیاں اتر کر نیچے جلیے تو صاف سترافرش اور چھوٹی چھوٹی دکانیں۔ التمش
کو وہ جگہ مصر کی گتھی ہوئی گلیوں والے بازاروں کی یاد دلاتی جہاں انسان گم
ہو کر رہ جاتا ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ کونور کے بازار میں کبھی کوئی انسان
نہیں بکا ہوگا۔ جبکہ مصر کے بازاروں کو کبھی یہ خصوصیت حاصل تھی۔
انسان بھی یوسف سا انسان جن بازاروں میں بکا ہو وہاں کیا کچھ نہ بک جاتا
ہوگا۔

بھاگ ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی
بیچ ہی ڈالیں جو یوسف سا برادر پائیں

قطار در قطار عصمتوں کا نیلام۔ انسان کی خودداری اور خودی پر
برستے کوڑے۔ آج بھی انکی گونج مصر کے بازاروں میں سنائی دیتی ہوگی
وردوا اور ارکان کو اوٹی اور خاصکر اختر بخت کی کوٹھی اور اسکے
مضافات اتنے پسند آئے کہ انہوں نے بیگم اور اختر بخت سے اجازت لیکر اپنا
قیام وہاں پانچ دن بڑھا دیا۔ انکی خواہش کو مخصوص ہندوستانی مہمان نوازی
کی اسپرٹ میں بخوشی منظور کر لیا گیا۔

چند دنوں بعد التمش اور ان کے دو ساتھی دلی کے لئے روانہ ہو گئے
تاکہ وہاں نیشنل آرکائیوز میں جو مخطوطات و مسودات ہیں ان کا جائزہ لیں
اور وہیں سے واپس ہو جائیں۔

التمش کو امریکہ جانا تھا جہاں انکی وجہ سے برازیل کا
Expedition رکا ہوا تھا اور اسکی کافی عرصے سے تیاریاں ہو رہی تھیں
لیکن اسے مختلف وجوہات کی بنا پر ملتوی کرنا پڑ رہا تھا۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ
اسی سے نتھی کیا ہوا ارجنٹینا کا پراجیکٹ بھی تھا۔ ان دونوں پراجیکٹوں کو ملا کر
کافی وقت درکار تھا اور ساتھ ہی اخراجات کا جائزہ لینا ضروری تھا۔ اب جبکہ
فیڈرل گورنمنٹ نے فنڈ جاری کر دئے تھے تو خواہ مخواہ پراجیکٹ کو آگے
بڑھانا مناسب نہ تھا۔

بریگیڈیر اختر بخت اور ان کی بیگم کی زندگی پر سکون اور قابل رشک

تھی لیکن اچانک ایک حادثے نے ان کی زندگی کا سکون غارت کر دیا،

چائے اور کافی باغاں میں کارندے شام سے پہلے واپس ہو جایا کرتے تھے۔ برسوں سے یہی اصول چلا آ رہا تھا۔ مسیح نے اپنا ڈسپلین ہی ایسا رکھا تھا کہ کسی کو بلاوجہ شکایت کا موقع نہ ملے۔ نیلگری کی پہاڑیوں میں جنگلی جانوروں کا گذر نہ ہو ایسا کوئی نہیں کہہ سکتا تھا۔ ایک دن پتہ چلا کہ کسی فاریسٹ گارڈ کو آدم خور شیر گھسیٹ کر لے گیا، تہلکہ مچ گیا کیونکہ ابھی تک کسی شیر کے آدم خور ہونے کی رپورٹ نہیں ملی تھی۔

اتفاق سے اسی زمانے میں شاہ نور اور ہمایوں بھی بچوں کے ساتھ آئے ہوئے تھے دونوں جڑواں بچے اب ڈھائی سال کے ہو چکے تھے بیگم اور اختر بخت ان پر جان چھڑکتے تھے ہمایوں کو ان کی تہنائی کا بڑا احساس تھا اس لئے جب بھی موقع ملتا وہ فیملی کے ساتھ چلے آتے۔

آدم خور شیر کے شکاری ہمت کم ملتے ہیں شکار کا انسٹی ٹیوشن یوں بھی عہد رفتہ کا ہیما نہ شوق مانا جانے لگا تھا وائلڈ لائف کی بقاء کے لئے حکومت نے سخت قوانین اور ان کی پابجائی نہ کرنے والوں کے لئے جرمانے مقرر کئے تھے ایسے میں عام شکاری آدم خور شیر کو مارنے کی ہمت کر کے اپنی جان جو کھوں میں ڈالنے تیار نہیں تھے۔

”یہ کام ہم کریں گے“ ہمایوں نے فیصلہ سنایا

کسی نے ان کے فیصلے کو سنجیدگی سے نہیں لیا لیکن وہ بھی دھن کے پکے تھے ایک بار جو کہہ دیا سو کہہ دیا، قوی سے قوی ارادہ اتفاق کی چٹان سے

نکر کر چکنا چور ہو جاتا ہے۔ ان کی گولی سے بوڑھا شیر زخمی تو ہو گیا لیکن اس نے پتھے سے اچانک ہمایوں پر حملہ کر دیا۔ ہمایوں کی دوسری گولی نے اسے ٹھنڈا تو کر دیا لیکن آدم خور شیر وہ بھی زخمی جب اپنے شکار پر جھپٹتا ہے تو یہ کہاں دیکھتا ہے کہ اسکے پنجے میں کسی بیوی کا سہاگ ہے یا دو معصوم بچوں کا چاہنے والا باپ۔ ہمایوں بچ نہ سکے!

ہمایوں کی موت کی خبر التمش کو دو مہینے بعد اس وقت ملی جب وہ اپنے Expedition سے واپس آئے تب ان کا ہندوستان آنا بے سود تھا اور تب ہی انھیں اس شدید محبت کا احساس ہوا جو ان کے دل میں شاہ نور کے لئے تھی لیکن وہ اب اٹھارہ انیس برس کے جذباتی نوجوان نہیں تھے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ اڑے اور پہنچ گئے انھیں یقین تھا کہ ان کی بظاہر نازک نظر آنے والی بہن ہمت والی اور قوی ارادے کی مالک ہے، یہ غم مشکل سہی مگر وہ سہہ جائیگی انھیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ ان کے والدین کے لئے یہ صدمہ جانکاہ ہوگا انھوں نے اختر بخت کو کیبل بھجوا دیا کہ اگر ان کی مرضی ہو تو التمش ہمیشہ کے لئے ہندوستان واپس ہو جائینگے۔

اختر بخت نے بھی گولیوں کی برسات میں فیصلے کئے تھے حالانکہ ان کی عین خواہش تھی کہ التمش واپس آجائیں لیکن وہ اپنے پیٹے کے جوش اور ولولے سے واقف تھے وہ التمش کو جذباتی بلیک میل کا شکار بنانا نہیں چاہتے تھے۔

شاہ نور کی جواں سال بیوی نے ایک سچے سپاہی کی طرح

جھیلان کی قوت برداشت نے بیگم کو بھی ہمت دلائی، شاہ نور شوہر کی موت کے بعد دنیا ہی سے کنارہ کش ہونے لگی تھی لیکن اختر بخت اور بیگم اسے کسی کھنڈر کی گونج جنتے نہیں دیکھ سکتے تھے انھوں نے شاہ نور کو مجبور کر کے اسٹیٹ کا سارا کاروبار اسے سونپ دیا خود وہ اور مسیح اسکی مدد کے لئے موجود تھے، رفتہ رفتہ شاہ نور اپنے غم پر حاوی ہوتی چلی گئی بس ٹنڈھ سال کے عرصے میں بسنے اتنا کچھ سیکھ لیا جو کوئی نو سکھ شاید پانچ چھ سال میں سیکھتا، اسکی وجہ ممکن ہے یہ ہو کہ بچپن ہی سے اس کے کان ان بحث مباحث سے آشنا تھے جو اکثر گھر میں ہوا کرتے تھے۔

لیکن قدرت کو ہمیشہ کچھ اور منظور ہوتا ہے بنگلور میں ٹی بروکرز کی میننگ تھی ایسی میننگوں میں خود اختر بخت شاہ نور کے ساتھ شامل ہوا کرتے ورنہ جب سے کہ انھیں بلڈ پریشر کی شکایت ہوئی تھی انھوں نے زیادہ تر کام مسیح اور شاہ نور پر ہی چھوڑ رکھا تھا۔

”آپ کے جانے کی کیا ضرورت ہے؟“ شاہ نور بولی ”میں اور مسیح کافی ہیں“ اختر بخت کچھ سوچتے رہے اور پھر مسیح سے بولے ”کیا ریکارڈز ہیں؟“ مسیح نے فوراً اپنا رجسٹر کھولا ”تقریباً دس لاکھ پاؤنڈ چائے مارکیٹ میں پیش کی گئی، مانگ اچھی رہی“

”اور High grown dust؟“ وہ غور سے سنتے رہے

سر ”ہائی گرون ڈسٹ میں بڑھیا کو الٹی والی ڈسٹ کے دام کچھ اور

بڑھے مگر Orthodox dust میں پورے آٹھ آنے کی زیادتی ہوئی ہے“

ڈیڈی CTC چائے میں کچھ گراوٹ آئی ہے "شاہ نور بولی
"کل سویرے سات بجے ہم بنگلور کے لئے نکل پڑینگے" اختر بخت نے

کہا

"تو پھر میں بھی چلوں گی" بیگم بولیں
"بیگار تھکینگے می آپ" شاہ نور نے کہا "اور پھر شہزاد اور زینو بھی آپ
کو مس کریں گے" فلو کے بعد بیگم بہت کمزور ہو گئی تھیں۔

"شہزاد اور زینو کی چوتھی سالگرہ آرہی ہے، مجھے شاپنگ کرنی ہے"

بیگم بولیں

"نہیں نوری" اختر بخت بولے "میں ضرور چلیں گی شہزاد اور زینو کے لئے ڈورا
موجود ہے اور وہ مسیح سے بھی ہلے ہوئے ہیں، دو ہی دن کی تو بات ہے" وہ
جہاں تک ہو سکے بیگم کو اکیلا نہیں چھوڑتے تھے۔

اگلے دن علی الصباح وہ تینوں کار میں بنگلور کے لئے روانہ ہو گئے۔
مسیح نہیں چاہتا تھا کہ اختر بخت خود ڈرائیو کریں لیکن وہ راضی نہ ہوئے۔
در اصل جس شخص نے چال و چو بند زندگی گزاری ہو وہ بڑھاپے میں خود اپنے
بڑھاپے کو شکست دینا چاہتا ہے خود اپنے آپ کو یقین دلانا چاہتا ہے کہ کچھ بھی
نہیں بدلا شاید یہی کچھ اختر بخت کر رہے تھے۔

بیگم کے برابر شاہ نور آنے والی میٹنگ کے لئے کچھ فائلوں کا جائزہ لیتی
اطمینان سے پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ صبح کی خوشگوار ہوا کے جھونکوں میں وہ
آگے بڑھتے رہے ایک موڑ پر دفعتاً اختر بخت کے ہاتھ کلنپے ان کی یہ کیفیت

دیکھ کر بیگم نے ان کے ماتھے سے فشار کی طرح ہتا پسینہ اپنے رومال سے صاف کرنا چاہا لیکن ناگہانی، مہلت تھوڑے ہی دیتی ہے، کاربے قابو ہوئی اور پل بھر میں سڑک سے ناٹھ توڑ کر گہری کھائی میں جاگری، اختر بخت تو دل کے دورے کے ساتھ ہی ختم ہو چکے تھے کار سے لپکتے شعلوں نے بیگم اور شاہ نور کو مکمل طور اپنی گرفت میں لے لیا۔

جب اس سانحے کی خبر ملی تو التمش برازیل سے حاصل ہوئے data پر اپنی رپورٹ تیار کر رہے تھے مسیح کے بھیجے گئے تار نے انھیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

بمبئی تک التمش کا سفر ہمیشہ کی طرح آرامدہ رہا وہ ٹھیک دو سال بعد آئے تھے لیکن پہلے جب کبھی وہ آتے تھے رجائیت کی شگفتگی ان کے پابہ رکاب ہوتی تھی، اس بار ان کا دل بجھا ہوا تھا اور آنکھیں پتے انگاروں کی سی ہو رہی تھیں، ان کے تیور سے ان کی اندرونی خلفشار کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ انھوں نے لمبے سفر کے بعد بمبئی میں صرف چائے کا ایک پیالہ پیا تھا۔

Customs میں اس بار پھر انھیں کافی پریشان کیا گیا عہدیداروں کو یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ بدیس سے آئے مگر سوائے کپڑوں کے چند جوڑوں اور جوتوں کے ان کے ساتھ اور کچھ نہیں تھا۔ کتابیں تھیں وہ بھی خشک لٹریچر کوئی لہجہ، کوئی Porno کتاب ہوتی تو وہ ہتھیالی جاتی افسروں کو اس مغرور سے مسافر پر جھلاہٹ ہو رہی تھی۔

”کم از کم جرابوں کی ان جوڑیوں سے ایک دو تو دیتے جلیے“ کسٹم

افسر نے للچا کر جرابوں کے بندل کی طرف اشارہ کیا التمش کا پارہ کافی بلندی پر پہنچ گیا تھا پھر بھی وہ اپنے غصے کو قابو میں رکھے ہوئے تھے۔

”یہ میں خود اپنے لئے لایا ہوں“ انھوں نے شائستگی سے جواب دیا لیکن اگر کوئی ان کی شعلہ بار آنکھوں کو دیکھتا تو پتہ چلتا کہ وہاں کتنی توپیں، بندوقیں بھری پڑی تھیں۔

”ان پیسوں میں تم اپنے لئے موزے خرید لینا“ انھوں نے چند ڈالر کا نوٹر پر مھینکے ”اور ہاں.....“ وہ جاتے جاتے مڑے ”اگر کچھ پیسے کم پڑ جائیں تو بل اٹھا رکھنا میں کچھ ہی دنوں میں لوٹ رہا ہوں“

انھیں اپنے ہم وطنوں کے اخلاقی انحطاط پر افسوس ہوا انھوں نے دیکھا کہ وہ بے حمیت کسٹم آفیسر، بجائے اسکے کہ وہ ڈالر انھیں لوٹا دیتا انھیں اپنی جیب میں اڑس رہا تھا۔

جب التمش ٹیکسی لیکر گھر پہنچے تو شام ہو رہی تھی گلوں کے خوش رنگ بدن شام کے دھندلکے میں مدغم ہونے لگے تھے۔ تاریکی اڑدھا ہے سب کچھ نکل جاتی ہے جب بڑھتی ہے تو اسکی پھنکار صاف سنائی دیتی ہے، باغ کا جغرافیہ وہی تھا لیکن گھر کی تاریخ بدل گئی، التمش نے اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور سیردھیاں چڑھنے لگے وہاں انھیں ریسیو کرنے کے لئے کوئی نہیں تھا، صدر دروازے پر پہنچے کر انھوں نے سوٹ کیس نکا دیا اور کال بیل بجانے کے لئے ہاتھ بڑھایا پھر رک گئے، اپنے آپ ان کا ہاتھ گلاب کی بیل سے ڈھکے درجے کی چوکت پر گیا، وہاں حسب معمول چابی رکھی تھی، دیر سے آنے والوں کے لئے

وہاں ہمیشہ ایک چابی چھوڑی جاتی تھی تاکہ اندر لیکینوں کے آرام میں خلل نہ ہو۔ چابی پانی اور گرد کے اثر سے زنگ آلود ہو رہی تھی لیکن التمش وہاں اس کی موجودگی کو بھولے نہیں تھے۔

اندر مکمل خاموشی تھی، صاف ستھرے چمکدار فرش پر درپچوں سے چھن کر آتی قرمزی شعاعوں کا رقص ختم ہو چکا تھا، ہال کی آراستگی وہی تھی۔ جگہ جگہ بڑے قالین بھی اپنے رنگ سیاہی کو سوئپ رہے تھے۔ سامنے فرینچر کی وہی سجاوٹ، پیانو کو چھوتے ہوئے ان کا ہاتھ رک گیا انھیں ایسا لگا جیسے اسے چھوتے ہی اس کے سر جاگ پڑیں گے، وہ شاہ نور کے جگائے سر ہونگے اور وہ ذہنی طور پر اسکے لئے تیار نہیں تھے۔ وہ سکوت اچانک انھیں ہمد م سانسوس ہونے لگا انھوں نے اپنا رخ بدلا اور لا بیریری کی طرف چل پڑے جب آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تو کتابوں کی مانوس مہک نے ان کا استقبال کیا سامنے کے آئینہ ان کے اوپر لگی ان کے والدین کی تصویر کا بہت بڑا انار جمنٹ تھا جس نے کہا "تم آگئے التمش"

یہ نہیں کب تک دونوں ہاتھوں میں سر تھامے وہ لا بیریری میں بیٹھے رہتے کہ لا بیریری کا دروازہ کھلا اور ڈور داخل ہوئی، التمش نے سر اٹھایا اور ڈور اسے آنکھیں چار ہوئیں دونوں نے کچھ نہیں کہا، زبان کی آنکھیں نہیں ہوتیں نہ آنکھوں کی زبان۔ پھر بھی بے زبانی بہت کچھ کہہ جاتی ہے۔ ڈور کے آنسو تو خشک ہو چکے تھے اور التمش نے اپنے آنسوؤں پر پھرے بٹھا دیے تھے کچھ کہنا سننا محض تکلف ہوتا!

”کھبر کیوں نہیں کیا چھوٹے سرکار؟ مسیح بنگور آجاتا“ ڈورانے کہا
 ”مسیح کلہاں رہنا زیادہ ضروری تھا“

”سوئے کا پہلے ہم سب چیک کرتا۔ لائبریری میں لائٹ دیکھا تو اندر
 چلا آیا“

”بچے سو گئے؟“ التمش نے ہلکی مسکراہٹ سے ڈورانے کے احساس ذمہ
 داری کو سراہا۔

”آپکو معلوم ہے چھوٹے سرکار“ عرصہ ہوا ڈورانے التمش کو تاش بابا
 کہنا چھوڑ دیا تھا۔ ”کیا ٹیم ہوا؟ ابی رات میں گیارہ بج گیا، سبجاو، جینو نو بجے
 سو جاتا“

التمش اٹھ کھڑے ہوئے ڈورانے سمجھ لیا وہ نرسری میں جانا چاہتے تھے
 وہ ان کے ساتھ ہوئی۔

نرسری کا راستہ التمش کے لئے نیا کب تھا! وہیں ان کا اور شاہ نور کا
 بچپن گذرا تھا۔

عقبی حصے میں روشن اور ہوادار نرسری، کوٹھی کے اہم حصوں سے
 بالکل منقطع بھی نہیں تھی لیکن اتنی پاس بھی نہیں کہ ینٹھک میں مہمان
 ہوں تو بچوں کی شریر مصروفیات ان کی بات چیت میں مغل ہوں، نرسری کے
 ملحق برآمدے سے ہو کر سیدھیاں تھیں کیونکہ وہاں کوٹھی کا پایہ کچھ زیادہ اونچا
 تھا نشیب میں Annexe تھی جہاں ڈور اور مسیح رہا کرتے تھے اس سے کچھ
 دوری پر سرونٹس کو اثرز بنے تھے جن کے عین اوپر کچن تھا نرسری سے ملحق

برآمدہ تقریباً نصف کوٹھی کو گھیرتا ہوا بڑی بالکونی کی شکل میں کچن کے پچھلے حصے تک چلا جاتا تھا۔

التمش دروازہ کھول کر نرسری میں داخل ہوئے۔ وہاں کا ماحول سکون بخش تھا درپچوں پر خوش رنگ پردے کھنچے تھے، اور اسی پلنگ پر جن پر کبھی وہ اور شاہ نور سویا کرتے تھے اب ان پر شہزاد اور زینو سو رہے تھے۔ التمش دبے پاؤں آگے بڑھے، بعینہ ایک ہی شکل کے دونوں بچے۔۔۔۔۔ التمش کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کون زینو تھا اور کون شہزاد، وہ دونوں اب التمش کی ذمہ داری تھے انہیں اچانک شاہ نور کا جملہ یاد آیا۔

”میں جانتی ہوں بچے تمہیں بور کرتے ہیں۔ لیکن تمہیں انہیں تھامنا ہی ہوگا“ یہ گویا شاہ نور کے سیدھے سادے الفاظ نہیں ایک پیش گوئی تھی۔ دونوں میں سے ایک کا ہاتھ جو یلینکٹ کے باہر نظر آ رہا تھا مٹھی میں کچھ دبائے ہوئے تھا۔

”یہ سجاد ہے“ ڈورانے اس کی مٹھی میں سے ایک تصویر نکالی، وہ مڑی تڑی سی فوٹو شاہ نور کی تھی ”جینو بابا مان لیتا ہے مگر سجاد بابا اپنی می کو بہت یاد کرتا ہے“

ڈورا بولی،

بیڈ لیمپ کی مدھم روشنی میں التمش نے ڈورا کی آنکھوں میں آنسو کی جھلک دیکھی، ڈورا شاہ نور پر جان چڑکتی تھی، بچپن ہی سے ڈورانے اپنے دلار کا بڑا حصہ شاہ نور کے لئے اٹھا رکھا تھا۔ التمش کو کئی بار ڈورا کی شکایت

پر سزا بھی ملتی تھی کیونکہ وہ اس کے ہاتھ میں زندہ چھپکیاں پکڑا دیا کرتے تھے انہوں نے اپنا تسلی بخش ہاتھ ڈورا کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

ڈورا انہیں چاہتی تھی کہ التمش اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھیں وہ ان کا کمرہ ٹھیک کرنے کے بہانے وہاں سے چل پڑی۔ التمش کبھی شہزاد اور کبھی زینو کو دیکھتے رہے۔ آخر دھیرے سے دروازہ بند کر کے چلے آئے پتہ نہیں کتنی بے خواب راتیں ان کی منتظر تھیں۔

وہ ہندوستان میں رہ پڑنے کے ارادے سے نہیں آئے تھے۔ آنے سے پہلے انہوں نے اپنی عادت کے مطابق سوچا تھا کہ کوئی مسئلہ استنباط نہیں ہوتا کہ جس کا حل ناممکن ہو، شہزاد اور زینو کا مسئلہ سب سے بڑا تھا۔ وہ انہیں بہترین بورڈنگ اسکول میں داخل کرنے پر حل ہو جاتا اس کے علاوہ اسٹیٹ اور جانیداد کا بکھیرا تھا۔ آخر بخت کی Death Duty کا سوال تھا۔ انشورنس کے معاملے طے کرنے تھے۔ کئی انجانے، ان دیکھے مقدمے کھڑے ہو سکتے تھے، مشرق اور مغرب کی کارکردگی میں بہت فرق تھا یہاں کی سرخ فتنہ گری کے وہ عادی نہیں تھے پھر بھی انہیں خود پر بھروسہ تھا۔ انہوں نے ایک سنجیدہ اور تجزیاتی ذہن پایا تھا۔

اگلے دن خاندانی وکیل ہمنٹ راؤ، التمش کے آنے کی خبر پا کر چلے آئے اور وہ اپنے ساتھ ضروری کاغذات بھی لیکر آئے تھے۔ انہیں التمش کے آنے کا انتظار ہی تھا تا کہ ہر تفصیل طے ہو سکے۔ دفتر میں رکھے سیف اور بیبل کے تالے تڑوانے تھے آخر بخت کی موت کے بعد انہوں نے اپنی نگرانی میں

سب کچھ مہربند کروادیا تھا۔ حادثے کے بعد چابیوں کا پتہ ہی نہیں چلا تھا۔ ہمنٹ راؤ نے تعزیت کے چند جملے کہے، یہ حقیقت تھی کہ دیرینہ تعلقات کی بناء پر اختر بخت اور ان کی فیملی کی موت نے ان کے دل پر ایک گہرا اثر چھوڑا تھا۔ ایک تو فیملی ڈاکٹر اور دوسرے فیملی وکیل خاندان ہی کے فرد کی طرح ہوتے ہیں۔ اختر بخت کی صحت کی حالت عمر کے ساتھ اتنی تسلی بخش نہیں رہی تھی، انہیں داماد ہمایوں کی بے وقت موت کا غم تھا لیکن ایک بار کا سپاہی سدا کا سپاہی رہتا ہے۔ اختر بخت نے ہار نہیں مانی تھی۔ ڈاکٹر نارٹن نے خبردار بھی کیا تھا لیکن انہوں نے پرواہ نہ کی، ہمنٹ راؤ جانتے تھے کہ وہ بیگم اور شاہ نور کی خاطر خود کو چاق و چوبند بنائے رکھتے تھے۔ ہمنٹ راؤ اور ڈاکٹر کو انہوں نے سخت تاکید کی تھی کہ بیگم کو ان کی صحت کی بارے میں نہ بتایا جائے مرنے تک بھی وہ چوری چھپے گھوڑے کی سواری کرتے تھے۔

”شاید انہیں اپنی موت کا احساس ہو گیا تھا“ ہمنٹ راؤ نے ایک لفافہ اٹھا کر کہا ”مرنے سے ہفتہ بھر پہلے ہی انہوں نے اپنی وصیت لکھ دی تھی یہ رہے وہ کاغذات“

”آپ انہیں چھوڑ جائیے میں بعد میں دیکھ لوں گا“ اچانک التمش کو تازہ ہوا کی ضرورت محسوس ہوئی انہوں نے اٹھ کر غسل کیا، کپڑے بدلے اور باہر نکل پڑے۔

التمش کو آئے تقریباً ایک مہینہ ہو گیا تھا اسٹیٹ اور بزنس کے

بارے میں صبح اور ہمنمت راؤ انہیں اطلاع بہم پہنچاتے رہے وہ سب کچھ التمش کے لئے نیا تھا انہیں اس سلسلہ میں پہلے کبھی کھوج کرنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی لیکن اب وہ جانکاری ضروری تھی تاکہ وہ ہر بات کا محقول انتظام کر کے واپس ہو سکیں اختر بخت کی چھوڑی ہوئی وصیت کے مطابق آمدنی کے ایک حصہ میں ٹرسٹ قائم کرنے کی ہدایت تھی۔ جس سے غریب طالب علموں کی امداد ہو سکے۔ انہوں نے اپنی وصیت میں ڈور اور صبح کو بھی نہیں بھلایا تھا ڈور آنے دل و جان سے بخت خاندان کی خدمت کی تھی اب بھی اس میں ہمت موجود تھی لیکن اسکی صحت جواب دینے لگی تھی وہ اگر خدمت سے سبکدوش ہونا چاہے تو تاحیات اسے وظیفہ مقرر کیا گیا تھا۔

ڈور کی صحت کا معاملہ ٹیرہا تھا شہزاد اور زینو کی ذمہ داری اٹھانا اب اس کے بس کی بات نہیں تھی التمش نے بڑے سوچ بچار کے بعد طے کیا کہ یہ Love Dale کے بورڈنگ اسکول میں داخل کر دیا جائے۔ جہاں انہوں نے تعلیم پائی تھی گو اب وہاں پرنسپل بدل چکے تھے لیکن وہاں بے ہال میں آفندنا بورڈ پر اب بھی میرٹ اسٹوڈنٹس اور اسپورٹس میں آل مڈرز کی فہرست میں ان کا نام موجود تھا۔ شہزاد اور زینو کے کیس بیک مشکل یہ آرہی تھی کہ ان کی عمر کم تھی لیکن صورت حال کو دیکھتے نے کچھ پس و پیش کے بعد پرنسپل نے انہیں بورڈرز کی طرح قبول کرنے مامندی دے دی۔

اس فیصلے سے ڈور اپندان خوش نہیں تھی وہ شاہ نور کو دل و جان

چاہتی تھی اسے یقین تھا کہ شاہ نور کے بچے اس کے ہاتھوں پروان چڑھ گئے تھے وہ دونوں ابھی چھوٹے تھے ان کی سنجیدہ تعلیم کا زمانہ ابھی دور تھا۔
التمش واقف تھے کہ ڈور اکبھی جوڑوں کے درد کے مارے بستر سے کئی دن ہل بھی نہیں سکتی تھی اور ان کا چھوٹا اور محصوم ہونا ہی بڑا مسئلہ تھا

شہزاد اور زینو کی ابتدائی جھجک اب دور ہو چکی تھی۔ جس دن وہ پہنچے التمش نے انہیں سویا ہوا دیکھا تھا اگلے دن جب وہ ان کے پاس پہنچے تو انہیں اپنی چھوٹی کرسیوں پر بیٹھے تھے اور ان کے آگے ناشتہ رکھا تھا ڈور اب چمکا کر کھانے کی کوشش کر رہی تھی اور دونوں اپنی آنکھیں میچے ہنس رہے تھے۔

”دیکھ کون آیا ہے“ ڈور نے کہا اور دونوں نے پھٹاک سے آنکھیں مل دیں۔ سلمیٰ التمش کو دیکھ کر یک لخت ان کی ہنسی رک گئی اور ان کرسیوں سے کود کر ڈور کے پچھے جا چھے اس کے لباس کو مضبوطی پکڑ کر دونوں جانب سے وہ التمش کو تاک رہے تھے۔

”جاؤ شیک سنڈ کرو“ ڈور نے انہیں آگے کرتے ہوئے کہا ”یہ ری ماموں ہیں“ لیکن وہ دونوں ڈور سے چمٹے رہے۔

”ماموں کیا ہوتا ہے؟“ شہزاد کھلکھلا کر بولا۔

”می کا بھائی ہوتا ہے“ ڈور ابولی

”می کا بھائی کیا ہوتا ہے؟“ شہزاد شرارت پر تلکھواتھا۔

”Shut up you fool“ زینو بولا

"You Shut up" سجاد نے ترکی بہ ترکی جواب دیا

"سجاد بابا، جیسو بابا، بری بات" ڈورانے ٹوکا اور التمش نے بڑھ کر اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔

"میرا نام التمش ہے" انہوں نے اپنا تعارف کرایا۔
"نہیں، تاش"

التمش نے ان کی یادداشت کی تعریف کی، تو یہ جان بوجھ کر شرارت پر تلے ہوئے تھے انہوں نے سوچا ویسے دو سال پہلے جب وہ آئے تھے تو خود کو شہزاد اور زینو سے مانوس کروانے کی انہوں نے کوشش بھی نہیں کی تھی
"یہ دیکھو" شہزاد دوڑ کر ایک ڈبا اٹھا لایا۔ یہ اس کا خزانہ تھا، کچھ عجیب سا اثاثہ، بے جوڑ چیزیں، کچھ رنگین گولیاں، گھوڑے کے سروالا پنسل تراش، ایک سیٹی، ایک کیبل اور پتہ نہیں کیا کیا اگر کم بگرم،

زینو بھی اکڑوں یہ بٹھا شہزاد کے خزانے کا معائنہ کرنے لگا وہ بیچ بیچ میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتا جسے شہزاد دبوچ لیتا آخر وہ اٹھ کر بھاگ کھڑا۔

"یہ، یہ میری کتاب" زینو خود کو پکھڑا ہوا کیسے دیکھ سکتا تھا وہ بھی التمش کی توجہ کا حقدار تھا کتاب کیا تھی کاغذ کی دھجیاں تھیں۔
"تمہیں کتابیں پسند ہیں؟ التمش نے پوچھا۔

"ہاں، کہانیوں والی، جیسی می لاتی ہیں" زینو نے جواب دیا۔

"اور کھلونے بھی پسند ہیں" شہزاد نے شوشہ لگایا۔

تو ایسا کرتے ہیں" التمش نے دونوں سے گھل مل جانے کی کوشش

”ہم شام میں اکٹھے چلیں گے۔ خوب سی کتا ہیں، کھلونے اور نئے نئے
ے لائیں گے“

ان کا یہ برتاؤ دونوں بچوں کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے کافی تھا۔ مینو
نہرواد کے لئے وہ شام کئی شاموں کے بعد آئی تھی۔ ڈورانے مسیح کو گھر کے
ن کی ایک لمبی لسٹ دی تھی جو اسے بازار سے لانا تھا۔

ہلکی پھوار کے باوجود پروتق بازار میں سیاحوں کی گھاگھی میں کوئی
نہیں تھی۔ التمش بچوں کے ساتھ ایک بک اسٹال میں گئے مسیح نے
ٹ سے ضروری سامان خریدالانڈری سے کپڑے لئے التمش، شہزاد اور
کے ساتھ اس ٹیلرنگ فرم کو گئے جہاں Love dale کے طالب
ن کے یونیفارم تیار ہوتے تھے یونیفارم کے علاوہ ایک لمبی چوڑی
ت روزمرہ کے لباسوں کی تھی جس میں ان کے نائٹ سوٹ، ڈریسنگ
ن۔ قمیص اور مختلف موقعوں پر پہننے والے جوتے وغیرہ تھے۔ کچھ چیزیں
یڈی میڈ ملیں، یونیفارم کے کپڑے سلائی کے لئے دینے پڑے دکان کا
ن وہی تھا جو التمش کے کپڑے تیار کرتا تھا، بھاری بھر کم بدن۔ جھروں
ہرے اور سفید بالوں کے باوجود التمش اسے پہچان گئے تھے۔

”اوٹی چھوٹی جگہ ہے“ مالک نے اپنے اسسٹنٹ سے بچوں کا نا پ لینے
ایت دے کر کہا ”بریگیڈیر اور ان کے فیملی کے حادثے کا یہاں سب کو
س ہے“

ان کی بات چیت سے بے نیاز، شہزاد اور زمینو، قد آدم آنسوں میں بری بری شکلیں بنانے کا مقابلہ کر رہے تھے التمش کے کہنے پر شہزاد دکان کے پچھلے حصہ میں ناپ دینے کے لئے گیا اس کے واپس آنے پر زمینو کی باری آئی لیکن وہ تقریباً روتا ہوا واپس آگیا۔

”وہ میرا ناپ نہیں لیتا“ اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے شکایت کی تحقیق کی گئی اور ٹیلر کو بلایا گیا وہ تو آگیا لیکن سر کھجا کر ہنس پڑا۔

”میں نے سمجھا وہی بابا مجھے چھیرنے کے لئے دوبارہ آگئے ہیں“ اس نے شہزاد اور زمینو کو یکجا دیکھ کر صفائی پیش کی۔

کتابیں وغیرہ خریدتے ہوئے التمش نے گہری نظر سے شہزاد اور زمینو کا جائزہ لیا، شہزاد کے مقابلے میں زمینو زیادہ سنجیدہ تھا، ماں، باپ اور چلہنے والے نانا نانی کے چلے جانے کے بعد ایسا لگتا تھا جیسے اس نے اپنی خود اعتمادی کھودی تھی۔۔۔۔۔ وہ اپنا ہاتھ بار بار التمش کے ہاتھ میں دے دیتا، آنکھوں آنکھوں میں ان کی تائید مانگتا، جب کہ شہزاد، آزاد ہوا کا ایک جھونکا تھا۔۔۔۔۔ بند اس، نڈر۔۔۔۔۔ لیکن دونوں بھائیوں میں ایک خاموش ہمنوائی تھی جو عام طور پر جڑواں بچوں میں پائی جاتی ہے۔

شہزاد اور زمینو خوش تھے کہ ان کے نئے نئے یونیفارم بن رہے تھے التمش کے آنے کے بعد سے ان کی معصوم زندگیوں میں ایک انوکھی سی تبدیلی آئی تھی لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ کوٹھی میں ان کے دنوں کے گنتی گھٹنے لگی تھی۔۔۔۔۔ ڈور اس سارے انتظام سے مایوس اور خفا تھی اس کی آنکھوں

نے کئی بار اپنے غم و غصے کا اظہار بھی کیا تھا لیکن التمش کو اس کی پرواہ نہیں تھی وہ اپنے حساب سے بچوں کو ایک عملی مستقبل کے لئے تیار کر رہے تھے جس میں جذبات کا گزر نہیں تھا انہوں نے یوں بھی محسوس کیا تھا کہ دور ان کی ہر جائز و ناجائز ضد پوری کرنا ضروری سمجھتی تھی ان کی ہر غلط حرکت کو ان کے بچپن پر محمول کرتی ہو سکتا ہے بخت خاندان سے اس کی برسوں کی منک خواری اسکی ذمہ دار ہو اس کا مدار کبھی ضروری تھا۔ Love dale اور اس کی تربیت میں کوئی کلام نہیں تھا۔

آخر بچوں پر یہ راز فاش ہو ہی گیا کہ انہیں بورڈنگ ہاؤس بھیجا یا جا رہا تھا یہ بات دور انے انہیں ایسے بھیانک طریقے سے بتائی کہ وہ سہم کر رہ گئے انہیں لگا بورڈنگ ایسی جگہ ہوتی ہے جہاں ڈانسیں بچوں کو نوچتی کھوٹتی رہتی ہیں۔ جہاں چھوٹے چھوٹے جرم کی بڑی بڑی سزائیں دی جاتی ہیں۔

وہ دونوں بیڈ پر پاؤں لٹکائے بیٹھے چپکے چپکے روتے رہے، دورا غصے اور ناامیدی کے عالم میں ان کی پیکنگ کرتی رہی۔

رات گئے التمش لائبریری میں کچھ ضروری کاغذات پتیارہے تھے انہیں سہہ نہیں چلا کب زینو اور شہزاد ان کی کرسی کے برابر آکھڑے ہوئے ان دونوں کے آنسو بہہ رہے تھے جب ان کے آنسوؤں نے پچکیوں کی شکل اختیار کر لی تو التمش چونکے، ”کیا ہوا؟“ وہ کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے ”تم دونوں ابھی سوئے نہیں“

”میں می کے پاس جاؤں گا“ شہزاد نے ڈبڈبائی آنکھوں سے دوسری طرف دیکھا۔

التمش انہیں چپ چاپ دیکھتے رہے۔ لیمپ کی روشنی میں وہ دونوں ایسے معصوم فرشتے لگ رہے تھے جو بد نصیبی سے کسی مصیبت میں گھر گئے ہوں۔ بہت ممکن تھا کہ التمش پسج جاتے لیکن انہوں نے خود پر قابو پایا اس وقت کمزوری دکھانے کا مطلب ہوتا کہ ان کی ساری پلاننگ پر پانی پھر جاتا۔ شہزاد اور زینو کو اٹھا کر انہوں نے اپنے سامنے ٹیبل پر بٹھالیا۔ ڈرلینگ گاؤں سے رومال نکال کر ان کے آنسو پونچھے۔

”بتاؤ تم ہو سٹل کیوں نہیں جانا چاہتے؟“ انہوں نے ایسے کہا جیسے ایک مرد دوسرے مرد سے بات کر رہا ہو،

”ڈورا کہتی ہے جن کی میاں مرجاتی ہیں ان کے بچوں کو ہو سٹل جانا پڑتا ہے“ التمش سوچ میں پڑ گئے۔

”می مری نہیں ہیں ناتامش؟“ شہزاد نے تیقن چاہا۔

”می تو وہاں گئی ہیں“ زینو نے اپنا چھوٹا سا ہاتھ اٹھایا۔

”کہاں“ التمش نے برداشت سے کام لیکر پوچھا۔

”وہاں، پہاڑ کے اوہر“

”اور نانا نانی بھی“ زینو نے سر ہلا کر ہلا کر التمش کو یقین دلایا۔ ”تو ایسے

کرتے ہیں“ التمش نے کہا۔۔۔ ”جب می، نانا اور نانی آجائیں گے تو ہم خود آکر تمہیں واپس لے آئیں گے“

انہوں نے اختر بخت کے قریبی دوست کمانڈر لال کو بچوں کا لوکل گارڈین مقرر کیا تھا وہ دونوں میاں بیوی لا ولد تھے اور زمیندار اور شہزاد کو بہت پیار کرتے تھے۔

”نہیں نہیں“ دونوں ٹھنکے

”شش، ضد نہیں کرتے“ التمش نے دل کڑا کر کے سختی سے کہا ان کے چہرے کا رنگ بدلتا دیکھ کر دونوں یک ملت ایسے چپ ہو گئے جیسے ان کے منہ میں زبان ہی نہیں تھی، صرف کپکپاتے ہونٹوں کے کنارے جھک گئے آنکھیں اور بھی کٹورہ ہو گئیں گویا شبنم سے بھر گئی ہوں۔

جب التمش نے انھیں باہوں میں اٹھایا تو ان کے منہ منہ سینے دھونکنی کی طرح چل رہے تھے، لیکن یہ وقت چمکار کر انہیں دھوکے میں رکھنے والا نہیں تھا، حقیقت سے آشنائی اکثر دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے، لیکن حقیقت سے مفر کہاں!

کمرے میں لے جا کر التمش نے انہیں ان کے بستروں میں لٹایا اور لحاف اوڑھا دئے وہ کچھ دیر چپ چاپ انھیں دیکھتے رہے لیکن دونوں ہی ان سے نظریں چرا رہے تھے التمش نے جھک کر شب بخیر کہنے کے لئے ان کے ماتھوں پر بوسہ دیا تب بھی ان کے ہونٹوں کی لرزش ختم نہیں ہوئی۔ اتنے ننھے سے بچپن میں ان دونوں کا اپنے احساس پر کنٹرول التمش کو حیران کر گیا

”شب بخیر“ التمش بولے لیکن انہیں کوئی جواب نہیں ملا۔ جواب کی سعی ہوتی تو آنسو نہ نکلتے۔

التمش لائبریری میں واپس چلے آئے لیکن پھر ان سے کوئی کام نہ ہو سکا
عجب گردش میں پھنس گئے تھے وہ

انہوں نے سگریٹ جلائی لیکن اسکے کش لینے بھی بھول گئے۔

آج صبح کھانے کی میز پر سکوت نے، سکون کو مات دے دی تھی،
شہزاد اور زینو جو التمش کے دوستانہ برتاؤ کے عادی ہو گئے تھے آج بالکل چپ
تھے۔ آج ڈور انہیں ڈائننگ ہال میں نہیں لائی تھی کیونکہ گٹھیا نے صبح اسے
بستر سے اٹھنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ میسج نے چرچ جانے سے پہلے انہیں
تیار کر دیا تھا وہ چپ چاپ آکر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے اور پارچ کھاتے رہے،
التمش نے کن انکھیوں سے انہیں دیکھا وہ بچے جو ہمیشہ پارچ کھانے سے انکار
کرتے تھے آج انہوں نے سوائے پارچ کے کسی اور چیز کو چھوا تک نہیں۔

التمش کو برسوں پہلے کی شاہ نور یاد آئی جب اسے کسی بات پر غصہ آتا
تو خود گزیدگی پر تل جاتی اور دہی سرد کھاتی جو اسے سخت ناپسند ہوتا، انہیں
نوبے سے پہلے اسکول پہنچنا تھا، اگر انہیں ہوسٹل میں رہنا نہ ہوتا یہ تو شاید
ان کی زندگیوں کا ایک خوشگوار دن ہوتا کیونکہ اسکول جانے کا شوق دونوں
ہی کو تھا۔

وہ دونوں اطاعت گزار، راضی بہ رضا، التمش کی انگلی تھا مے سیردھیاں
اتر تو آئے۔ جہاں ڈریور نے لا کر کار پارک کر دی تھی لیکن آج ہمیشہ کی
طرح دوڑ کر انگلی سیٹ پر التمش کے برابر نہیں جابٹھے بلکہ دروازہ کھول کر
پچھے بیٹھ گئے۔

التمش نے ایک نگاہ غلط اندازان پر ڈالی کچھ بولے بغیر کار اسٹارٹ کر دی گیٹ سے باہر نکل کر کار نے جب رفتار پکڑی التمش اپنے خیالوں میں گم ہو گئے ایک موڑ پر اچانک ان کی نظر سامنے لگے شیشے پر گئی جو کچھ انہوں نے دیکھا وہ بات پہاڑ کو بھی پانی کر سکتی تھی۔

زمین کے آنسو بے تحاشہ بہہ رہے تھے اور شہزاد اپنے بہتے آنسوؤں کی پرواہ کئے بغیر زمین کو لپٹائے اپنے کوٹ کی آستین سے اسکے آنسو پونجھ رہا تھا۔

اس بستی میں کون ہمارے آنسو پونجھے گا
جس کو دیکھو اسکا دامن بھیگا لگتا ہے
درد مندی کے لئے سوکھے دامن کی کیا ضرورت ہے؟ آنسو ہی آنسوؤں
کے ہماز بن سکتے ہیں بشرطیکہ دکھ ایک سے ہوں، اپنی قسمت کا فیصلہ سمجھ کر
شہزاد اور زمین نے ہو سٹل جانا قبول کر لیا تھا۔

التمش کے سامنے دور رستے تھے ایک بورڈنگ ہاؤس کی طرف جاتا تھا
اور دوسرا واپس کوٹھی۔

انھوں نے دوسرا راستہ اپنا لیا، جب التمش بچوں سمیت واپس
کوٹھی پہنچے تو مسیح نے بتایا سچی جان آئی ہیں۔

کاکل جس ٹرین سے بنگلور پہنچی وہ اسے پلیٹ فارم پر چھوڑ کر جا چکی تھی اب بھی اسکی بل کھاتی رفتہ رفتہ نظروں سے اوجھل ہوتی شبیہ کاکل کو نظر آرہی تھی جیسے کوئی ہزار پا، رینگتا ہوا کیرا ہو وہ اپنے مختصر سے سامان کو اکٹھا کر رہی تھی کہ ایسا لگا کوئی پاس آکھڑا ہو اس سے مخاطب ہونا چاہتا ہو کاکل نے نظریں اٹھائیں۔

اسکے سامنے درمیانے قد کا سنجیدہ سانو جوان کھڑا تھا جس نے بادامی رنگ کا پولونیک سویٹر اور ناسی رنگ کی پتلون پہن رکھی تھی گورے رنگ پر سنہری فریم کے چشمے کے چٹھے اسکی آنکھیں نیلے سمندر کی سی تھیں۔ وہ بھی اسے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے کوئی بڑی انوکھی چیز اچانک اسکے سامنے آگئی ہو۔

”میرا نام مسیح ہے“ اسنے سنبھلتے ہوئے کہا

”میں۔۔۔ میں“ کاکل ہکلائی اسے امید نہیں تھی کہ کوئی اسے بنگلور ریسیو کرنے آئیگا۔

”آپ حیران ہو رہی ہونگی کہ میں نے آپ کو کیسے پہچانا“ مسیح نے اسے یقین دینا چاہا کہ وہ کوئی روڈ سائیڈرو میو نہیں تھا ”آپ نے اپنے خط میں اپنے لباس کا رنگ لکھ دیا تھا“ کاکل اس وقت کھلتے ہوئی گلابی رنگ کی شلوار قمیص پہنے تھی اور گلابی ہی دوپٹہ ویسے آپ نے لباس کا رنگ نہ بھی لکھا ہوتا تو میں آپ کو پہچان جاتا“ مسیح نے خوش اخلاقی سے کہا۔

”وہ کیسے“ کاکل کا شک اب بھی دور نہیں ہوا تھا۔

”جس لڑکی کا نام استنا انوکھا ہوا اسکی شخصیت کا بھی انوکھا ہونا ضروری

تھا۔ مسیح میں چھپے پادری نے پل بھر کے لئے منہ پھیر لیا تھا۔

کاکل کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کہے۔

”کہنے کی اجازت دیجئے کہ مجھے آپ کے ساتھ ہمدردی ہے اور میں آپ

کی ہمت کی داد بھی دیتا ہوں۔“

ہمدردی۔۔۔ ہمت کی داد۔

کاکل اب بھی سمجھ نہ پائی پھر اچانک اسے یاد آیا کہ اس نوجوان کا اشارہ اسکے ساتھ پیش آنے والے حالات سے تھا اور وہ اسکی ہمت کی داد اسلئے دے رہا تھا کہ زمانے کی چہ میگوئیوں کی پرواہ کئے بغیر اسنے نہ صرف شادی سے صاف انکار کر دیا تھا بلکہ اس سخت گیر دنیا میں اپنی جگہ بنانے پر تل گئی تھی، اسے اندازہ نہیں تھا کہ اسکا ذاتی معاملہ، معاملہ عام بن گیا تھا۔

”مجھے اوٹی جانا ہے“ اس نے بات کا دھارا موڑا

”اور اسی لئے مجھے بھیجا گیا ہے کہ آپ کو ریسو کر لاوں“ مسیح نے اسکا

سوٹ کیس اٹھاتے ہوئے کہا۔

کار میں مسیح کے برابر بیٹھی وہ اس دنیا کی طرف جارہی تھی جو اسکے لئے

بالکل اجنبی تھی اب وہ بجا طور پر حور بانو کی شکر گزار تھی کہ انہوں نے اوٹی

میں نوکری دلانے میں اسکی مدد کی تھی۔ وہ ایک پریشان خواب سا تھا جب

اسنے حفیظ سے نکاح کو منظور نہ کیا۔۔۔ حور بانو کو اسطرح کی عدول حکمی کی

عادت نہیں تھی انہوں نے کاکل کے انکار کو خراب تربیت پر محمول کیا تھا فدا

حسین نہ صرف بیٹی کے برتاؤ سے خجل تھے بلکہ جھلاہٹ بھی تھی کہ بیٹی نے بنا

بنایا کام بگاڑ دیا کیونکہ حور بانو اب بھی اس شرط پر اڑی رہی کہ جب تک کاکل ان کے راستے سے ہٹ نہیں جاتی وہ فدا حسین سے نکاح نہیں کر سکی وہ ہمت ہارنے والی نہیں تھیں لیکن ان بیزار کن حالات میں ٹکے رہنے کا سوال نہیں تھا۔ گرمی بڑھ رہی تھی انہیں اختر بخت کے حادثے کی اطلاع مل چکی تھی اور انہوں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ الشمس اوٹی آئے ہیں بجائے الہ آباد جانے کے انہوں نے طے کیا کہ وہ اوٹی چلی جائیں، ایک کام دو کاج ہو جائینگے، دیور اختر بخت اور ان کی فیملی کے حادثے میں موت ہو جانے کی تعزیت بھی ہو جائیگی اور تبدیلی آب و ہوا بھی۔

الشمس کو چچی کی آمد پر استعجاب ہوا، کیونکہ انہوں نے پہلے کبھی اس رشتے کو استوار کرنے کی سعی نہیں کی تھی۔ ان کی اپنی اٹھنیں تھیں جو شہزاد اور زینو کو بورڈنگ ہاؤس میں نہ چھوڑ پانے کی وجہ سے بڑھ گئی تھیں، ہمنمت راوان کی ذہنی کیفیت سے واقف تھے وہ الشمس کی مدد کرنا چاہتے تھے انہوں نے کہا تھا شہزاد اور زینو کو خود اپنے ساتھ رکھ لینگے ان کے اپنے بچے بڑے ہو چکے تھے، ان کے اس آفر نے الشمس کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

کیا شاہ نور، ان کی چہیتی بہن کے بچے، ان پر اتنے بار ہو گئے تھے کہ غیر انہیں عاطفت میں لے لیں؟ انہوں نے طے کیا کہ اخبار میں کسی تجربہ کار گورنس کے لئے اشتہار دیں اور ایسے آڑے وقت میں حور بانو کی رائے نے ان کا کام بنا دیا۔ حور بانو نے نہ صرف کاکل کا نام پیش کیا بلکہ اسکی تعریفوں کے پل باندھ دئے تھے۔ الشمس ایک گورنس میں جو کچھ چاہتے تھے وہ سب کچھ

انہیں کاکل میں موجود دکھائی دیا۔ اور اسپر طرہ یہ کہ وہ حور بانو کی جانی بو جھی تھی۔۔۔ وہ راضی ہو گئے۔

جب حور بانو کا خط نوکری کی تفصیل لئے پہنچا تو فدا حسین نے اطمینان کی سانس لی کیونکہ یہی کچھ چاہتی تھی نہ کاکل! اور کاکل کے بھی سوکھے دھانوں پر پانی پڑ گیا اسے بچوں کا کوئی تجربہ نہیں تھا لیکن کام سیکھتے وقت ہی کتنا لگتا ہے اسنے فوراً طے کر لیا کہ وہ ضرور نوکری قبول کریگی۔

فدا حسین کا لپچڑ مکان دار روز آکر پوچھ جاتا تھا کہ وہ کب گھر خالی کر رہے تھے وہ کاکل کی طرف یوں دیکھتے جیسے ان کی اس حالت زار کی ذمہ دار کاکل ہی تھی۔

کاکل نے گھر چھوڑنے سے پہلے رات آنکھوں میں کاٹی تھی اسکے سامنے تھی پہاڑی زندگی۔۔۔ اسکے فیصلے اب خود اسے ہی کرنے تھے۔ اسے اپنے والد سے کوئی شکایت نہیں تھی، تڑوڑ کے پھول میں وہ گلاب کی خوشبو کیسے ڈھونڈتی۔

اسنے دیوار سے اتار کر اپنی ماں کی تصویر اپنے سوٹ کیس میں رکھ لی،
رڈیوار ڈکپلنگ کی نظم "او میری ماں" اسے یاد آ رہی تھی

اگر مجھے پہاڑ کی بلند ترین چوٹی پر

پھانسی دے دی جائے

او میری ماں! او میری ماں!

تو میں جانتا ہوں

کسکی محبت آخری سانس تک میرا ساتھ دیگی

او میری ماں! او میری ماں!

اگر میرے جسم اور میری روح کو

ایک المناک اذیت میں مبتلا ہونا پڑے

تو میں جانتا ہوں

کس کی دعائیں مجھے اس عذاب سے چھٹکارا دلا سکیں گی

او میری ماں! او میری ماں!

اسکا اثنا شبہی تھا، کچھ کپڑے، کچھ کتابیں مطالعہ کا شوق تھا اسے

جو بھی تھوڑا بہت جیب خرچ ملتا وہ کتابیں خریدنے میں ختم کر دیتی۔
رڈیارڈ کپلنگ کی نظموں کی یہ کتاب اسکی ماں نے ہی اسکی ایک سالگرہ پر
تحفہً دی تھی اور اس مخصوص نظم کو انڈر لائن کر کے وہاں اپنی دستخط کر
دئے تھے، کتنی سچی پیش گوئی تھی یہ، کاکل کو یہ ہمت اور استقلال گویا اسکی
ماں نے ہی دیا تھا کہ وہ اسوقت مسیح کیساتھ کار میں بیٹھی اوٹی جا رہی تھی
جہاں اسکی نوکری تھی، اسکا ٹھکانہ تھا!

مسیح کے دوستانہ انداز نے اسے تقویت دی تھی۔ اسکا سادہ سیدھا مہذب برتاؤ
کاکل کو پسند آیا تھا۔

اوٹی کے پچھرارے شروع ہو گئے تھے۔ یو کلپٹس کی جھنڈ۔ اور فضا

میں اچانک کافی کی مہک۔ وہ مہک جو پانچ سو سال پہلے ابی سینیا (جسے آج
ایتھیوپیا کہا جاتا ہے) سے اٹھی اور پھر ساری دنیا میں پھیل گئی۔ تیس فیٹ

تک بڑھنے سکتے رکھنے والے ان درختوں کو کاٹ دیا جاتا ہے تو یہ جھاڑیوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے سفید پھول چند دن اپنی بہار دکھا کر بیروں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ جو پکتی ہیں تو یاقوت رنگ ہو جاتی ہیں۔ کہیں ڈھلانون پر حد نظر تک چائے کے باغات نظر آئے کاکل کے دل میں چائے کی خواہش جاگی۔ چائے کبھی پیتے ہیں لیکن چائے کی ہری پتیوں کو چائے کے پیالے تک پہنچنے میں کتنے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں۔

زخاک تیرہ دروں تا بہ شیشہ حلبی

تنگ راستوں پر ایک جانب نیلگری پہاڑوں کا بلند وبالا سلسلہ تھا تو دوسری جانب سیکڑوں فیٹ گہری کھائی۔ راستہ گھٹتا رہا۔ مسیح نے اپنے برابر بیٹھی اس خوبصورت لڑکی کو کن انکھیوں سے دیکھا جسکی آنکھیں خوابیدہ ہو رہی تھیں۔ کاکل ٹرین میں بالکل نہیں سو پائی تھی۔ اگر ماحول اس قدر خوبصورت نہ ہوتا تو وہ کبھی کی سو گئی ہوتی۔

کچھ آگے جا کر کشادہ میدان سا تھا جہاں آتے جاتے مسافروں کو سستانے اور دوبارہ سفر جاری رکھنے کا موقع مل جاتا تھا۔

مسیح نے کار روک دی اور کاکل کے ساتھ کیفے ٹیریا میں چلا گیا۔

کیفے میں کاکل اپنے خیالات میں ڈوبی چائے پیتی رہی اور مسیح اسکو دیکھتا رہا۔ بادل امنڈ آئے، بر سے بھی اور چلے بھی گئے ٹھنڈی چمکدار دھوپ میں کاکل کے نقش و نگار اور زیادہ نکھر گئے تھے۔ مسیح کو لالی کی سفید نازک بھینی

بھینی خوشبو والے وہ پھول یاد آئے جو اسکی ماں ہر روز مریم کے مقدس مجسمے کے سامنے سجایا کرتی تھی۔

”وہ یہ کیا سوچنے لگا“ اس نے خود کو ٹوکا۔ اور چائے کے جلتے جلتے گھونٹ اپنے حلق میں اتار کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اسکے اسطرح اچانک اٹھ کھڑا ہونے پر کاکل بھی اپنے خیالات سے چونک پڑی۔ وہ کیفے سے باہر نکل آئے اور انکا سفر پھر جاری ہو گیا۔

وہ باقی راستہ کو شش کرتا رہا کہ ذہن کو چرچ کی آنے والی میٹنگ کی طرف لگائے اور کسی حد تک کامیاب بھی ہو گیا۔ چند ایک موڑوں کے بعد بلندیاں کچھ کم ہو گئی تھیں۔ کار نے شاہراہ چھوڑ دی اور پرائیویٹ رستے پر ہوئی۔ یہ راستہ سیدھا آفتاب کی کوٹھی تک جاتا تھا۔ زمر دی پیرہن میں نیگینے کی طرح جمی وہ کوٹھی دور ہی سے نظر آتی تھی۔ اس تک پہنچنے کا راستہ استنا تنگ تھا کہ آس پاس کی جھاڑیاں مڈگارڈ کو چھو رہی تھیں۔

کار ایک بڑے سے گیٹ میں داخل ہوئی۔۔۔ ابھی شام ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔ اچانک دھوپ نکل آنے کی وجہ سے دھلے نکھرے پتے چاندی کی طرح چمک گئے۔ کوٹھی دیکھ کر کاکل کا سانس ادھور رہ گیا۔ کیا اتنی خوبصورت اور وسیع کوٹھی اسکا مسکن بننے والی تھی؟ اس نے اسکا موازنہ اپنی چار دیواری سے کیا جو کل تک اسکا گھر تھا۔۔۔ لیکن تھا تو گھر ہی! کیا یہ ”کوٹھی“ گھر کا احساس دے پائیگی؟

میں اسکا سوٹ کیس لئے اندر داخل ہوا۔۔۔ وہ ایک کشادہ ڈرائنگ

روم تھا جہاں کی آرائش اونچے درجے کے ذوق کی غماز تھی۔ سامان کا ایک سکون آمیز امتزاج تھا۔۔۔ ڈرائنگ روم کا مغربی حصہ تہ ہو جانے والے شیشے کے دروازوں سے پچھلی طرف ایک وسیع بالکونی میں کھلتا تھا جسکے پردے ہٹے ہوئے تھے اور فی الوقت غروب ہوتے سورج کی قرمزی روشنی نے سارے کمرے کو ارغوانی رنگ سے دھکا دیا تھا۔۔۔ بالکونی سے نشیب میں دور تک پھیلی ہوئی وادی تھی۔

ہال کی خوبصورتی دیکھ کر کاکل کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ یہ کمرہ ایک ہی سطح پر نہیں تھا بلکہ دو سیدھیاں اتر کر جانے پر ڈائننگ ہال تھا۔ وہ بجھے دل سے آگے بڑھی۔۔۔ اپنی حیثیت سے بہت اونچے ماحول میں انسان خود کو تنہا محسوس کرنے لگتا ہے۔ ان قیمتی قالینوں پر اسکے رعایتی سیل میں خریدے معمولی جوتے، جن کی وہ دو بار مرمت کروا چکی تھی، عجیب سے لگے۔۔۔ لیکن وہی جوتے اس وقت صرف اسکا نہیں بلکہ دل کا منوں بوجھ بھی سنبھالے ہوئے تھے۔

بدلے ہوئے ماحول میں ہی انسان اپنا تنقیدی جائزہ لیتا ہے۔ خود اپنے بارے میں کئی ایسے زاویوں سے آشنا ہوتا ہے جو زندگی بھر اس کے ساتھ رہے پھر بھی وہ ان سے ناواقف رہا۔ کیا وہ اس سہرے ماحول سے مرعوب ہو گئی تھی؟ اس نے خود سے سوال کیا۔ وہ نا تجربے کار ہی لیکن کم عصری کا شکار نہیں تھی۔ درحقیقت وہ ایک احساسِ ذمہ داری تھا جو اسے نروس کر رہا تھا۔ اسے بچوں کا قطعاً کوئی تجربہ نہیں تھا اور وہ بھی اس ماحول کے غالباً

نک چڑھے بچے۔

اسے جو کمرہ دیا گیا تھا وہ نرسری سے قریب تھا۔ التمش کے حکم سے اس میں ضروری تبدیلیاں کی گئی تھیں۔ وہاں کافرش فرنیچر سب کچھ بدل گیا تھا۔ پہلی ہی نظر میں اسے اپنا کمرہ بھلا لگا۔ وہ ایک کشادہ بیڈروم تھا جہاں کافرش پستی قالین سے ڈھکا تھا۔ کشادہ درپچوں پر خوشنما پستی پرنٹ کے پردے اور غسل خانے میں بھی پستی اسکیم رکھی گئی تھی۔ جہاں واش بیسن اور وینٹیٹ کا حصہ تھا وہ دیوار مکمل طور پر آئینے سے ڈھکی تھی۔ پستی رنگ کی یکسانیت کو توڑنے کے لئے وہاں کا سارا فرنیچر سفید تھا۔

کاکل نے الماریوں کے دروازے کھولے، گہری اور بڑی الماریوں میں قطار در قطار ہنگر لگے تھے۔ ان ہی میں نیچے جو توتوں کے لئے بنے ایک تھے کمرے اور بالکونی کے درمیان فرش سے چھت تک سہ ہو جانے والے دروازے تھے۔ جن میں پھولدار پردوں کے پچھے نفیس جالی دار پردے لگے تھے تاکہ دن میں جب دبیز پردے ہٹا دیئے جائیں تو مہین پردے روشنی میں رکاوٹ نہ بنیں۔

”بچے کہاں ہیں؟“ اس نے ڈوبتے دل سے پوچھا۔

”آپ اسکی فکر مت کیجئے گا۔“ مسیح نے کہا ”آپ تھکی ہوئی ہیں آج آرام

کر لیں خانساں سے کہہ کر میں آپکا کھانا بھی بھیجو ادوٹگا۔“

کاکل واقعی تھک گئی تھی۔ اس نے مسیح کا شکریہ ادا کیا۔

مسیح کی پوزیشن اس شاندار گھر میں کیا تھی وہ سمجھ نہ پائی۔ لیکن اسکے

برتاو سے لگ رہا تھا کہ اس گھرانے میں اسے محض ایک نوکر کی طرح نہیں
گردانا جاتا تھا

صبح اٹھکر بسنے پر دے ہٹا دئے بالکونی میں داخل ہوتی فطرت کی صنای
کے بہترین نمونے اسکے سامنے تھے۔ بالکونی سے باہر چڑھتے سورج کی روشنی
میں نیلگری پہاڑوں کی بلندیاں نظر آرہی تھیں۔ اس سے نیلگوں رنگ جھلک
رہا تھا شاید اسی لئے انہیں یہ نام دے دیا گیا تھا۔ یا پھر یو کلیٹس کے جھنڈوں
کی وجہ سے جو وہاں کثرت سے تھے۔ یو کلیٹس سے نکالے گئے تیل کو عام زبان
میں نیلگری تیل بھی تو کہا جاتا ہے۔ وہ دنیا ایک طلسمی دنیا لگ رہی تھی۔
لیکن حقائق ہی تو تصور کو جنم دیتے ہیں جیسے وہ نیلگوں بلند و بالا پہاڑ ایک
حقیقت تھے اور ان میں پوشیدہ ہزاروں لاکھوں مجسمے سنگتراش کا تصور۔

ابھی وہ ان نظاروں کا لطف لے ہی رہی تھی کہ اسے لگا کوئی اسکے
بہت ہی قریب آکر کھڑا ہوا تھا۔ وہ چونک کر پلٹی تو دیکھا وہاں ایک چار پانچ
سال کا بچہ کھڑا تھا۔ گورا رنگ بڑی بڑی آنکھیں ہونٹوں میں جیسے سرخ گلاب
کی کلیاں چھپی ہوں۔ رخساروں پر ہلکی سی سرخی، ابروؤں تک پہنچتے، ریشمی بال
کا کل سمجھ گئی کہ وہ شہزاد یا زینو ہی ہو سکتا تھا۔

”تم شہزاد ہونا؟“ بسنے پوچھا۔

بچے کی آنکھیں شرارت سے چمکیں لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا

”اچھا اچھا تم وہی بچے ہو جسکے زبان ہے ہی نہیں؟“۔ کا کل نے اسے

اکسایا اور جواب میں ایک مٹی سی گلابی زبان نکل آئی۔

”ہوں! تم شہزاد ہو۔“

”بلاؤں شہزاد کو؟“۔ انکی بار وہ بولا اور بھاگ کھڑا ہوا چند ہی لمحوں بعد سرخ پل اور میں دو سرا بچہ دوڑا ہوا آیا وہ ہو۔ ہو اپنے بھائی جیسا تھا۔

”شہزاد“۔ ”کاکل نے اسے قریب بلایا۔ اسنے دیکھا زینو دروازے کی اوٹ سے جھانک رہا تھا۔ اس لمحے مسیح اسکی بانہہ پکڑے اندر آیا۔
”یہی تو ہے شہزاد“۔ مسیح نے اسے آگے بڑھایا۔ کاکل بو کھلا گئی۔
”لیکن شہزاد نے تو پیلے رنگ کا سویٹر پہنا ہے!۔ وہ بولی۔

”یہ انکا پسندیدہ مشغلہ ہے“۔ مسیح نے کہا ”انہوں نے اپنے سویٹر بدل لئے ہیں اور تم دھوکہ کھا گئیں۔“ تب تک اصلی زینو بھی اپنی گرتی نیکر سنبھالے آہنچا۔

”ان کی پہچان کیا ہے؟“ کاکل کے لئے یہ جاننا ضروری تھا۔
”یہ!“۔ مسیح نے شہزاد کے ماتھے پر سے بال اونچے کئے۔ وہاں پرانے زخم کا نشان تھا۔ ”یہ بہت نڈر ہے ایک دن اونچی دیوار سے کود پڑا تھا اور یہاں اسکے چار نائکے لگانے پڑے تھے۔“ کاکل ہنس پڑی اور ساتھ ہی مسیح بھی۔
”مسیح اور اسکے درمیان کی تکلف کی دیوار اوٹی آتے ہوئے ہی ڈھسے چکی تھی۔“ انہیں نہلانا اور بریک فاسٹ کروانا ہے؟“۔

”تو میں تمہاری مدد کروں؟“۔ مسیح نے مدد پیش کی۔

”شکریہ“ کاکل بولی۔ ”تم اپنے کام سے جاو، میں کر لوں گی۔“ اسنے مسیح کے ہاتھوں میں ایک فائل دیکھ لی تھی۔

مسح چلا گیا۔

”آپ کون ہیں؟“۔ بچوں کی توجہ مسلسل کاکل کی طرف تھی۔ شہزاد اسکے گھٹنے پر ہاتھ رکھے کرسی کے پاس کھڑا ہو گیا تھا۔

”میں -----؟“ کاکل نے سوچ کر کہا ”میں تمہاری دوست ہوں، ٹیچر ہوں۔“

”ٹیچر، نام تھوڑے ہی ہوتا ہے۔“ شہزاد نے ذہانت کا ثبوت دیا۔
 ”مئی آپکو کیا بلاتی ہیں؟“ زینو پوچھ بیٹھا اور کاکل سناٹے میں آگئی۔
 زینو کا محصوم ذہن ماں کی واپسی کا منتظر تھا۔ جیسے وہ یہیں کہیں گئی ہو۔
 ”تمہاری مئی مجھے کاکل بلاتی ہیں۔“ لسنے شہزاد کے ریشمی بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

”میں بھی آپکو کاکل بلاؤنگا۔“ زینو نے فیصلہ کر لیا۔

”میں بھی۔“ شہزاد نے اتفاق کیا۔

”تامش کہتے ہیں۔ میں اور شہزاد اگلے سال اسکول جائینگے“ زینو کاکل کو گود میں اپنے لئے آرام دہ جگہ بناتا ہوا بولا۔

”تامش کون؟“۔ کاکل نے بے ساختہ پوچھا۔

”تامش کون!“ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر کھلکھلائے گویا

ساری دنیا جانتی تھی کہ تامش کون تھے۔ بس کاکل ہی نہیں جانتی تھی۔

کاکل کو تجسس ہوا۔ حور بانو نے اپنے خط میں کہی تامش کا ذکر

نہیں کیا تھا۔ انہوں نے صرف یہ لکھا کہ بد قسمتی سے انکے دیور اختر بخت اپنی

بیگم اور بیٹی کے ساتھ کار کے منحوس حادثے میں چل بے تھے۔ ان کے دو نواسوں شہزاد اور زینو کی نگہداشت اگر کاکل قبول کر لے تو اسے تنخواہ بھی معقول ملیگی اور ایک شریف اور متمول گھرانے میں وہ بے فکری سے رہ سکیگی۔ اور کوئی تفصیل نہ حور بانو نے لکھی نہ کاکل کو اسکی ضرورت تھی۔ اسے تو بس کوئی مناسب نوکری چاہئے تھی۔ نوکری کی تلاش میں پے در پے ناکامیوں نے اسے ہراساں کر دیا تھا۔ حالات یوں بھی خوشگوار نہیں تھے۔ اسکے والد بھی اس سے کھنچے کھنچے سے رہنے لگے تھے۔ وہ اپنی پریشانی کا ذمہ دار کاکل کو گردان رہے تھے۔ اگر کاکل نے حفیظ سے شادی کر لی ہوتی تو آج انہیں یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔ کاکل کے پاس انکی شکایت کا بس ایک ہی حل تھا کہ وہ اپنے والد اور انکے آسودہ مستقبل کے درمیان سے ہٹ جائے ایسے میں حور بانو کے خط نے معجزے کا کام کیا اور وہ فوراً اوٹی جانے کے لئے تیار ہو گئی حیرت اس بات کی تھی کہ حور بانو نے استقدر جلد کاکل کی بغاوت اور عدول حکمی کو معاف کر دیا تھا۔ حور بانو کا یہ عمل فدا حسین کی دستار میں ایک طرہ بن گیا۔ انہوں نے کئی کئی زاویوں سے کاکل پر ثابت کر دیا کہ حور بانو واقعی بڑی حلیم، خدا ترس اور چارہ گر خاتون تھیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہو سکتا ہے آگے چل کر حور بانو اسے بھی قبول کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ اور انکے اسی جملے نے کاکل کے اوٹی جانے والے ارادے کو اور بھی مضبوط کر دیا۔ وہ حور بانو کی مشکور تھی کہ انہوں نے اسے نوکری دلانے میں مدد دی تھی۔ لیکن وہ انکے رحم کی متمنی نہیں تھی۔

وہ جب بنگلور پہنچی تو اسے یہ بھی امید نہیں تھی کہ کوئی اسے ریسپو کرنے کے لئے آئیگا اور وہاں مسیح اسکے استقبال کے لئے موجود تھا ایسا نا بھی ہوتا تو اس نے کمر ہمت باندھ لی تھی اور جان لیا تھا کہ زندگی کا یہ سفر وہ خود اپنے بل بوتے پر طے کریگی۔ زندگی اتنی ارزاں چیز نہیں تھی جسے ناامیدی کے حوالے کر دیا جاتا۔

لیکن تاملش کون تھے؟

کاکل نے سوچا کہ مسیح سے ضرور اس بارے میں معلوم کریگی کیونکہ اگر اسے یہی پتہ نہیں اسے کس سے رجوع کرنا ہے تو اسکی پوزیشن ایک مسئلہ بن جاتی۔ ویسے اسے ابھی آئے وقت ہی کتنا گذرا تھا۔ اتنی بڑی کوٹھی میں بس دو جڑواں بچے اور مسیح ہی تو نہیں ہو سکتے تھے جن سے اسکی ملاقات ہوئی تھی۔ فی الحال تو اسے اپنا کام سنبھالنا تھا۔ اسے جس مقصد سے بلایا گیا، وہ اسکے سامنے تھا۔ باقی تفصیل کی اسے کیوں فکر ہو۔ اسے شروع میں تھوڑا سا وسوسہ ضرور ہوا تھا کہ محض حور بانو کے ایک خط کی بناء پر وہ کس طرح اتنا بڑا قدم اٹھائے، گھر چھوڑ دے، جب کہ انکی کارکردگی کی ریکارڈ اتنا تازہ تھا! اسکا شک جائز تھا۔ لیکن کوئی اور صورت بھی تو نہیں تھی۔ حور بانو اور اسکے والد نکاح کر رہے تھے۔ اسکا راستے سے ہٹنا ضروری تھا۔ بغرض محال دھوکہ ہوا بھی تو وہ واپس ہو سکتی تھی۔ اپنے گھر نہیں، اس بڑی دنیا میں جہاں لاتعداد مسائل ہیں تو بے شمار انکے حل بھی موجود ہیں۔ سوچنے کا یہ ڈھنگ اسے اسکی ماں نے دیا تھا۔

اسکے والد نے جس خوشی سے اسکا کرایہ دیا بلکہ جیب خرچ کیلئے مزید پیسے دئے اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کس قدر اپنے نکاح کے منتظر تھے۔ انکی عجلت نے کاکل کا دل بھی دکھا دیا جیسے وہ اسے بوجھ سمجھ کر جلد سے جلد اتار پھینکنا چاہ رہے ہوں۔ لیکن اسکی عجیب و غریب منطق اسکے کام آئی۔ اسکی ماں نے جس شخص سے محبت کی تھی وہ اس سے نفرت نہیں کر سکتی تھی۔ اور اسکے باپ سے اگر اسے محبت نہیں ملی تو قدرت نے اسکا ازالہ شہزاد اور زینو کی شکل میں کر دیا۔ دو ہی دن میں وہ اس سے اسقدر گھل مل گئے کہ کاکل کا شبہ خود اپنے بارے میں غلط ثابت ہو گیا کہ وہ انہیں سنبھال نہ سکیگی۔

ان دو دنوں میں اسکی ملاقات مسیح سے بمشکل ہو پائی تھی۔ ویسے بھی وہ تماش، کے بارے میں پوچھ گچھ کر کے بلا وجہ اپنے تجسس کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے بس اتنا معلوم ہوا تھا کہ بچے التمش، کو تماش بلاتے تھے کیونکہ انکی ماں یہی کہا کرتی تھی۔ اور یہ بھی کہ التمش شہزاد اور زینو کے ماموں تھے اور انہوں نے ہی اسے یہ ملازمت دی تھی۔ لیکن کہاں تھے وہ؟ اگر یمنٹ پر مسیح نے اس سے دستخط کیوں لئے تھے یہ سوال اسکے دماغ میں اٹھے ضرور پر اسنے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔

ہوایہ تھا کہ کاکل کا خط ملنے کے بعد جس میں اسنے اپنی رضامندی ظاہر کی تھی، التمش مطمئن ہو گئے۔ انہیں چار دن کے لئے مدراس جانا پڑا۔ انہوں نے مسیح کو ہدایات دیں کہ کاکل کو ریسیو کرنے لئے وہ چلا جائے اور خود مدراس چلے گئے۔

کاکل نے بچوں کے ساتھ ہی رات کا کھانا کھایا۔ شہزاد اور زینو کو شبِ خوابی کے لئے تیار کیا۔ یہ انکا معمول تھا کہ سونے سے پہلے کاکل کو خوابی بوسہ دیتے تھے۔ لیکن شہزاد پر اس قدر نیند طاری تھی کہ

بوسہ دینے سے پہلے ہی اسکی نیند سے بوجھل آنکھیں بند ہو گئیں۔ دو ہی دن میں کاکل کو سہ چل گیا تھا کہ شہزاد سے تعلقات استوار کرنا مشکل نہیں تھا۔ اسکی باتونی طبیعت، کھنڈر امزاج مکمل اجنبیوں کو بھی اپنا لیتے تھے۔ لیکن زینو شہزاد کے مقابلے میں زیادہ حساس تھا۔ اسکا کبھی کبھی ہنستے کھیلتے اچانک کہیں جا کر چپ چاپ بیٹھ جانا۔ اداس ہو جانا، ظاہر کرتا تھا کہ ماں کی یاد نے ابھی اسکا دامن نہیں چھوڑا تھا۔ ایسے میں زینو کی نظر میں بالکل اجنبیت ہوتی۔

”سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا“۔ کاکل نے گویا خود کو یقین دلایا۔

وہ شبِ خوابی کا لباس تبدیل کرنے جا رہی تھی کہ خدمتگار نے آکر کہا چھوٹے سرکار نے کہا ہے کہ کافی آپ ان ہی کے ساتھ لائبریری میں پیچھے گا۔
یعنی التمش واپس آگئے تھے۔

اس مہذب دعوت کے پردے میں جو جو کھم تھا اسے کاکل نے محسوس کیا اس نے گھڑی دیکھی۔ نونج رہے تھے۔ یہ ملاقات صبح بھی تو ہو سکتی تھی۔ لیکن کوئی ایسی دیر بھی نہیں ہوئی تھی۔ ویسے بھی ایسی ملاقاتیں اتنی رسمی ہوتی ہیں کہ دو منٹ میں چھٹی ہو جاتی ہے۔

شبِ خوابی کا لباس تبدیل کرنے کی بجائے وہ سیرھیاں اتر کر لائبریری

کی طرف چل پڑی اسے لائبریری میں آنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا تھا۔ بسنے ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ شاید بحیثیت ایک ملازم کے اس سے امید کی جارہی تھی کہ آقا کا انتظار کرے۔

لائبریری اور اس کا قرینہ دیکھ کر اسکے اشتیاق کی کوئی حد نہیں رہی۔ الماریاں کتابوں کے نایاب نسخوں سے بھری پڑی تھیں۔ سرخ مخملی صوفے اور گدیلی کرسیوں کے ساتھ ساتھ، روشنی کا بہت ہی مناسب انتظام تھا۔ فی الحال ایک مدہم نرم سی روشنی میں وہاں کی ہر چیز سکون میں نہائی نظر آرہی تھی۔

وہ اپنی علم کی پیاس بجھانے کے لئے پبلک لائبریریوں میں جایا کرتی تھی۔ کھری مانگیں ٹوٹی ہوئی کرسیاں، کرخت ٹیبل۔ ایک شور مچا رہتا تھا وہاں اور ہر چند منٹ بعد لائبریرین وہاں آنے والے لوگوں کو یاد دلایا کرتا تھا کہ وہ اس وقت لائبریری میں ہیں۔ پھلی بازار میں نہیں۔ کتابوں میں سے صفحوں کے صفحے غائب گرمیوں میں سر پر گھومنے والے کی کھٹ کھٹ چین سے کچھ پڑھنے ہی نہیں دیتی تھی۔ اور یہاں اس ریشمی خاموشی میں علم مخملی لبادہ اور اوڑھے سو رہا تھا۔ بس اسے چھونے بھر کی دیر تھی۔

آتش دان میں مدہم آگ کے شعلے کمرے کو مناسب طور پر گرم کئے ہوئے تھے کاکل کو سویٹر میں گرمی محسوس ہوئی۔ اس نے اپنا سویٹر اتار کر صوفے کی پشت پر ڈال دیا کہ واپس ہوتے ہوئے اٹھا لے گی۔ اطراف و اکناف کا جائزہ لیتے ہوئے اسکی نظر آتش دان کے اوپر لگی بہت بڑی پستنگ پر مرکوز

ہو کر رہ گئی۔ جہاں اختر بخت، بیگم اور دونوں بچوں کے مسکراتے چہرے تھے۔ یہ اس وقت کی تصویر تھی جب التمش اور شاہ نور بڑکپن کے دوسرے دور سے گزر رہے تھے۔

وہ تصویر دیکھنے میں اتنی محو ہو گئی تھی کہ اسے پتہ نہیں چلا التمش کب لائبریری میں داخل ہوئے۔ جب وہ پائی تو دیکھا ایک دراز قد شخصیت جس نے نیلے رنگ کا ڈریسنگ گاون پہنا ہوا تھا۔ ٹیبل پر ہاتھ ٹکائے۔ آنکھوں میں غصے اور حیرت کی ملی جلی کیفیت لئے اسے گھور رہی تھی۔ التمش نے سینے پر ہاتھ باندھ لئے۔ ان کی گردن کا مغزور خم، اور ساتھ ہی ابروؤں کے بیچ ابھر آئی لکیر۔ کاکل نے ایسی آنکھیں آج تک نہیں دیکھی تھیں جن میں شعلوں کی مدھم آنچ ہو، تحکم ہو، جو اپنے مد مقابل کو پسپا کر دے۔

وہ تو وہاں ایک مطمئن اور آسودہ دماغ لیکر آئی تھی۔ ایک عام سے انٹرویو کے لئے جس میں وہی عام سننے والوں کے عام سے جواب ہوتے۔ لیکن یہاں تو ایک مجسم سوال شخصیت کھڑی تھی جو اسکے اعتماد کو متزلزل کر رہی تھی۔

”میں۔ میں کاکل ہوں۔ کاکل فدا حسین“۔ جب التمش خود کچھ نہیں بولے تو کاکل نے اپنا تعارف کروایا۔ انکی شخصیت پہلے ہی کاکل کو نروس کر رہی تھی۔ انکار و کھا انداز اور بھی اسکے پیر اکھیر نے لگا وہ ذہنی طور پر قطعاً اس آزمائش کے لئے تیار نہیں تھی۔

التمش نے ہاتھ پھیلا کر مقابل میں رکھی کر سیوں کی طرف اشارہ کیا

اور خود جا کر ٹیبل کے پچھے رکھی کرسی پر بیٹھ گئے۔ کاکل کو بیٹھنے کی یہ دعوت غنیمت لگی کیونکہ اسکا دل بیٹھا جا رہا تھا اور پاؤں بیدم سے ہونے لگے تھے کیا کیا تھا اس نے؟ کہاں بسنے غلطی کی تھی جو التمش کے انداز میں برا فرد جنگی تھی انہی کے بلاتے تو وہ وہاں آئی تھی۔ کیا انکا یہ عام رویہ تھا کہ وہ محنت کشوں کو ایک بلندی سے دیکھنے کے عادی تھے؟ بسنے گود میں رکھی انگلیوں کو بھیچ لیا تاکہ انکی کپکپاہٹ ختم ہو۔ ساتھ ہی اسے الجھن سی ہونے لگی کیونکہ التمش کی اسکے سر تا پا سفر کرتی نظر گستاخ تھی۔

”کیا عمر ہے تمہاری؟“۔ انہوں نے بغیر کسی تامل کے پوچھا۔

کاکل سنائے میں آگئی۔ کسی مہذب مرد سے یہ توقع کیسے کی جاسکتی تھی کہ وہ کسی لڑکی سے بلا جھجک اسکی عمر پوچھ بیٹھیکا! بسنے ایک نظر ان کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں چنگاریاں تھیں۔ خالص چنگاریاں، جیسے دو چتھماق ٹکر لگے ہوں۔ ان کے خوبصورت گھنے بال بکھرے ہوئے تھے اور ڈریسنگ گاون کے گلے سے گردن کا مضبوط تناؤ بتاتا تھا کہ کسی بات نے واقعی انہیں خفا کر دیا تھا۔ ورنہ التمش، انکی چال کا وقار، انکی شخصیت کی بے پناہ کشش انہیں اس عامیانه سوال سے بہت اونچی سطح پر رکھتی تھی۔

”چوبیس سال“۔ کاکل نے اپنی جگہ کسمسا کر سچی بات بتادی۔

”وہ تو ظاہر ہے“۔ التمش کی نظر نے اسکے اطراف طواف کیا۔ کاکل کو یوں بھی انکی نظر کی پیساکی نے پریشان کر دیا تھا جیسے اس سے متعلق ہر بات ایک الزام، ایک دشنام تھی۔

”کتنے بچے تھے کرتچ (Creche) میں؟“ انہوں نے پسترا بدل کر کہا
 ”شاید بال واڑی سمجھ میں آتا ہو۔ کتنے بچے تھے تمہاری بال واڑی میں؟“ انکے
 لہجے میں طنز عیاں تھا۔ کاکل کو غصہ آگیا۔ وہ اسے خواہ مخواہ کہڑے میں دھکیلے
 جا رہے تھے۔

”میں کرتچ کا مطلب اچھی طرح سمجھتی ہوں۔“ اس نے حتی الامکان
 ہنست سے کہا۔ ”لیکن میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ میں نے کبھی کرتچ کی
 صورت تک نہیں دیکھی۔“ شاید وہ ضبط کا آخری تار تھا جو التمش میں ٹوٹا۔ وہ
 ٹیبل پر ایک مکا مار کر کھڑے ہو گئے اور کاکل اچھل پڑی۔

”بیٹھ جاو اپنی جگہ۔“ وہ گرجے۔ لیکن خود کاکل کے پیروں کی سکت
 جاتی رہی تھی۔ اسے ایسا لگا جیسے ساری زندگی وہ اسی کرسی پر بیٹھی رہی تھی۔
 ”ایک سوال اور۔“ وہ گھوم کر اس کے سامنے آتے ہوئے بولے۔
 ”تمہارے مرحوم شوہر کا کیا نام تھا یا تمہیں اس سے بھی انکار ہے؟“ انکا لہجہ
 گلشیر تھا۔

کاکل ہونق کی طرح آنکھیں پھاڑے انہیں دیکھتی رہی۔

”میری تو۔۔۔۔۔ میں تو شادی شدہ نہیں ہوں“ وہ بمشکل بولی۔
 ”تمہیں دیکھ کر تو کوئی اندھا بھی یہی کہیگا۔“ وہ اسکے قریب پہنچ کر
 بولے۔ ”یہ ہر نیوں جیسی آنکھیں۔“ انہوں نے اسکی آنکھوں میں جھانک کر
 کہا ”یہ کورے لب“ انکی نظر نے پیباکی سے اسکے لبوں کا طواف کیا ”اور
 رخساروں پر چمکتا یہ گلابی رنگ کسی بیابا کا نہیں ہو سکتا۔“ کاکل نے

محسوس کیا وہ جان بوجھ کر اس کی ہینک کر رہے تھے۔ اسے غصہ دلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ سب کچھ کاکل کو بے جا لگا۔

”آپ، آپ، کہنا کیا چاہتے ہیں۔“ اس نے کرسی کے دونوں دستے کس کر پکڑ لئے جیسے انہیں ہتھیار بنارہی ہو التمش اس پر حملہ کرنے جا رہے تھے

”واللہ۔ جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ تم سننا نہیں چاہو گی۔“ وہ اب بھی اسکا راستہ گھیرے کھڑے رہے تھے۔ ”کیا مقصد تھا یہاں آنے کا؟ سنا دلولہ یا اوٹی کی سیر؟ جسکے لئے تمہیں لٹنے جھوٹ کہنے پڑے۔ لیکن جانتی ہو تم نے کتنا بڑا رسک لیا ہے یہاں آکر؟“ وہ کہتے گئے۔ ”تمہاری طرح کی بگڑیل لڑکیاں خود مختاری کی تلاش میں گھر چھوڑ کر نکل پڑتی ہیں۔ ان خطروں سے بے خبر جو مردوں کی اس دنیا میں ان کے منتظر رہتے ہیں!“

”یہاں اللہ کی بنائی اس دنیا کو صرف مردوں کی دنیا نہیں سمجھتی۔ اس پر جتنا مردوں کا حق ہے اتنا ہی عورتوں کا بھی ہے“ اب اسے واقعی غصہ آگیا۔

”یہ محض تمہارا زعم ہے۔ تم بھٹکی ہوئی لڑکیاں اسی خیال خام میں گھر سے نکل پڑتی ہیں۔ اور جب خطرہ سامنے آتا ہے تو بالکل معصوم بن جاتی ہیں۔“

خطرہ واقعی کاکل کے سامنے کھڑا تھا۔ اسکی انگلیاں سنبھلنے کی زبردست کوشش کے باوجود کرسی کے دستوں پر کانپنے لگی تھیں۔

”میں نے کوئی جھوٹ نہیں کہا۔ مجھے اوٹی کی سیر کا شوق تھا نہ“ اس

نے کرسی سے اٹھنے کی بے سود کوشش کی۔ وہ اپنی ساری قوتیں یکجا کر کے
التمش کی چھا جانے والی شخصیت کا مقابلہ کر رہی تھی۔

”اب تم کہو گی کہ تم کسی حور بانو کو بھی نہیں جانتیں!۔ کاکل کے
ذہن میں گھنٹی سی بجی۔

”حور بانو؟“ لسنے جیسے زیر لب کہا۔

”تم جانتی ہو وہ میری چچی ہیں۔ تم نے انہیں یہاں تک پہنچنے کا ذریعہ
بنایا لیکن کاکل جہاں یہ اچھی طرح سمجھ لویہ سودا تمہیں مہنگا پڑیگا۔“

”میں نے کوئی سودا نہیں کیا۔ اور میرا نام صرف کاکل ہے کاکل جہاں
نہیں۔“

”تمہارا نام کچھ بھی ہو۔ تمہیں اپنی چالاکی کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔“
انہوں نے کلائی پکڑ کر ایک جھٹکے سے اسے کھڑا کر دیا۔ ”میں دھوکا کھا کر زخمی
سانپ بن جاتا ہوں سمجھیں تم۔“ انہوں نے دوسرا ہاتھ اسکی کمر میں ڈال کر
اسے محصور کر لیا۔

مارے دہشت کے کاکل کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ اسے ایسا محسوس ہو
رہا تھا جیسے واقعی اس نے کسی سانپ کی بل میں ہاتھ ڈال دیا ہو۔ وہ نہیں
جانتی تھی کہ جب وہ خندق سے نکل آئی تو کوئی کھائی اسکی منتظر تھی

”مجھے یقین ہے ابھی تم میرے ہاتھوں میں موم بنکر پگھل جاو گی۔
اور کتنوں کو بیوقوف بنایا ہے تم نے؟“ انہوں نے اسکے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیکر
پوچھا ”بہت سستی سمجھتا ہوں میں تمہاری طرح کی لڑکیوں کو اور ایسی سستی

چیزوں سے مجھے نفرت ہے۔“ انہوں نے کاکل کو دھکا دیکر چھوڑ دیا اور وہ گرتے گرتے پچی۔ ”Now get out“ ان کی آواز حیرت انگیز طور پر نیچی تھی جیسے سانپ کی پھنکار ہو۔ وہ دروازہ کھول کر کھڑے ہو گئے۔

”میں کل ہی یہاں سے چلی جاؤنگی۔“ اس نے بمشکل کہا اور جانے لگی۔ ”اتنی آسانی سے نہیں۔۔ میں جھوٹوں کو منزل مقصود تک پہنچایا کرتا ہوں۔۔ تم جس کام کا بہانہ لیکر یہاں آئی تھیں وہ تمہیں کرنا ہوگا۔“

اس وقت تک ”جب تک میں چاہوں“ التمش کے لب و لہجہ سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کاکل کی خدمات سے زیادہ اسے زک دینے پر مُصر تھے۔ وہ درشتگی اور ذلت کا بھرپور تھپڑ تھا جو کاکل کے پندار پر پڑا۔ روکنے کے باوجود اس کی آنکھوں میں جلتے جلتے آنسو ابل آئے۔ اس نے اپنا منہ پھیر لیا تاکہ ہزیمت کے وہ آنسو التمش دیکھ نہ پائیں اور جہاں تک ممکن ہو سکا مسامت سے باہر نکل گئی۔

کتنا فرق تھا اس کاکل میں جو لائبریری میں داخل ہوئی تھی اور وہ جو اب وہاں سے نکل جا رہی تھی۔ ان دو ہی تین دنوں میں وہ خود کو اس کوٹھی کا مکین سمجھنے لگی تھی جیسے وہ عرصہ سے وہاں رہتی آئی ہو۔ اور اب اس کی حیثیت وہاں ایک قیدی کی سی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اسے خلا میں اچھال دیا گیا ہو۔

حور بانو کا نام سن کر ہی اسے سارے مہرے جگہ پر بیٹھتے نظر آئے۔ لیکن اب وہ کسے الزام دے، حور بانو کو کیا اپنی قسمت کو؟

التمش کا غصہ بھی بے جا نہیں تھا۔

حور بانو جب ان کے پاس آئیں تو انہوں نے التمش کو مسائل میں گھرا دیکھا۔ وہ منظر بھی دیکھا جب التمش پتھر دل لئے شہزاد اور زینو کو چھوڑنے کے لئے گئے اور پھر وہ سین بھی جب وہ آدھے رستے سے واپس ہوئے۔ جب وہ کار سے اتر کر کوٹھی میں داخل ہونے کے لئے سیرھیاں چڑھتے گئے تو شہزاد اور زینو ان کے کندھوں سے ایسے چپکے تھے جیسے اب کبھی جدا نہ ہونگے

ایک کے بعد دیگرے آیائیں آتی رہیں لیکن سب سے زیادہ جو ٹکی اس نے چار دن نکال لئے۔ ایک تو وہ التمش کے میزان پر نہیں اتریں دوسرے ڈورانے ان کی زندگی اجیرن کر دی۔ التمش کو کسی ایسی عورت کی تلاش تھی جو ہر لحاظ سے ڈور اسے برتر اور بڑھی لکھی ہو۔ عمر کے سنجیدہ دور سے گزر رہی ہو اور خاص کر اسے بچوں کا تجربہ ہوتا کہ وہ ان کی تربیت کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی دے سکے۔ بس پھر کیا تھا حور بانو نے ان سارے مجوزہ صفات کے ساتھ اپنی زنبیل سے کاکل کو نکال کر پیش کر دیا۔ ویسے بھی وہ اپنی پچھلی زک بھولی نہیں تھیں۔ اس بار وہ ایسا مکمل انتظام کرنا چاہتی تھیں کہ تیر کمان میں ہرگز واپس نہ آئے۔۔۔ آگے جو بھی ہو دیکھا جاسکتا تھا۔

التمش طیش کے عالم میں بہت ممکن تھا کاکل کو برطرف کر دیتے لیکن کوئی غیر محسوس سی طاقت تھی جس نے انہیں ایسا کرنے سے باز رکھا۔ وہ لڑکی جس نے ان کی کوٹھی میں پناہ لی تھی ہرگز ایسی نہیں لگتی تھی کہ اتنی چالباز ہو پھر کس مجبوری نے اسے دھوکے بازی پر آمادہ کیا؟۔۔۔ اور اب

سب سے بڑا سوال ان کے آگے یہ تھا کہ کیا بچوں کو ایک ناقابل بھروسہ،
جلسہ ساز لڑکی کی تحویل میں دیا جاسکتا تھا؟

ان کی انصاف پسند طبیعت نے طے کیا کہ کاکل کو صفائی پیش کرنے
کا موقع دیا جائے۔ اسکے لئے کاکل پر پہرے لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وقت
ہر سچائی کو بے نقاب کر دیتا ہے۔ وہ خود کاکل کی کارکردگی کو جانچ سکتے تھے۔
اسکے بعد کوئی فیصلہ کیا جاسکتا تھا۔

انہوں نے قلم اٹھایا اور معتمد فرانسیسی ادارہ تعلیم و ثقافت کو خط
لکھا جس میں Expedition میں شرکت نہ کر سکنے کی معذرت کی اور ساتھ
ہی یہ بھی واضح کر دیا کہ پراجیکٹ ٹیپو، کا تعلق چونکہ ہندوستان سے تھا۔ اس
لئے یہی مناسب اور بہتر تھا کہ وہ یہیں سے مراسلے بھیجتے رہیں۔

لائبریری میں الشمس سے ملاقات کے بعد جب کاکل باہر نکلی تو اس کی
۔۔۔ وہی حالت تھی جو ایک جواری کی ہوتی ہے جس نے بغیر سوچے سمجھے ہی
اپنی ساری پونجی داؤ پر لگادی ہو۔ اسے چاہیے تھا کہ احتیاط سے کام لیتی لیکن
احتیاط سے کھیلا ہوا جو ابھی جوایا ہوتا ہے۔

وہ اس قدر تھک گئی تھی کہ اس کے خوشنما کمرے کا آرامدہ بستر اس
کے لئے سب سے بڑی دعوتِ عیش ہوتا لیکن نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں
دور تھی۔ وہ رہ رہ کر یہی سوچتی کہ کیوں اس نے آنکھ بند کر کے حور بانو
پر اعتبار کر لیا جن کا پچھلار یکار ڈوہ نہیں بھولی تھی۔۔۔ لیکن ذہنی کیفیت کے

جس دور سے وہ گزر رہی تھا وہاں خوش فہمی میں مبتلا ہو جانا عین ممکن تھا۔
 خاموش اندھیرے میں کوری آنکھیں لئے وہ بستر پر بے سدھ پڑی
 رہی۔ نیچے ہال میں رکھے گرینڈ فادر کلاک کے گھنٹے وقتاً فوقتاً بجتے رہے۔ صدر
 دروازے کے بند ہونے کی آواز، خود اس کے خوابوں کے چکنا چور ہونے کی
 آواز اور اپنے پچھتاوے کی غیر مانوس آواز ان سب آوازوں نے اسے جگائے
 رکھا۔ التمش حور بانو کو بھی اس سازش کا شکار سمجھ رہے تھے۔ انکا صاف
 مطلب یہ تھا کہ کوٹھی میں اپنی جگہ بنانے کے لئے کاکل نے اوچھے اور سستے
 عربے استعمال کئے تھے۔ اس طرح حور بانو صاف بری ہو جاتی تھیں لیکن اس
 کے لئے مفر کہیں نہیں تھا۔

پریشان خیالات اور تھکن نے مل کر اپنا کام کیا۔ جیسے کوئی پھندہ اس
 کے حلق پر کستا جا رہا تھا۔ درپچوں سے آتی ٹھنڈی ہوا کے باوجود اس کا ماتھا
 پسینے سے بھگ گیا تھا۔۔۔ ہاتھ پاؤں جیسے شل ہو گئے تھے۔ ایسا اکثر اس
 وقت ہوتا ہے جب ہم جلد بازی میں کوئی فیصلہ کر بیٹھتے ہیں۔ اور بعد میں
 کفِ افسوس ملتے ہیں۔

کروٹیں بدلتے آدھی رات گزر گئی۔ وادی میں سینکڑوں جگنو چمکتے
 رہے لیکن کسی نے اسے روشنی نہیں دی۔ اسکا حلق سوکھ رہا تھا۔ وہ بے چین
 ہوئی اور دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ گھوم کر جاتے ہوئے برآمدے کے
 سرے پر، کمرے سے دروازے کے نیچے روشنی کی لکیر بتا رہی تھی کہ التمش
 جاگ رہے تھے۔۔۔۔۔ وہ بمشکل دبے پاؤں سیدھیاں اتر آئی اور پھر اسی

وحشت میں ہال سے ہو کر کچن کی طرف بڑھی۔ اس وسیع ڈرائنگ روم کی سجاوٹ، تنہوں بیچ لٹکتے جھاڑ فانوس کی ٹنگ لنگ اس مکمل خاموشی میں کسی جاسوسی فلم کا ایک حصہ لگ رہے تھے۔ اس نے وحشی ہرنی کی طرح آس پاس نظر دوڑائی۔ دو سیڑھیاں اتر کر ڈائنگ ہال سے ملحق کچن تھا، اسے پانی وہیں مل سکتا تھا جس کی اسے سخت ضرورت تھی۔ ڈائنگ ہال اور کچن کے درمیان ایک مختصر لابی تھی اور پھر ایک دروازہ جس کے تنہوں بیچ ایک بیضوی شیشہ لگا تھا جہاں سے خدمت گار آقاؤں کو خاصہ تناول کرتے دیکھتے اور ان کی ضرورتوں کا خیال رکھتے۔

دروازہ کھولنے سے پہلے کاکل کی نظر نے شیشے سے جو نظارہ دیکھا اس نے اس کے پریشان خیالات کو اور بھی پراگندہ کر دیا۔

کشادہ اور ماڈرن کچن کے بیچ سیاہ آنسوئی ٹیبل تھا اور اوپر سے ہالے کی طرح گرتی روشنی میں وہاں دو پرسرار ہستیاں بیٹھی تھیں۔ کاکل نے انہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ مارے ہیبت کے اپنی پیاس بھول گئی۔۔۔ وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی لیکن جیسے کسی اژدہ کی مقناطیسی آنکھوں نے اسے جکڑ لیا تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی ان دونوں پر سے اپنی نظریں نہیں ہٹا سکی۔

ان دونوں ہستیوں میں ایک بہت دراز قد اور ورزشی بدن کا تھا۔ جس کی سیاہ داڑھی اور گھنے گھونگرے بال تھے۔ اس نے اپنے ہاتھ میں ایک عصا نما موٹی چھڑی تھامی ہوئی تھی۔ جس کے سرے پر بھینس کا خوفناک

سر بنا ہوا تھا۔ اس شخص کی فطری بے چینی اسکے عصا سے ظاہر ہوتی تھی جسے بات کرتے ہوئے وہ جوش میں بار بار ہلانے لگتا۔ دوسرا شخص بھی گو اس سے قد میں کم تھا مگر اس کے داڑھی نہیں تھی۔ اسکے حرکات و سکنات میں ٹہراؤ تھا لیکن اسکی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بے چین اور حیرت انگیز طور پر چمکدار تھیں۔ نیلگوں چہرے پر دہانے کی دونوں جانب دراڑیں اور چوکور ٹھوڑی اس کی استقامت اور قوی ارادے کو ظاہر کرتی تھیں۔

اچانک اس داڑھی والے شخص کی نظر بیضوی شیشے سے جھانکتی کاکل پہنچی اور وہ تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کاکل پلٹ کر سرپٹ بھاگ کھڑی ہوئی اسے اس سیزھی کا دھیان نہیں رہا جو ڈائننگ ہال کو ڈرائینگ روم سے الگ کرتی تھی۔ ٹھوکر لگی اور اسکے بعد کاکل کو ہوش نہیں رہا۔

جب کاکل کو ہوش آیا تو ایک چہرہ اس پر جھکا ہوا تھا۔ وہی چہرہ جس کے مالک نے چند گھنٹوں پہلے اسے ذلیل کیا تھا۔ لیکن وہی چہرہ قرونوں کی دوری کے باوجود اسے اپنا سا لگا۔ طوفان میں گہری چیونٹی، تنکے کی تلاش میں تھی۔ لیکن التمش کی گہری گہری آنکھیں بالکل خاموش تھیں۔۔۔ انہوں نے اسے کوئی دلاسا نہیں دیا۔ وہ شب خوانی کے لباس میں تھے جس پر انہوں نے لاپرواہی سے وہی ڈرائینگ گاؤن ڈالا ہوا تھا جو کاکل نے لائبریری میں دیکھا تھا۔ ایسا لگتا تھا گویا وہ بہت عجلت میں اپنی خوابگاہ سے نکل آئے تھے۔

کاکل نے آنکھیں گھما کر اپنے اطراف و اکناف کا جائزہ لیا۔ وہ اپنے ہی کمرے میں آرام دہ بستر پر لیٹی تھی۔ وہی بستر جس نے کچھ دیر پہلے اسے نیند عطا

کرنے سے یکسر انکار کیا تھا۔۔۔ پائینتی ایک چہرہ اور بھی تھا جس پر اس کی آنکھیں جم گئیں۔ وہی چہرہ جسے اس نے کچن میں دیکھا تھا تو جس بات کو وہ اپنی بد خوابی سمجھ رہی تھی، وہ حقیقت تھی۔۔۔۔۔ ہاں وہی چہرہ تھا پر سکوت، کسی بھی طرح کے جذبات سے عاری لیکن کمرے کے اس ماحول میں استنا خوفناک نہیں جبکہ کچن کے آبنوسی ٹیبل کی سیاسی اور روشنی کے ہالے نے اسے پر اسرار بنا دیا تھا۔

”ہم سوما سے بات کر رہا تھا چھوٹے سرکار“ ڈورانے کہا ”یہ بی بی ہمارا بات سن رہا تھا“ ڈورا کے انداز میں ناگواری تھی یہ کھکر ڈورا گویا کاکل کے تابوت میں ایک کیل اور ٹھونک رہی تھی۔ اب اس پر ایک اور اخلاقی کمزوری کا الزام بھی ثابت ہو جائے گا کہ وہ دوسروں کی باتیں چھپ چھپ کر سنا کرتی ہے۔۔۔۔۔ نہیں یہ اس کی عادت نہیں ہے،۔۔۔۔۔ وہ اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ وہ ذہنی اور جسمانی طور پر اتنی تھک گئی تھی کہ اس سے خود اپنی مدافعت نہ ہو سکی۔ اس کی بند آنکھوں کے کنارے سے ایک آنسو بہہ کر تیکے میں جذب ہو گیا۔

ڈاکٹر آکر جا چکا تھا۔ اس کے دیئے ہوئے انجکشن نے اثر کرنا شروع کر دیا تھا۔۔۔ وہ دنیا اور مافیہا سے بے خبر ہو گئی

اگر کاکل نے ڈورا کو پہلے دیکھا ہوتا تو اس کے پھکے نہیں چھوٹتے۔ جب سے وہ آئی تھی ڈورا گٹھیا کے درد میں مبتلا اور صاحب فراش تھی۔ آج

سوما اس سے ملنے کے لئے آیا تھا۔ ڈورا اور سوما کا نیلگری پہاڑوں میں بسنے والے قبیلے ٹوڈا سے تعلق تھا۔ سوما قبیلے کا سربرآوردہ رکن تھا۔ جبکہ ڈورانے برسوں پہلے قبیلہ چھوڑ کر عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا۔

نیلگری کے پہاڑی ڈھلانوں میں مقیم یہ ٹوڈا قبیلہ کئی خصوصیات کی وجہ سے اپنی ایک انوکھی شناخت رکھتا ہے۔ جنوبی ہندوستان کا ایک حصہ ہونے کے باوجود ٹوڈاؤں کی شخصیت وہاں کے باشندوں سے جداگانہ ہے۔ اس کی وجہ انکا اپنی نسل کی بقا کا تحفظ ہو سکتا ہے۔ تپتے ہوئے

تانبے کا سارنگ اور گھنے بال۔۔۔۔۔ مرد سیاہ داڑھیاں رکھنے میں فخر محسوس کرتے ہیں تو عورتیں اپنے چہروں کو گجملگ گودنے سے سجاتی ہیں جو سارے چہرے کو نیلگوں بنا دیتا ہے۔

اور عورتوں کی طرح ڈورا بھی اپنے چمکدار سیاہ بالوں کو پام کے پتوں میں لپیٹ کر ان کے لٹھے کندھوں پر چھوڑ دیتی تھی۔ سن رسیدگی کے باوجود اس کے بال اب بھی سیاہ تھے۔ انسان خود کی شناخت کے لئے اپنے اپنے خدا تراش لیتا ہے ٹوڈاؤں کے معاشرے میں بھینس کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ان ہی کے گلوں میں وہ اپنی مقدس گھنٹیاں باندھتے اور انکی پرستش کرتے ہیں۔ سوما کے عصا کے مٹھ پر بھی بھینس کا ہی سر بنا تھا۔ سیاہ پتھرائی آنکھوں والا۔ بھینس ہی انکی زندگی کا اہم جز ہے۔ ان کی معیشت کی ذمہ دار۔ سیدھے سادے ٹوڈا، دودھ، دہی، مکھن، گھی دے کر ان کے عوض اپنی ضروریات کی چیزیں خریدتے ہیں

یہ فطری طور پر امن پسند ہوتے ہیں۔ انکے پاس ہتھیار نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی، عورتوں اور مردوں کا یکساں لباس ہوتا ہے۔ بس ایک لامتناہی سفید چادر انکے سارے بدن کو ڈھانپے رکھتی ہے۔ صرف ایک مضبوط شانہ کھلا رہتا ہے۔

ڈورا کی اس ہیئت کے باوجود، شہزاد اور زمینو اس سے خوفزدہ نہیں تھے۔ کیونکہ وہ انکی پیدائش سے ہی اس ماحول کا ایک حصہ تھی۔ بلکہ وہی تو تھی جس نے نور ابے بی اور دو جڑواں بچوں کو سب سے پہلے آنچل میں چھپایا تھا۔

سوما کافی دنوں کے بعد ڈورا سے ملنے آیا تھا۔

”تو نے قبیلہ چھوڑ بھی دیا تو کیا ہوا“۔ وہ عادتاً اپنا عصا ہلا کر ڈورا سے کہہ رہا تھا۔ ”ہے تو تو ہم ہی میں سے ایک“

ڈورا کو اس حقیقت سے انکار کہاں تھا۔ وہ سوما کی آنکھوں میں دیکھتی تھی یہ بھٹی رہی۔

”کیا ہوا جو تو نے کسی اور کے بچے کو جنم دیا“۔ سوما بولا ”میں اسے اپنانے کو تیار تھا۔ میں نے تو تیری چوکھٹ پر تیر کمان بھی رکھ دی تھی جسے تو

نے کہیں پھینک دیا۔" سومانے شکایت کیا۔
 "تیر کمان دینے والا تو اکیلا تو نہیں تھا۔" ڈورانے کمال بے اعتنائی سے کہا۔

ٹوڈا قبیلے کے رواج کے مطابق حاملہ عورت کے پیدا ہونے والے بچے کی ولادت طے کی جاتی ہے۔ جہاں عام طور پر کئی ممکنات ہوتے ہیں وہاں کوئی ایک شخص آگے بڑھ کر یہ خوشگوار ذمہ داری اپنے سر لے لیتا ہے اور وہ ساری برادری کے سامنے ایک ننھی سی تیر کمان اس عورت کو پیش کرتا ہے گویا اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ اسنے بچے کی ولدیت قبول کی۔ یہی نہیں بلکہ مستقبل میں اس عورت کے پیدا ہونے والے سارے بچوں کا کفیل وہی ہوتا ہے۔ چاہے وہ کسی اور کی اولاد کیوں نہ ہوں۔ یہ ذمہ داری ایک مقررہ مدت کے لئے ہوتی ہے۔ اسکی میعاد ختم ہونے پر کوئی اور سورمایہ فریضہ اپنے سر لے لیتا ہے۔

"مجھے تیر کمان دینے والے اور بھی تو تھے۔" ڈورانے فخر سے کہا۔
 "لیکن تو تو جانتی ہے، میں نے تیرے بعد کسی اور عورت کی صورت نہیں دیکھی۔" یہ حقیقت تھی۔ سومانے ڈورا کو جی جان سے چاہا تھا۔
 انکی دراوڑی زبان کا ایک لفظ بھی کاکل نہیں سمجھ پارہی تھی، لیکن وہ ایک عجیب سی مقناطیسی کشش تھی جس نے اسکے پاؤں جکڑ لئے تھے اور اسکی نظر ان دو غیر معمولی چہروں سے ہٹ نہیں رہی تھی۔
 "میں کہتا ہوں ابھی وقت ہے۔ تیرا بیٹا بڑا ہو گیا ہے۔ تو نے اپنی ضد

پوری کر لی۔ اب تجھے کونسی بات کی فکر ہے۔ لوٹ چل قبیلے میں۔“۔ سومانے
ڈورا کو ترغیب دی۔

”مسیح کو میں نہیں چھوڑ سکتی سوما۔“۔ ڈورا اٹھی۔ اس نے ایک ڈبہ
کھول کر اس سے ڈبل روٹی نکالی اور دو گلاسوں کے ساتھ کانچ کے ایک جگ
میں دودھ بھر کر سوما کے آگے رکھ دیا اور وہیں بیٹھ کر ٹوسٹ پر مکھن لگانے
لگی۔

”کیوں، مسیح کو کیا ہوا؟“۔ سومانے دودھ کا بڑا گھونٹ لے کر پوچھا

بیضوی شیشے سے جھانکتی کاکل نے جب مسیح کا نام سنا تو اسکے ہاتھوں
کے طوطے اڑ گئے۔ مسیح کی جان کو خطرہ تھا وہ دواجنبی ضرور کوئی سازش کر
رہے تھے۔ اسکے ڈر کی انتہا نہ رہی۔

”وہ اپنے آپ کو چرچ کو سوپنا چاہتا ہے۔ پادری بننا چاہتا ہے۔“۔
”تو اس میں کیا ہوا؟“۔ سوما کے لہجے میں طنز تھا۔ ”تو نے بھی تو مسیحی
بن کر قبیلہ چھوڑ دیا۔“

”میں نے تو صرف قبیلہ چھوڑا تھا۔“۔ ڈورا زچ ہو کر بولی ”وہ تو دنیا
چھوڑ دینا چاہتا ہے۔“

”قبیلہ ہی تو تیری دنیا تھی!“۔ ڈورا کو کچھ کے لگا کر سوما کو ایک گوند
خوشی حاصل ہو رہی تھی۔

”میں ایسا ہرگز نہ ہونے دوں گی۔“۔ ڈورا نے پورے اعتماد سے کہا۔
”نوجوانی اور پہاڑوں سے پھوٹتے پختے خود سر ہوتے ہیں۔“۔ سومانے

ٹوسٹ پر مکھن کی ایک اور تہ چڑھاتے ہوئے کہا۔

ڈوراکسی سوچ میں ڈوب گئی۔ حالانکہ وہ عورت تھی، لیکن پہناوے اور گھنے گھونگھرالے بالوں اور نقش و نگار کی یکسانیت تذکیر و تانیث کی تمیز کو تقریباً مٹا رہی تھی۔ صرف داڑھی کی موجودگی ٹوڈا مرد کو ممیز کرتی تھی۔

”کس سوچ میں پڑ گئی تو؟“۔ ڈوراکا کو سوچ میں دیکھ کر سومانے پوچھا ”سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا۔“

”مسح کہہ رہا تھا چھوٹے سرکار نے ایک لڑکی بلائی ہے“۔ وہ بولی۔
 ”ہوگی اسی کی عورت“۔ سوما تضحیک سے ہنسا ”کتنے عجیب رواج ہیں ان کے ایک عورت بس ایک ہی کی ہو کر رہ جاتی ہے۔ تنگ دل کہیں کے“
 ہنسنے پر سوما کے دانت موتیوں کی طرح چمکے۔ اسکی عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا دودھ دہی مکھن اور کھلی ہوا کے متوالے بڑھاپے کو اپنی دہلیز چھونے نہیں دیتے۔ اک اتنی ہی دیر میں وہ جگ بھر دودھ غٹا گیا تھا اور مکھن بھی۔
 ”نہیں، یہ انکی عورت نہیں ہے۔ دونوں الگ الگ کمروں میں سوتے ہیں نیچے خانساماں نے بتایا تھا۔“

”دیکھ میں پھر کہتا ہوں واپس چلی اپنے کمرے میں“۔ سومانے بچا کپا مکھن بھی صاف کرتے ہوئے کہا۔

”تو اپنی رٹ لگائے ہے“۔ اس بار ڈورا ابھڑ گئی۔

”اب میں گھاس پھوس کے ان لٹے کٹوروں جیسے جھونپڑوں میں نہیں رہ سکتی“ ڈورانے اپنے ٹوڈائی خون کے باوجود کہا جو سوما کے ٹوڈائی

غور کو ٹھیس پہنچا گیا۔ وہ جانے کے لئے اٹھا اور تبھی اس کی نظر بیضوی شیشے سے جھانکتی کاکل کی پھٹی پھٹی آنکھوں پر پڑ گئی بسنے ڈور اکا ہاتھ دبا کر ادھر اشارہ کیا۔ ان چار آنکھوں کی اچانک توجہ نے کاکل کے پاؤں کی رہی رہی ہی سکت بھی سلب کر لی۔

مسیح کی زندگی بچپن سے جوانی تک بخت خاندان ہی میں گزری تھی۔ لیکن اسے ان کا پروردہ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ ڈور اکو جو تنخواہ ملتی تھی وہ اس کی پرورش کے لئے بھی کافی سے زیادہ تھی سہتا نچہ جب اختر بخت نے مسیح کو بھی اسی اسکول بھجوانے کی پیشکش کی جہاں التمش جاتے تھے تو ڈور اس پر راضی نہ ہوئی۔ وہ التمش اور مسیح کے بنیادی فرق کو جانتی تھی۔ التمش کو بہت کچھ موروثی طور پر حاصل تھا جبکہ مسیح کو دنیا میں اپنی جگہ خود بنانی تھی۔ بھلے ہی وہ اسی اسکول جاتا کالج کی پڑھائی پوری کرتا لیکن بلندی تک پہنچنے کے لئے جو پائیدان التمش کو ملا، اسے کبھی نہ ملتا۔۔۔۔۔ اس فیصلے کا ذمہ دار ڈور اکا ٹوڈائی غور بھی تھا۔۔۔ وہ اپنے بچے کو اپنے بل بوتے پر آگے بڑھانا چاہتی تھی اس نے مسیح کو مشن اسکول بھیجنے کا فیصلہ کیا جسے اختر بخت نے قبول کر لیا۔ شاید یہیں سے التمش اور مسیح کے راستے الگ الگ ہونے لگے تھے ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنے کے باوجود تکلف کی وہ دیوار جو لڑکپن سے جوانی تک ان کے بیچ اینٹ اینٹ بڑھ آئی تھی اسے التمش نے بھی کبھی ڈھانے کی کوشش نہیں کی۔ نہ مسیح کو اس طبقاتی فرق کی شکایت تھی جو اس کے اور

بخت خاندان کے مابین تھا۔ التمش کے اور اس کے تعلقات دوستانہ ضرور تھے لیکن وہ کبھی بے تکلفی کی حدوں کو نہیں چھو پائے۔ مسیح بھی دنیا میں کچھ کر دکھانے کا خواہشمند تھا لیکن کسی حسد یا رشک کی بنا پر نہیں بلکہ اس کا ایقان تھا کہ زندگی کو کوئی آئیڈیل دینا ہر انسان کے لئے ضروری ہے۔ خدا نے دنیا بنائی اور انسان کے حوالے کر دی۔ اسے سنوارے رکھنا انسان کا فرض ہے۔

لڑکپن میں ہی کسی موٹر پر مسیح نے طے کر لیا تھا کہ وہ پادری بن جائے گا۔ اس میں پادری بننے کی ساری صلاحیتیں موجود تھیں۔ سنہری پوشے کے پچھے اس کی پرسکون نیلی آنکھیں، اس کی قوت برداشت، سنجیدہ ذہن نا مساعد حالات میں متانت سے فیصلہ کرنے کی قابلیت۔۔۔۔۔ اور سب سے زیادہ خدمت خلق کا جذبہ۔

رات کے دس بجے تھے اور مسیح کے آگے ٹیبل پر کاغذات اور رجسٹر کھلے تھے۔ اسکے گورے رنگ پر خط کی سبزی اجاگر ہونے لگی تھی۔۔۔ اس کے ابرو پر بل تھے جیسے وہ کسی پیچیدہ گتھی کو حل کرنے کی کوشش میں لگا ہو۔۔۔ ابھی تک اس کی زندگی ایک صاف و شفاف آئینے کی طرح تھی لیکن اب کچھ غبار اٹھ کر اسے دھندلانے لگے تھے۔ آج تک کسی لڑکی کے حسن نے اسے متاثر نہیں کیا تھا۔ وہ نیچر کا شیدا ہی تھا۔ اسے پھولوں سے دلکش نظاروں سے عشق تھا لیکن پہلی بار کاکل کو اسٹیشن پر دیکھ کر اسے لگا جیسے حسین و پاکباز للی کے پھول اب کبھی اسے محض پھول نہیں لگ سکتے کیونکہ انہوں نے

ایک شخصیت کا روپ دھار لیا تھا۔

وہ اسٹیٹ کے سبھی کاموں میں اختر بخت اور پھر شاہ نور کی مدد کرتا آیا تھا جس کا معاوضہ اسے خاطر خواہ ملتا تھا۔ اسٹیٹ کے کاموں کے بعد وہ مطالعے میں اپنا وقت صرف کرتا۔ وہ صرف کلیسیائی لٹریچر، ہی نہیں بلکہ اچھے معیاری اور سنجیدہ ادب کا دلدادہ تھا۔

اسے آنے والے اتوار کو چرچ میں دی جانے والی تقریر کی تیاری کرنی تھی۔ لیکن آج اس میں بھی اس کا دل نہیں لگا۔ بسنے رجسٹر اور کتابیں بند کر دیں اور خود اپنی تنقید پر اتر آیا۔

صدیوں پہلے ۱۶۶۳ء میں فرانس کے بادشاہ نے مولیر کے ڈرامے "تارتف" کو عوام کے سامنے پیش کرنے پر پابندی لگادی تھی کیونکہ مولیر نے اس میں مذہب اور رہبانیت پر کاری حملے کئے تھے۔ کلیسیا کی خود مختاری کے اس دور میں امیر امراء اپنے لئے پادریوں سے جنت میں داخل ہونے کے پروانے لیا کرتے تھے۔ مسیح کا خیال تھا کہ بعینہ وہی ریاکاری صدیوں بعد اب بھی رائج ہو چلی ہے۔ وہ کونسی طاقت تھی جو اسے پادری بننے پر اکسارہی تھی۔ کیا وہ اتنا بزدل تھا کہ بغیر پادری بنے دنیا اور سماج کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اور کیا اسی لئے وہ ایک گوشہ عافیت کا مستلاشی تھا! یا سچی خوشی دنیا اور اس کی ہوس کو چھوڑ کر ہی حاصل ہو سکتی تھی! نروان کا یہ نظریہ مہاتما بدھ نے بھی تو پیش کیا تھا۔۔۔ یہ انسان کی ہوس ہی تو ہے جو زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں پا کر بھی وہ اس لازوال خوشی کی تلاش میں رہتا ہے جس کا وجود ہی

نہیں۔ اس کی مثال وہی ہے جیسے ایک نابینا، اندھیری رات میں۔۔۔ کسی گھور اندھیرے کمرے میں کاجل کی طرح سیاہ بلی کی تلاش کر رہا ہو۔۔۔۔۔ وہ بلی جو وہاں ہے ہی نہیں! لازوال کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ جو سمجھدار لوگ ہیں وہ چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے سہارے ہی زندگی گزار لیتے ہیں۔۔۔۔۔ بڑی خوشی کا انتظار تو ایک سٹہ ہے لگے لگے نہ لگے۔۔۔۔۔ اور جو لگ بھی جائے تو ہر بڑی چیز حاصل ہونے پر چھوٹی معلوم ہونے لگتی ہے اور دل دیوانہ، طالب طلب، صحرانوردی میں نکل جاتا ہے۔

ساتویں در کا پتہ گنبدِ افسوں کی کلید

بیچ بازار میں کیا کیا نہ دوانہ مانگے

اور مسیح کی نظربنی بی مریم کے مجسمے کے آگے رکھے گلدان میں للی کے
تروتازہ پھولوں پر گئی۔

”اوگا ڈا!“۔۔۔ اس نے آنکھیں بند کر کے سوچا۔۔۔۔۔ یہ للی کے پاکیزہ

پھول! یہ پھول مرجھا جائیں گے تو آئی، اگلے دن پھر تروتازہ پھول وہاں سجا
دیگی۔ لیکن ان پھولوں کا کیا ہوگا۔ جو شخصیت بن کر مسیح کے دل و دماغ میں
لبے جا رہے تھے۔ ابدی، دائمی!

ڈورا کی عقابی نظروں نے کاکل میں مسیح کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کو
بھانپ لیا تھا۔۔۔ مسیح کو وہ چند دنوں سے کھویا ہوا سا پاتی تھی۔ عام طور پر
سلجھا ہوا، ہنس مکھ مسیح کچھ دنوں سے اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ اپنی تقریر بہت اچھی
تیار کرنے کے باوجود اتوار کے دن چرچ میں اس نے دو تین فاش غلطیاں

کیں۔ ڈور نے جب چند نوجوان چھوکروں کو ایک دوسرے کو کہنیاں مارتے کھلکھلاتے دیکھا تو اس کا خون کھول گیا۔ وہ سب اس کے پینڈ سم پیٹے سے جلتے تھے۔ کیونکہ ساری نوجوان چھوکریاں انہیں خاطر میں نہیں لاتیں جبکہ مسیح کے آگے آنکھیں پٹختیں اس روز وہ بہت اداس تھا۔ سرویس کے بعد رومن کیتھولک عقیدے کے مطابق اس نے چھوٹی سی کھڑکی کے آگے گھٹنا ٹیکے اپنے گناہ کا اقرار بھی کیا تھا اور چھوٹے سے Confession Room

میں سر جھکائے بیٹھے پادری نے اس کا ایک ایک لفظ دھیان سے سنا تھا۔ دنیا بھر کے آٹھ سو چالیس ملین کیتھولک عیسائیوں میں کوئی ایسا بھی تھا جس کا سر اس چھوٹی سی کھڑکی کے آگے کبھی نہ جھکا ہو؟ شرمساری سے جس کی جبیں عرق آلود نہ ہوئی ہو؟ لیکن مسیح کو دوسروں سے کیا لینا دینا تھا۔۔۔ لیکن اب تک بسنے اپنے دامن کو اس آگ سے بچائے رکھا تھا جو کسی دن دامن کو جلا کر خاک کر دیتی ہے تو پھر اب کیوں وہ خود کو اتنا مجبور محسوس کر رہا تھا؟ لیکن انسان کوئی پتھر تو نہیں کہ ہر موسم سہہ جائے۔ کبھی موم بن کر پگھل جانے میں بھی مزہ ہے۔ اور مسیح اسی حقیقت کو ماننے سے انکار کر رہا تھا۔

لیکن ڈور ا کے لئے یہ نیک فال تھی کیونکہ اب تک اسکی ہر کوشش مسیح کو پادری بننے سے باز رکھنے میں ناکام ہوئی تھی۔ اب کاکل کا پیار اس کی یہ آرزو پوری کر سکتا تھا۔۔۔ ادھر کاکل نے بھی ڈور کی طرف خیر سگالی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ ڈور اس سنہری موقع کو ہاتھ سے جانے دینا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کئی بار کاکل کو مسیح کے ساتھ چائے کے باغوں میں دیکھا تھا جہاں مسیح

اسے چائے کے بارے میں معلومات دے رہا تھا۔ باغان کی عورتوں کے ساتھ
 دلچسپی سے گھل مل کر کام کرتے دیکھا تھا۔۔۔۔۔ سرپر ٹوکری اٹکائے دو دو
 پتیوں کی کو نیلیں چنتے۔۔۔ یہ بھی دیکھا تھا کہ مسیح کی نظریں غیر شعوری طور پر
 اس کا پیچھا کرتیں جنہیں دفعتاً وہ ٹوک کر پھیر لیتا۔

صبح اٹھکر کاکل نے درپچوں سے پردے اٹھائے۔ اور بالکونی میں نکل آئی۔ راحت بخش ہوا کے چند جھونکوں نے مدد کی اور وہ رات کے واقعات کو ذہن میں دہرا کر نفل ہو گئی۔ اپنے بیہوش ہو جانے کو ایک خاص ذہنی کیفیت کا رد عمل سمجھ کر اس نے بھلانے کی کوشش کی۔ لیکن التمش کے غضبناک تیور ان کے الفاظ کا لاوا۔ وہ سب کچھ حقیقت تھا۔ رات میں اس کی حالت زار دیکھ کر شاید انہیں رحم آگیا تھا۔ اب کسی لمحے ان کا حکم آسکتا تھا کہ وہ کوٹھی چھوڑ دے۔ اب اس کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ یا تو وہ حالات کے آگے گھٹنے ٹیک دیتی اور سارا الزام حور بانو کے سر دے کر معافی مانگ لیتی۔ یا پھر صورت حال کا حم کر مقابلہ کرتی اور ثابت کر دیتی کہ التمش کے شبہات بے بنیاد تھے۔ اپنی کسنی اور نا تجربہ کاری کے باوجود وہ اپنے فرائض کا پوری طرح احساس رکھتی تھی۔ پہلی صورت کو لسنے سرے سے رد کر دیا۔ اسکی خود داری اسے ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دے سکتی تھی کہ اپنی ناکردہ گناہی کے باوجود وہ خود کو قصور وار ٹھراتی وہ خود وہاں نہیں آئی تھی اسے بلایا گیا تھا۔۔۔ اگر وہ واپس جائے تو ایک مجرم کی طرح نہیں بلکہ اپنی ناکردہ گناہی ثابت کر کے جائے گی۔

اور وہ جب تک وہاں ہے پوری تنہا ہی سے اپنے فرائض انجام دیگی اس نے غسل کیا کپڑے بدلے اور بچوں کو جگانے چلی گئی۔ وہاں اس نے دیکھا کہ ڈور آنے ہی انہیں جگادیا تھا۔ لیکن وہ اس کی پکڑ میں نہیں آ رہے تھے اسے جھکائیاں دیکر کبھی بیڈ پر چڑھ جاتے تو کبھی نیچے گھس جاتے۔ یہ ورز زش

ڈورا کے گھٹنوں کے لئے سخت تھی۔ کاکل کو دیکھ کر دونوں اس سے پٹ گئے

”چلو تم دونوں“۔۔۔ ڈورا نے زینو کی بانہ پکڑی اور وہ ٹھٹھکنے لگا

”رہنے دو ڈورا یہ ابھی جانا نہیں چاہتے“ کاکل نے بیچ بچاؤ کیا۔

”میم صاحب ڈسپلین کھراب ہوتا ہے“۔۔۔ ڈورا نے قدرے

ناگواری سے کہا۔۔۔ گویا کاکل اس کے فرائض میں دخل اندازی کر رہی تھی

”میں نے کہا انہیں چھوڑ دو“۔۔۔ پہلی بار اس نے تحکمانہ کہا۔۔۔

پھر کچھ نرمی سے بولی۔۔۔ ”تم فکر نہ کرو۔ میں انہیں نہلا دوں گی۔۔۔ اور ہاں مجھے میم صاحب نہیں بی بی کہا کرو“ ڈورا نے کچھ توقف سے اسے دیکھا لیکن بچوں کو چھوڑ دیا۔۔۔ اسے برسوں سے حکم ماننے کی عادت تھی۔۔۔ کاکل نے محسوس کیا کہ ڈورا کو اس کی آمد کچھ بھائی نہیں تھی۔۔۔ اسے اس پرانی گھاگ خادمہ کو بھی رام کرنا ہو گا۔۔۔ اب وہ اپنے مسائل کے بارے میں مثبت طرح سے سوچنے لگی تھی۔۔۔ ڈورا جاہل تھی لیکن بخت خاندان کی پرانی وفادار نوکر تھی۔ بیگم اور اختر بخت کے حادثے کے بعد التمش کی غیر حاضری میں اس کے دو مہینے۔۔۔ اقتدار کے دو مہینے گزرے تھے۔ اور اب اسے واپس اپنی جگہ جانا تھا۔۔۔ وہ بڑی ڈراتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

شہزاد اور زینو غور سے ڈورا اور کاکل کی گفتگو سنتے رہے تھے۔ ڈورا کے جاتے ہی زینو نے اعلان کیا۔

”مجھے ڈورا تھوڑی تھوڑی اچھی لگتی ہے۔۔۔ تھوڑی تھوڑی بری

”مجھے بھی“۔۔۔۔۔ شہزاد نے حامی بھری۔

”وہ اچھی کیوں ہے اور بری کیوں؟“۔۔۔۔۔ کاکل نے ان کی منظوق

جانی چاہی۔

”اچھی اس لئے کہ وہ اچھی ہے“ زمینو نے بڑے سوچ بچار کے بعد کہا۔

”اور بری اس لئے کہ وہ بری ہے۔۔۔۔۔ ہے نازینو“۔۔۔۔۔ شہزاد نے

اپنی دانست میں بڑی ٹھوس بات کہی تھی اور زمینو نے سر ہلادیا۔

”چلو اب جلدی سے نہالیں پھر بریک فاسٹ کے لئے چلیں گے“۔۔۔

شہزاد اور زمینو جو ڈورا کو جھکائیاں دے رہے تھے بغیر کسی حیل و

جھٹ کے کاکل کے ساتھ غسل خانے میں چلے گئے۔ لیکن جب اس نے شہزاد

کا ماتھا چھوا تو وہ کچھ گرم سا لگا۔ اس نے طے کیا کہ آج دونوں ہی کو غسل

نہیں دیگی۔ اگر اس نے زمینو کو نہلایا تو شہزاد بھی ٹب میں اترنے کی ضد کرتا

اس نے ان کے کپڑے بدلے اور نیچے بریک فاسٹ کے لئے لے چلی۔

سیدھیوں اترتے ہوئے اپنے قوی فیصلے کے باوجود نروس ہونے لگی۔

سیدھیوں سے ہی اس نے دیکھ لیا تھا کہ التمش پہلے ہی ڈائننگ ہال میں پہنچ چکے

تھے۔ آتش دہن کی سلینگ پر ہاتھ رکھے اور وہ دوسرے ہاتھ میں سلاخ لئے

شعلوں کو کرید رہے تھے۔ ان کے خوبصورت بال پیچھے گردن پر نیلے رنگ

کے پل اوور کے پولو نیک تک پہنچ رہے تھے۔ دوسرا پاؤں انہوں نے

آشدان کی ریلنگ پر رکھا ہوا تھا۔ بہترین سلے ہوئے پتلون میں کمر سے نیچے ان کا ورزشی بدن اپنی سنگاخی کا غماز تھا۔

آہٹ پا کر وہ پلٹے۔ پل بھر کے لئے وہ ساکت رہ گئے کیونکہ یہ کاکل جو معتبری سے سیدھیاں اتر رہی تھی اس نروس کاکل سے بہت مختلف تھی جس سے اسٹیڈی میں انہوں نے اس کے اعمال کا حساب مانگا تھا۔ گھبرائی ہوئی ہرنی کی سی آنکھوں میں ٹہراؤ تھا۔۔۔ گہری نارنجی ساری میں اس کا متناسب سڈول بدن پوری طرح اجاگر تھا۔۔۔ گردن کی ایک جانب سلمنے پڑی خوبصورت بالوں کی چوٹی اور دوسری طرف رخسار کو سائے میں لیتی دبیز زلف، اسکی چال مہمنت اور انداز کا وقار التمش کو اور بھی متحیر کر گیا۔ وہ نازک کندھے جو ان کے الفاظ کی سنگباری سے جھک گئے تھے اب استوار اور مستقیم تھے۔

التمش نے خود کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ فتنہ ساماں لڑکی جو نظر نیچی کئے سچ سچ کر سیدھیاں اتر رہی تھی ہرگز ایسی معلوم نہیں ہوتی تھی جیسی وہ اس وقت نظر آ رہی تھی۔

آج خانساں نے کھانا خاص توجہ سے بنایا تھا۔ وہ التمش کے بچپن کا وفادار اور چابکدست خادم تھا جس کی اختر بخت بہت قدر کرتے تھے۔ اسے بدلتے ہوئے وقت کا بڑا دکھ تھا۔ ایک وہ زمانہ تھا جب گھر کا سارا ماحول ہنستا کھلکھلاتا تھا اور اب وہ التمش کے متفکر چہرے کو دیکھتا تو اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ حق نمک خواری کس طرح ادا کرے۔ جو کھانا ان کے سامنے رکھ

دیا جاتا وہ اسے خالی الذہنی سے کھا کر اٹھ جاتے۔ وہ شادی کیوں نہیں کر لیتے۔۔۔ وہ سوچتا جبکہ وہ خود تین بیویوں کا مالک تھا۔

شہزاد نے اپنی جگہ سے جھک کر کاکل سے کہا ”یہی تماش ہیں“ اور کاکل کی نظر التمش سے ملی۔۔۔۔ اس نے دیکھا وہ شہزاد کی راز داری پر مسکرا رہے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ اس مسکراہٹ کا مطلب ہو کہ صرف تعارف ہی نہیں، مزاج پر سی، بھی ہو چکی ہے۔

”نور مجھے تماش ہی کہا کرتی تھی“۔۔۔۔ التمش نے کہا۔۔۔۔ یہ ایک عام رسمی جملہ تھا لیکن کاکل کو لگا جیسے ان کے زہر میں قدرے کمی آگئی تھی۔ یا پھر وہ تہذیب کا دامن ہاتھ سے جانے دینا نہیں چاہتے تھے۔

ڈاکٹر نارٹن نے فیصلہ سنا دیا کہ شہزاد اور زینو کو خسرہ نکل آئی تھی۔ کاکل نے سنا تھا کہ ٹیکہ لگانے کے بعد میزلس نہیں ہوتے۔ لیکن ڈاکٹر نارٹن نے بتایا کہ ٹیکے کے باوجود بھی یہ ہو سکتا ہے ہاں بخار کی شدت اتنی نہیں ہوتی میزلس بچپن میں ہی نکل آئیں تو بہتر ہوتا ہے۔

التمش نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا کہ اب کیا ہوگا؟

بچوں کی دیکھ ریکھ کون کرے گا؟ وہ جانتے تھے کہ کاکل کو اس کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اور ڈور اتو بیکار محض ہوتی جا رہی تھی۔ وہ بس جبری بوٹیوں سے ہی خود کا علاج کرنا چاہتی تھی اسے ڈاکٹری علاج سے یکسر انکار تھا۔۔۔ نتیجہ یہ کہ ایک دو دن وہ ٹھیک رہتی اور پھر بیمار ہو جاتی۔ التمش چاہتے تھے کہ ہسپتال میں رکھ کر اس کا باقاعدہ علاج کروائیں لیکن وہ کسی طرح راضی

نہیں ہوتی تھی۔ بالآخر تھک کر انہوں نے اس کی مدد کے لئے باغ میں کام کرنے والی ایک عورت کو مقرر کر دیا۔ جب بھی دل چاہتا ڈورا کو ٹھی میں چلی آتی۔ خانساں سے جھگڑا کئے بغیر اسے چین بھی نہیں آتا۔ یہ اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا کہ ذرا ذرا سی بات پر اس سے الجھتی رہے۔ جب بھی وہ ٹھیک رہتی تو زینو اور شہزاد کی دیکھ بھال کر کے یہ ثابت کرنا چاہتی کہ اس کا دم خم اب بھی باقی تھا۔

کاکل نے الشمس کی نظروں میں پوچھے گئے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا وہ جانتی تھی کہ اس کے چند دن اب زیادہ مصروف اور راتیں بے خواب ہو جائیں گی۔ لیکن اس سے زیادہ اسے شہزاد اور زینو کی فکر تھی۔ چند ہی دنوں میں اسے پتہ چل گیا تھا کہ شہزاد سے تعلقات استوار کرنا مشکل نہیں تھا اس کی باتونی طبعیت کھلنڈر امزاج مکمل اجنبیوں کو بھی اپنا لیتے تھے۔ لیکن زینو شہزاد کے مقابلے میں زیادہ حساس تھا۔ اس کا کبھی ہنستے کھیلتے اچانک کہیں جا کر تنہا بیٹھ جانا۔ ادا اس ہو جانا کاکل کو ذہنی الجھن میں ڈال رہے تھے وہ کبھی کبھی اس سے دور جا کر ڈورا کی چادر پکڑے کھڑا ہو جاتا تب اس کی نظروں میں مکمل اجنبیت ہوتی۔ یہ لمحہ ڈورا کے لئے فح کالمحہ ہوتا اور وہ فخر سے کاکل کی طرف دیکھتی۔ کاکل ایسے بتاتی جیسے وہ ڈورا کی خوشی میں شریک تھی۔ ڈورا اس کے غیر متوقع برتاؤ سے بوکھلا جاتی اور کسی کام کے بہانے وہاں سے چل دیتی۔ دشمن کا کامیاب علاج یہ ہے کہ اسے دوست بنالو، کاکل دل ہی دل میں سوچ کر ہنس پڑتی۔ شہزاد اور زینو ایسے پر ابلم بچے بھی نہیں تھے کہ

اسے مسلسل ان کے چٹھے مغزپچی کرنی پڑتی۔ اس نے کسی رسالے میں پڑھ
تھا کہ دنیا میں نوے لاکھ جڑواں جوڑے موجود ہیں۔ Minnesota میں
سونا یونیورسٹی کی ڈاکٹر نینی سیگل نے توام بچوں پر ریسرچ کرتے ہوئے لکھا
تھا کہ چالیس فیصدی جڑواں بچے چار یا پانچ سال کی عمر تک خود اپنی ترسیلی
زبان بناتے ہیں جو کوئی دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔ کاکل نے غور کیا تو یہ بالکل سچ
تھا۔ اس نے بھی کبھی کبھی شہزاد اور زینو کو آنکھوں آنکھوں میں باتیں کرتے
دیکھا تھا۔

کاکل کا کام واقعی بڑھ گیا تھا۔ دن میں دو دو بار بچوں کے بستر بدلنے
پڑتے۔ انکے کھانے پینے میں بڑی احتیاط کی ضرورت تھی اسے بمشکل غسل
کرنے اور کپڑے بدلنے کا وقت ملتا۔ التمش بھی شاید اس کی کارکردگی آزمانا
چاہتے تھے۔ انہوں نے کبھی کسی مدد کا عندیہ ظاہر نہیں کیا۔ ایسے میں مسیح کی
مدد شامل حال نہ ہوتی تو شاید وہ اپنے امتحان میں فیل ہو جاتی۔ اس دوران
التمش بھی ڈاکٹر کے ساتھ بچوں کو دیکھنے کے لئے آتے رہے۔ وہ جب بھی آتے
تو وہاں صفائی ستھرائی اور قرینہ دیکھ کر ان کے چہرے پر ایک اطمینان سا آ جاتا
لیکن شاید انہیں احساس تھا کہ کاکل کے لئے دو بچوں کو ایک ساتھ سنبھالنا
مشکل ہو رہا ہوگا۔

”ڈاکٹر کسی نائٹ نرس کو کیوں نہ بلایا جائے“ انہوں نے ڈاکٹر
مارٹن سے کہا۔

”جب اتنی خوبصورت اور قابل نرس خود تمہارے گھر میں موجود ہے

تو کسی اور نرس کی کیا ضرورت ہے؟" بوڑھے ڈاکٹر نے محبت سے کاکل کے رخسار تھپتھپا کر کہا - "Don't Make Me Jealous - Doctor. التمش نے ازراہ مذاق کہا لیکن کاکل اپنی خجالت نہیں چھپا سکی اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف پلٹا لیا۔ لیکن کاکل کے چہرے پر چڑھتی گلجانی ہر انکی نظروں سے چھپی نہ رہ سکی۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ التمش نے احتیاط کو بیج کر مذاق کیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ التمش نے جو آہنی دیوار اس کے اور خود کے درمیان کھڑی کر دی تھی وہ اسی طرح قائم رہے۔

اس نے خانسا ماں سے کہہ دیا تھارات میں اسکے لئے ایک سینڈ وچ اور کافی وہیں نرسری میں پہنچا دے کیونکہ اسے بھوک نہیں تھی۔ دراصل وہ حتی الامکان التمش کی نظروں سے دور رہنا چاہتی تھی تاکہ اسے دیکھ کر ان کی درشتی ان کا غصہ لوٹ نہ آئے۔ فی الحال اسے وہ کوٹھی گوشہ عافیت لگتی تھی یہاں رہتے ہوئے وہ ایم اے کی تیاری کر سکتی تھی۔ اس کے بعد اس کی نوکری کے امکانات بہتر ہو سکتے تھے لیکن اب شاید وہی ایک وجہ نہیں تھی۔۔۔۔۔ وہ اتنی خود غرض بھی نہیں تھی۔ کچھ انجانے بندھن بھی تھے جن سے وہ نادانستہ بندھ گئی تھی۔ شہر اذیمینو اس سے بہت مانوس ہو گئے تھے۔ مسیح اور اس کی خاموش ہمدردی تھی۔۔۔۔۔ لیکن وہاں التمش بھی تو تھے۔۔۔۔۔ لیکن اسے التمش سے کیا لینا دینا تھا! پھر بھی ان کا نام اس کے ذہن میں بار بار کیوں آتا تھا۔ کیوں ان کی استوار اور وجیہ شکل کی ہر تفصیل اسے یاد ہو گئی تھی۔۔۔۔۔ اسے آئے ابھی بہت دن تو نہیں گزرے تھے!

”کاکل بی بی، چھوٹے سرکار کھانے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں“ خانسا^۵ماں نے دھیرے سے دروازہ کھول کر کہا۔

وہ چونکی جیسے کسی شیر نے خرگوش کو دعوت دی ہو ”میں۔۔۔۔۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔۔۔ تم میرے لئے کافی اور ایک سینڈوچ^۶ یہیں دیدو“ اس نے خانسا^۷ماں سے کہا۔

”کافی اور سینڈوچ^۸ انہوں نے وہیں رکھوایا ہے“ خانسا^۹ماں جانے لگا۔
 ”تو لے آؤ وہاں سے“ کاکل نے تنک کر کہا۔
 کاکل شش و پنج میں پڑ گئی۔

”کھانے پر تو بلارہے ہیں، کھانے کو تو نہیں بلارہے ہیں“ مسیح نے اندر آ کر کہا اسے کیا معلوم تھا کہ التمش سے پہلی ملاقات میں کاکل پر کیا بیتی تھی۔

مجھے ان سے ڈرگتا ہے ”اس نے راز کو راز ہی رکھتے ہوئے کہا ان کے قریب جاؤں تو لگتا ہے کسی آتش فشاں کے دہانے پر کھڑی ہوں“
 ”تم نے دیوی پیلے کی کہانی سنی ہے جو ہوائی کے آتش فشاں ہو الالائی کی دیوی مانی جاتی تھی“ مسیح کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا،
 ”کیا کیا تھے اس نے؟“ کاکل کی دٹپسی بڑھی۔

”ہو الالائی ہمیشہ ابلتا رہتا تھا وہاں کا بادشاہ کا مے ہاے ہاے۔۔۔۔۔“
 ”بڑا مشکل نام ہے“ کاکل بولی۔
 ”بادشاہ آسان کہاں ہوتے ہیں“

”آگے بڑھو“

”تو بادشاہ کا مے ہا مے نے دیوی پیلے کی عبادت کی اور اسے نذرانہ پیش کیا۔ دیوی نے خوش ہو کر اپنے بالوں کی ایک لٹ کاٹی اور اسے ”تائی“ کے پتے پر پیسٹ کر آتش فشاں کے اندر پھینک دیا۔ تب سے ہوالالائی نے ابلنا بند کر دیا۔

اب بالوں کی وہ لٹ کہاں سے آئے جو آتش فشاں التمش کا منہ بند کر سکے، کاکل نے بناوٹی سوچ سے کہا۔

”یہ جو ہے! مسیح نے کاکل کی لٹ ہلکے سے چھو کر جیسے خود سے کہا ”اور عبادت؟“ کاکل نے ہنس کر کہا۔

”وہ میں کر لوں گا“

”یعنی خواہ مخواہ، تم کوئی عیسیٰ ہو جو دوسروں کے لئے سولی چڑھتے رہو

کاکل کو مسیح سے بات کرنا اچھا لگ رہا تھا۔

”آئی نے میرا نام ہی ایسا رکھا ہے اس نام والے دوسروں کے لئے

سولی ہی چڑھتے ہیں“

کاکل چلی گئی اور مسیح کو بے چینی نے آگھیرا، خدا یا یہ اسے کیا ہو گیا، کاکل سے بات کرتے اس کی سنجیدگی کہاں چلی جاتی ہے، اسے کیا ضرورت تھی کاکل کے رخسار پر جھول آئی اس لٹ کو چھونے کی، کیا اس کے ہاتھ سے احتیاط کا دامن چھوٹا جا رہا تھا، لیکن کاکل اس کی اندرونی کشمکش سے یکسر بے بہرہ تھی۔

کا کل نے بہ عجلت کپڑے بدلے، اسے کسی ڈنر پارٹی میں نہیں جانا تھا لیکن دن بھر کے میلے ہوئے کپڑوں اور یکھرے بالوں سے وہ التمش کے سامنے جانا نہیں چاہتی تھی، اس پر بدذوقی اور بے ڈھنگے پن کا الزام لگ سکتا تھا صاف ستھرے پیازی رنگ کے شلوار قمیص کو پہن کر خود اسے لگا جیسے اسکی ٹکان کچھ کم ہو گئی۔ منہ پر پانی کے چھپاکے دئے اور اوپری اوپر سے بالوں میں کنگھی پھیری اور نیچے چلی گئی۔۔۔۔۔ وہ اوپری سیر دھیوں پر ٹھٹک گئی تاکہ اپنی تیز چلتی سانس کو قابو میں کر لے، نیچے لان میں التمش ایک گدی لے صوفے پر اس کی آمد سے بے خبر کوئی کتاب لئے بیٹھے تھے۔ برابر رکھے لیمپ کی روشنی نے انہیں محیط کر رکھا تھا، اور وہی کمرے میں ایک مدھم روشنی پھیلا رہا تھا پھر ڈاننگ ہال سے پھیلتی روشنی نے کمرے کو مکمل اندھیرے سے بچار کھا تھا وہ اس وقت گہرے نیلے رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھے جو ناکافی روشنی میں تقریباً کالا نظر آ رہا تھا گردن سے متصل سفید کالر اور اسپرٹائی کی گرفت بے نقص تھی ان کا رنگ جو مسلسل دھوپ میں رہنے کی وجہ سے تانبے کی طرح سنولا گیا تھا اب اپنی اصلیت پر آ رہا تھا بالوں کا کہیں کہیں جھلکتا سنہرا رنگ البتہ اب بھی وہ وہی تھا، دور تک پہنچتی مانگوں کے سرے پر جوتے ہلکی سی جنبش پر بھی چمک جاتے تھے۔

انہوں نے دوبارہ گھڑی دیکھ لی تھی اور اب آہٹ پر نظر اٹھائی تو کا کل کو سیر دھیوں سے اترتا پایا۔

”صاف کیجئے گا کچھ دیر ہو گئی“ کاکل نے معذرت کی۔

”شاید لیڈنز سے وقت کی پابندی کی توقع بھی نہیں کی جاتی“ انہوں نے ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا اور کتاب بند کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ کاکل ان کی چال کی محنت اور وقار کو دیکھتی رہی، گردن کا وہ ہلکا سا مغرور تناؤ ان کی شخصیت پر بجاتھا، کوٹ کی آستین سے جھانکتے سفید قمیص کے کف اور ان میں آگے مد آف پرل کے بہت ہی خوبصورت کف لنک نظر آ رہے تھے، کاکل نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اسکا مشاہدہ اتنا مکمل اور سرعت کے ساتھ ہو سکتا تھا چلتے چلتے وہ ایک دم پلٹے اور کاکل سے آنکھیں چار ہوئیں جس سرعت سے وہ پلٹے تھے اس تیزی سے کاکل اپنی نظریں ہٹا نہ سکیں ایک موہوم سی مسکراہٹ التمش کے لبوں پر آئی اور انہوں نے ایک مہذب میزبان کی طرح جھک کر کہا

”لیڈنز فرسٹ“

جب کاکل اپنی سیٹ پر پہنچی تو انہوں نے کرسی کھینچی اور اسکے بیٹھنے کے بعد خود اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔

”بچوں کی تیمارداری کا یہ مطلب نہیں کہ آپ خود فاقوں پر اتر آئیں“ انہوں نے چکن کا ایک بڑا ٹکڑا اسکی پلیٹ میں ڈالا اور پھر خود اپنی پلیٹ میں بھی۔ کاکل نے دیکھا اسکی آرڈر کی ہوئی کافی اور سینڈوچ بھی ایک کنارے رکھ دی گئی تھی، پہلا موقع تھا جب التمش نے اسکے لئے اپنی ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔

”میں۔۔۔ میں اتنا کچھ نہیں کھا سکو گئی“ کاکل نے کہا۔

”میں نے کب کہا کہ آپ سارا ذخیرہ ختم کر دیں“ انہوں نے گرم گرم اسٹیو کا ایک چم اسکی پلیٹ میں انڈیل کر کہا ”مجھے خود حیرت ہے کہ لڑکیاں دانہ دونہ چک کر کے اپنی صحت بنائے رکھتی ہیں“ انہوں نے ایک نگاہ غلط انداز کا کل کے سراپا پر ڈالی اور پھر وہ آگے بڑھے۔

”میں نہیں چاہتا کہ کمزوری کی وجہ سے دوبارہ آپ کے بے ہوش ہونے کی نوبت آجائے“ انہوں نے اسطرح کہا جیسے بے ہوش ہو جانا اسکی عادت ہو۔

”وہ۔۔۔۔۔ وہ تو میں ڈر گئی تھی“ لسنے ہاتھ روک کر کہا اور خود ہی اپنی بے وقوفی پر پکھٹائی کیونکہ التمش جیسے اپنی ہنسی روکنے کی کوشش کر رہے تھے وہ اسوقت کی اپنی ذہنی کیفیت انہیں کیسے سمجھاتی۔

”ضرور ایسا ہی ہوا ہوگا“ انہوں نے ابرو چرمھا کر کہا ”میں نے بھی جب ڈورا کو پہلی بار دیکھا تھا تو سہم گئی تھیں“

”وہ میری بے وقوفی تھی، شاید اسی لئے آپ ہنس رہے ہیں“ کاکل نے اپنے دفاع میں کہا۔

”نہیں تو، مجھے تو یہ سوچ کر ہنسی آرہی تھی کہ ڈورا کو اگر اس حقیقت کا پتہ چل جائے تو کیا ہوگا“

اور وہ دونوں ہنس پڑے۔

التمش کے اس دوستانہ برتاؤ نے کاکل کا ذہنی تناؤ کچھ کم کر دیا تھا اس نے طے کیا تھا کہ مختصر ترین وقت میں بس تھوڑا سا زہر مار کر یگی اور بھاگ

کھڑی ہوگی لیکن اب جب بسنے اپنی پلیٹ کی طرف دیکھا تو دنگ رہ گئی، جو کچھ التمش اسکی پلیٹ میں رکھتے جاتے تھے وہ سب کچھ اس نے کھایا تھا، اسکی نظر ان کی پلیٹ پر گئی انہوں نے چکن کا وہ ٹکڑا جو اپنی پلیٹ میں رکھا تھا وہ جوں کا توں رکھا تھا انہوں نے ایک لقمہ بھی نہیں اٹھایا تھا۔

”آپ نے خود کچھ نہیں کھایا“ کا کل نے حیرانی سے پوچھا۔

”میں دو بار ڈنر نہیں کھایا کرتا“ وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولے۔

یہ واقعہ تھا وہ ڈنر کے لئے کہیں مدعو تھے، واپس آکر انہیں پتہ چلا کہ کا کل نے لُنج بھی نہیں لیا اور ڈنر میں بھی بسنے کافی اور سینڈوچ مانگا تھا، کچھ دیر وہ اس عجیب و غریب لڑکی کے بارے میں سوچتے رہے جبے چند ہی دنوں ہوئے انہوں نے لائبریری سے نکال باہر کیا تھا ان کا غصہ بجا تھا انسان کے لئے شکست برداشت کرنا ایسا مشکل نہیں ہوتا جتنا یہ احساس کہ اسے بے وقوف بنایا گیا۔ خاص کر التمش کی طرح کے انسان کے لئے یہ احساس سوہان روح تھا کہ اتنی سی چھو کری اور بیوقوفوں کی سرفہرست ان کا نام لکھوا گئی، تب سے ان کا ذہن قلابازیاں کھا رہا تھا، پہلی نظر میں وہ کا کل کو دیکھ کر دنگ ہو گئے تھے وہ لڑکی انہیں ایسی لگی تھی کہ دامن نچوڑ دے تو فرشتے وضو کریں وہ اتنی جنت، اتنی دیدہ دلیر کیسے ہو سکتی تھی لیکن پھولوں ہی کے بیج تو ڈسنے والے رہتے ہیں! وہ بظاہر معصوم ٹھہرانے والی لڑکی صاف ان کا استحصال کر گئی تھی۔

اس سارے تماشے کے پوچھے کیا راز تھا وہ جاننا چاہتے تھے۔

انہوں نے گھنٹی بجا کر کافی کا حکم دیا اور خود آتش دان کے قریب پڑی راکینگ چیر پر بیٹھ گئے کاکل کو وہ پہلے ہی اپنے مقابل آرا مدہ صوفے پر بیٹھا چلے گئے۔

”اب بتائیے“ انہوں نے سگریٹ جلا کر آرا مدہ نشست لیتے ہوئے کہا کاکل سمجھی نہیں۔

”کیا جاننا چاہتے ہیں آپ؟“ اس نے ٹھٹک کر اپنے اطراف حصار باندھا۔

”کاکل جہاں، آپ اچھی طرح جانتی ہیں میرا اشارہ کس طرف ہے“ التمش کی تیوری چرہ گئی تھی، کاکل حیرت میں پڑ گئی تھی کہ ان کا موڈ پل بھر میں کیسے بدل گیا، ابھی ابھی انہوں نے اپنی سبک انگلیوں سے اسکے تنے ہوئے اعصاب پر مرہم رکھا تھا۔

”میرا نام کاکل جہاں نہیں بلکہ کاکل ہے“ کاکل کچھ جربز ہو کر بولی۔
”مجھے آپ کا ہی نام بتایا گیا تھا، اور میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہاں پہنچنے کے لئے آپ کو جھوٹ کا سہارا کیوں لینا پڑا“ انہوں نے اطمینان سے سگریٹ کا کش لگا کر کہا۔

حور بانو نے اسے اتنے نازک مقام پر لا کر کھڑا کر دیا تھا کہ وہ اپنی بے گناہی کا ثبوت تک پیش نہیں کر سکتی تھی اسکی زندگی ایک کھلی کتاب تھی یہ پہلا موقع تھا کہ اسے اپنی معصومیت اور نا کردہ گناہی کی وکالت کرنی پڑ رہی تھی وہ نہیں چاہتی تھی کہ اسکی پچھلی زندگی معرض بحث میں آئے

لیکن التمش کا انداز بناتا تھا کہ اسکے حالات جاننا ان کے لئے ضروری تھا۔ اور وہ جان کر ہی رہینگے اور جب تک وہ انہیں سچائی سے واقف نہیں کروادیتی اسکا وہاں سے چھٹکارا ناممکن تھا لیکن کیا بتاتی اپنے بارے میں اسکا تو یہ حال تھا کہ۔

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہے ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

وہ التمش کے سامنے اس بات کا اقرار بھی نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہ مجبور تھی۔ خود اسکے باپ اسے اپنے رستے کا روڑا سمجھ رہے تھے کیونکہ وہ واقعی اتنی مجبور نہیں تھی حفیظ سے شادی کرنے سے انکار کر کے بسنے بہت بڑے حوصلے کا ثبوت دیا تھا۔ بسنے اپنی ساری قوتیں یکجا کر کے زندگی میں آگے بڑھنے کا ہتھیہ کر لیا تھا اس نے کمر ہمت کس لی اسکا مضمون تاریخ تھا، بسنے کاغذات سے اپنے کچھ مضامین چھانٹ نکالے جو بسنے کالج کے سمپوزیم میں پڑھے تھے جنگی چیرمین نے بڑے حوصلے افزا لفظوں میں تعریف کی تھی، وہ انہیں لئے ایک اخبار کے دفتر پہنچی، ایڈیٹر نے ایک سرسری نظر اسپر ڈالی اور اس سے وعدہ کیا کہ آنے والے شمارے میں انہیں ضرور جگہ دیگا لیکن یہ کوئی قوی

وعدہ نہیں تھا اور اسکے پاس استنا وقت بھی نہیں تھا اور تبھی حور بانو نے اوٹی میں نوکری کا ذکر کیا وہ ان حالات اور اس ماحول سے دور چلی جانا چاہتی تھی اور اس نوکری سے بہتر کوئی حل اسکے مسائل کا نہیں ہو سکتا تھا اسی لئے وہ اوٹی چلی آئی تھی۔

لسنے التمش کو بتایا کہ اسے نوکری کی ضرورت تھی لیکن اپنے والد کا ذکر صاف اڑا گئی

”آپ چچی جان کو کیسے جانتی ہیں؟“ التمش غور سے سن رہے تھے حور بانو کے ذکر پر انہوں نے اسے روکا، کچھ دیر کے لئے کاکل چپ ہو گئی

”میرے لئے یہ جاننا ضروری ہے“ اور واقعی یہ ضروری بھی تھا ورنہ کاکل کبھی اس الزام سے بری نہیں ہو سکتی تھی جو اسکے سر منڈھا جا رہا تھا لیکن وہ کیا جانتی تھی حور بانو کو اور کتنا؟ بس ایک بار کسی کو دیکھنا جانتا تو نہیں ہوتا!

”دیکھئے آپ خواہ مخواہ بات کو طول دے رہی ہیں“ وہ کاکل کی منطق سمجھ نہیں پارے تھے، ”آپ کہتی ہیں آپ کسی حور بانو کو نہیں جانتیں اور ابھی یہ بھی بتایا آپ نے کہ آپ کو اوٹی بھجوانے کی ذمہ دار وہی ہیں“

”وہ میرے ابا سے شادی کر رہی ہیں“ اسے کہنا پڑا اور التمش ایش رے میں سگریٹ مروڑ کر سیدھے ہو بیٹھے۔

”والد“ انہوں نے کہا اور کاکل کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کدھر دیکھے، التمش نے اپنی مائی ڈھیلی کی اور سر کو چپھے پھینک کر قہقہہ لگایا، کاکل نے

نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا ہنستے ہوئے ان کی شخصیت بالکل بدل جاتی تھی ان کے دانت ہموار اور موتی کی طرح چمکدار تھے اور آنکھیں چندھیا گئی تھیں، کاکل سے ان کی ملاقات ہوئے مختصر وقت گزرا تھا، اور اس طرح انہیں ہنستے لسنے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، اس طرح کھل کر ہنسنے کی وجہ حور بانو کا وہ جملہ تھا جب انہوں نے التمش سے کاکل کی مفروضہ مجبوریاں بتائیں تو قدرتی طور پر التمش نے کاکل کے والد کے بارے میں پوچھا تھا تب حور بانو نے بڑی سادگی سے بتایا تھا۔

”نکھٹو ہیں لیکن شاعر اچھے ہیں۔“

التمش نے کاکل سے اس کے والد کی یہ تعریف بتانی ضروری نہیں سمجھی البتہ کاکل نے اگر یہی بات انہیں لائبریری میں بتادی ہوتی تو یہ معاملہ اتنا طول نہ پکڑتا لیکن التمش نے اسے موقع ہی کب دیا تھا۔

اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟ کاکل نے اب بھی اپنے والد کا وقار قائم رکھنا چاہا ”کئی لوگ دوسری شادیاں کرتے ہیں“

”میں کب کہہ رہا ہوں کہ انہیں دوسری شادی نہیں کرنی چاہئے تھی التمش سنجیدہ ہو کر بولے ”میں تو یہ ثابت کر رہا تھا کہ دنیا میں انسان ہی ایک ایسا جانور ہے جو ہنس سکتا ہے“

ان دونوں کی نظریں ملیں اور دونوں ہنس پڑے۔

ڈورانے کو اپنا قبیلہ چھوڑ کر عیسائی مذہب اپنایا تھا لیکن اس نے اپنے رسم و راج نہیں چھوڑے تھے۔ اس نے اب بھی ٹوڈاؤں کا مشغلہ

خوبصورت ٹوکریاں بنانا جاری رکھا تھا۔ بسنے اپنی بنائی ایک ٹوکری کا کل کو
تحفظ دے تھی۔

جب مسیح اور کاگل ساتھ ہوتے تو وہ شہزاد اور زمینوں کو لیکر کسی
بہانے وہاں سے مل جاتی تاکہ جو چنگاری مسیح کے دل میں جاگی تھی وہ بڑھکر
شعلہ بن جائے۔ یہی ایک راستہ تھا مسیح کو پادری بننے سے روکنے کا۔ کاگل تو
مسیح کو پسند کرتی ہی تھی۔ اسکی کم گوئی۔ اسکے چہرے پر اچانک نمودار ہوتی
مسکراہٹ اور بات چیت کا دلچسپ انداز۔ مسیح میں وہ سارے ہی گن تھے جو
ایک قابل بھروسہ دوست میں ہو سکتے تھے۔ وہ اسے چھیڑ بھی لیتی تھی۔ کبھی
اسکی تنقید بھی کر دیتی جسکا وہ کبھی برا نہیں مانتا۔ انکی یہ بے تکلفی ڈورا کے
پلان کے لئے بڑی اُمید افزا تھی۔

جب بھی ٹوڈا بستی میں کوئی غیر معمولی بات ہوتی تو ڈورا کو اسکی فوراً
اطلاع مل جاتی۔ عام طور پر سوما ہی قاصد بن کر آتا۔ عیسائی بن کر قبیلہ
چھوڑنے پر بھی قبیلہ ڈورا کی بزرگی کا معترف تھا۔ وہ جب بھی وہاں جاتی تو
نوجوان لڑکے اور لڑکیاں زمین بوس ہو کر اسے تعظیم دیتے۔ رواج کے
مطابق ڈورا پہلے اپنا دایاں اور پھر بایاں پاؤں انکے سروں سے چھوا کر انہیں
دعا دیتی۔

اس روز بھی جب سوما کے بلانے پر وہ وہاں پہنچی تو اسکا اسی طرح
استقبال ہوا۔ ڈورا کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ٹوڈا قبیلے میں لڑکیوں کی تعداد
بھی بڑھ رہی تھی ورنہ عورتوں کا تناسب مردوں کے مقابلے میں بہت کم ہوتا

جار ہا تھا جو سارے قبیلے کے لئے فکر کا باعث تھا۔

۱۹۶۰ء تک بھی ٹوڈاؤں میں طفل کشی عام تھی۔ لڑکی پیدا ہونے پر اسکا گلا گھونٹ کر مار دیا جاتا۔ یہ کام کسی ایک ضعیف عورت کے تفویض ہوتا جو بچی کا گلا گھونٹ کر اسے دفن کر دیتی۔ یہ بربریت اس قبیلے میں عجیب تھی جس کے پاس کسی طرح کے ہتھیاروں کا وجود ہی نہیں تھا۔ جنکا قتل و خون و غارتگری سے کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔

آج ڈورا کو اس لئے بلایا گیا تھا کہ بھینس نے ایک عورت کے پیٹ میں سینگ مار کر اسے ہلاک کر دیا تھا۔

خوشی اور غم دونوں ہی موقعوں پر بھینس کی قربانی دی جاتی ڈورا کو پہنچنے میں کچھ دیر ہو گئی۔ قربانی دی جا چکی تھی پھر بھی قبیلے کے لوگ جمع ہو رہے تھے۔ نیلی گھائیوں کے پیچھے غروب ہوتے سورج کی قرمزی شعائیں عجیب سا منظر پیدا کر رہی تھیں۔ اسی میں ٹوڈاؤں کے صاف ستھرے لباس مدغم ہونے لگے تھے۔ قدیم مقدس گھنٹیاں جنہیں ٹوڈا، اکنکودر اور منی در، کہتے ہیں بھینسوں کے گلوں میں بندھی وقفہ وقفہ سے بج اٹھتی تھیں۔

بندگی اور عبادت انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ جتنی جینیں ہیں ان سے زیادہ خدا تراش لئے جاتے ہیں، جیسے ایک خدا کے لئے اس ساری کائنات کا کام بہت زیادہ ہو

گھنٹیوں کی آواز میں ملے جلے مدھم سروں میں سازوں پر موت کا مخصوص سر، شام میں رات کے گھلتے گھلتے مرنے والی کی بالوں کی لٹ، اسکے

گہنے نیز اسکے استعمال کی ساری چیزیں اکٹھی رکھی گئی تھیں۔ انہیں اس عورت کی ادھ جلی کھوہڑی کے ساتھ اسکے جھوپڑے میں رکھا جانا تھا جہاں ہمیشہ ایک ٹمٹما تادیا جلتا ہے۔

سمادھی کے شعلوں کے ساتھ قبیلے کی داویلا شروع ہوئی۔ رشتے داروں نے مرنے والی کی روح کو مخاطب کر کے پوچھا "اے آتما کہیں تو بیمار تو نہیں ہے۔ تیری بھینسیں تو خیریت سے ہیں؟۔ کیوں تو ہمیں چھوڑ کر چلی گئی؟" پھر سب ایک راگ ہو کر سر میں سر ملانے رو پڑے۔

رات ہو چکی تھی سوما اور دوسروں نے ڈور پر زور بھی دیا کہ رات کی رات رک جائے لیکن وہ نہ مانی۔ اور اندھیرے میں ہی کوٹھی واپس چلی آئی۔ کیونکہ وہ پہاڑی راستہ اسکے لئے اجنبی نہیں تھا۔

شہزاد اور زمینو کا خسرے کا دور ختم ہوا تو کاکل نے بھی چین کی سانس لی۔ لیکن ان چند دنوں میں وہ کاکل کے اور قریب آگئے تھے۔ ایسے میں میسج سے اسے بہت مدد حاصل ہوئی وہ کبھی کبھی خود بچوں کے پاس جاگ کر اسے آرام کرنے پر مجبور کر دیتا۔ کوٹھی کے دن رات معمول پر آگئے تھے۔ التمش کی مصروفیات بڑھ گئی تھیں۔ میسج اور ہنمنت راو کی مدد سے اب وہ اسٹیٹ کے کاموں پر حاوی ہو گئے تھے۔ انکی اپنی سوشل مصروفیات بھی تھیں۔ شاذ و نادر ہی کاکل کی ملاقات ان سے ہوتی۔ کیونکہ جب وہ اور بچے صبح ناشتہ کرتے تو التمش تب تک گھوڑ سواری یا ٹینس کھیل کر واپس نہیں ہوتے۔

اہوں نے کبھی اسکے معمول میں دخل اندازی نہیں کی۔ فرصت کے جو لمحے ملتے کاکل مطالعے میں گذارتی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ ہسٹری میں ایم۔ اے کا امتحان خانگی طور پر دیگی۔ وہ فی الحال یہ سوچتا بھی نہیں چاہتی تھی کہ کوٹھی میں اور کتنے شب و روز اسکی قسمت کی باقی ہیں۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ پلٹتے پنوں میں لٹھ کر نہیں رہ جائیگی بلکہ ہر اس روز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مقابلہ کریگی جو اسکے مقابل کھڑا ہوگا۔

راکنگ چیر میں ہولے ہولے جھولتی وہ کتاب میں مصروف تھی کہ شہزاد اوپر چڑھ آیا۔

”کہانی!“۔۔۔ اس کی گود میں بیٹھے بیٹھے، اس کی موٹی ریشمی چوٹی سے کھیلنے ہوئے شہزاد نے کہا۔۔۔ بہت جلد زمینوں نے آکر کاکل کی دوسری جانب اپنی جگہ بنالی۔ یہ ان دونوں کی مقررہ جگہ تھی جہاں وہ رشوت کی طرح کاکل سے کہانیاں وصول کرتے تھے۔ کاکل نے کتاب بند کر کے رکھ دی اور سوچنے لگی کہ انہیں کونسی کہانی سنائے۔ کہانیوں کا اسٹاک بڑی تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔ اسے اچانک ایک پرانی انگریزی نظم یاد آئی۔ یہ نظم دو توام بچوں کے بارے میں تھی۔ اور شہزاد اور زمینوں انگریزی بہت اچھی طرح سمجھ لیتے تھے اس نے دونوں کو گود میں لئے جھولتے ہوئے نظم شروع کی۔

My dear do you know
How a long time ago
Two poor little children
Whose names I don't know
Were stolen away
On a fine summer day
And left in the wood
As I have heard people say.

Among the trees high
Beneath the blue sky
They plucked the bright flowers
And watched the birds fly
Then on the black berries fed
And straw - berries red
And when they were weary
" We'll go home". They said.

But then it was night
And sad was their plight
The Sun it went down
And the moon gave no light
They sobbed and they sighed.

And they bitterly cried.
And long before morning
They lay down and died.

And when they were dead
The Robin so red
Brought strawberry leaves
And over them spread.

And all the way long
The green branches among
They would prettily whistle
And thus was their song.

"Poor babies in the wood
Sweet babies in the wood
On the sad fate of
The babes in the wood."

پھر نظم ختم ہو گئی۔ کاکل کے گلے میں خداداد سوز تھا۔ اس نظم کو وہ جب بھی دہراتی ان دو معصوم گنہگار بچوں کیلئے اس کی آنکھیں بھر آتیں جنہیں گرمیوں کی ایک دوپہر کوئی ظالم اٹھالے گیا۔ اور گھنے جنگل میں چھوڑ کر چلتا بنا۔ وہ معصوم انجان، ناکردہ گناہ۔۔۔۔۔ اپنے ساتھ ہونے والی

واردات سے یکسر بے نیاز۔۔۔ قدرت کے تحفوں میں الجھے رہے۔ کبھی پھولوں سے دل بہلاتے تو کبھی بیری اور اسٹرابیری سے پیٹ بھرتے۔ انہیں گزرتے وقت کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔ اچانک شام ہوئی۔۔۔ شامِ غریباں!۔۔۔۔ شامِ سو سو سے اپنے جلو میں لاتی ہے اور وہ بھی جنگل کی شام! دونوں نے سادگی سے سوچا اب انہیں گھر لوٹنا چاہیے لیکن وہاں کوئی راستہ نہیں تھا۔۔۔۔ سارے راستے مسدود۔۔۔۔ اندھیروں کی نذر ہو چکے تھے۔ چاند نے بھی اپنا منہ پھیر لیا تھا۔ ان کی حسرت اور خوف کا کوئی گواہ نہیں تھا۔ وہ روتے رہے۔ ہلکتے رہے ایک دوسرے سے لپٹ کر سسکتے رہے۔ حتیٰ کہ موت نے انہیں گلے لگالیا۔ اگلے دن جب چڑیوں کی چہکار ہوئی تو سرخ گلو رابن نے ان ٹھٹھڑے ہوئے بے جان جسموں کو اسٹرابیری کے پتوں سے کفن پوش کیا اور ان کے غم میں نوچے گئے۔

کاکل نظم گاتے ہوئے بھول ہی گئی تھی کہ شہزاد اور زینو کو جھولتی کرسی کے ہلکوروں نے سلا دیا تھا۔ لیکن اسکا خیال غلط تھا کیونکہ مسلسل سبکیوں نے جب اسے چوٹا دیا تو پتہ چلا دونوں چپکے چپکے رو رہے تھے۔

”شہزادا۔۔۔ زینو“ اس نے انہیں ہلکے سے جھنجھوڑا۔ اور جواب میں دونوں اس کی گردن میں باہیں ڈال کر چپک گئے۔

”جنگل میں نشیں جانا ہے۔۔۔ شہزاد نے سبکیوں کے بیچ کہا۔

”میں بھی نشیں جاؤں گا۔ پلیز کاکل!“۔۔۔ زینو نے اسے اور بھی زیادہ کستے ہوئے کہا اور کاکل کو اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا۔ اسے یہ نظم

ہرگز دونوں کو نہیں سنانی چاہیے تھی۔ وہ کہانی جو خود اس کی پلکیں تر کر دیتی تھی۔ شہزاد اور زینو پر چسپاں ہو کر رہ گئی تھی۔ اس نے دونوں کو چٹایا۔ اپنے دوپے سے ان کے آنسو پونچھے اور اسی طرح انہیں کلبجے سے لگائے لگائے کہا

”نہیں یہاں کوئی تمہیں پکڑنے کے لئے نہیں آئیگا“

”تامش ماریں گے اسے؟“ کتنا یقین تھا انہیں تامش کی ذات پر

”خوب ماریں گے۔۔۔ تامش۔۔۔۔۔ اسے“۔۔ کاکل نے کچھ ٹوک کر

جملہ پورا کیٹا تامش! خود اس کے کانوں کو یہ نام انوکھا لگا۔ تامش۔۔ اس

نے زیر لب دہرایا۔۔۔ اس باریہ محض ایک نام نہیں تھا۔ بلکہ پوری

چھاجانے والی شخصیت تھی۔

”کے ماریں گے بھی ہم؟“۔۔۔ التمش اندر آتے ہوئے بولے۔ وہ

بہت دیر پہلے وہاں پہنچ چکے تھے۔ لیکن کاکل کی محویت دیکھ کر، دروازے کے

باہر، بڑھتے ہوئے دھندلے میں ٹھٹک گئے تھے۔ دل کو چھو لینے والے اس

منظر کا ایک لمحہ بھی ان کی نظر سے ضائع نہیں ہوا تھا۔ نہ کاکل کی آنکھوں میں

تیرتے آنسو، نہ اس کی آگے کو جھولتی چوٹی نہ اس کے رخسار پر کھیلی لٹ جے

اپنی محویت میں اس نے ایک بار بھی کان کے پیچھے نہیں کیا۔ دل کی گہرائیوں

کو چھو لینے والی وہ نظم انہوں نے بھی بچپن میں پڑھی تھی اور آبدیدہ ہو گئے تھے

کاکل کو ان دونوں بچوں کو خود سے لپٹائے دلا سہ دیتے دیکھ کر وہ ممتا کے

اس لافانی جذبے کے قائل ہو گئے۔ جو دنیا میں ہر جذبے سے افضل اور پاکیزہ

ہے۔ کاکل کی شخصیت کا وہ روپ انہیں حیران کر گیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں

گھنی پٹکوں سے ٹوٹا ہوا ایک آنسو اب بھی اس کے رخسار پر لرز رہا تھا۔ اس نے اس آنسو کو پونٹھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی کیونکہ اس کے دونوں ہاتھ شہزاد اور زینو کو پٹٹائے ہوئے تھے۔ التمش کا دل چاہا کہ اپنے رومان میں وہ آنسو محفوظ کر لیں لیکن انہوں نے خود کو روک لیا۔ وہ موتی تو ابھی ابھی صدف سے نکلا تھا۔ اسے یوں بٹور لینا مناسب نہیں تھا۔

شائد کاکل کو بھی پتہ نہیں چلتا کہ التمش کب سے اسے ٹکٹی لگائے دیکھ رہے تھے اگر زینو نے سراٹھا کر "تامش!" نہ کہا ہوتا۔ کاکل نے آنکھیں کھول دیں اور حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔ اگر پل بھر پہلے اس نے دیکھا ہوتا تو ان کی آنکھوں کی وہ پراسرار گہرائی دیکھ پاتی جس پر دفعتاً التمش نے پردہ ڈال دیا تھا۔

وہاں التمش کی آمد غیر متوقع تھی۔ انہیں کبھی ضرورت ہوتی تو خود کاکل کو بلا بھیجتے تھے۔

"آپ نے کبھی کھیڈا آپریشن دیکھا ہے؟" التمش وہیں تپائی پر ٹکتے ہوئے بولے۔۔۔ ان کے ہاتھ میں ایک خط تھا۔

"نہیں،۔۔۔ کاکل نے محض سر کی جنبش سے کہا۔۔۔ اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا کہ جنگلی ہاتھیوں کو کس طرح پکڑا جاتا ہے۔

اس نے کرسی سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن کرسی جھول گئی اور دونوں بچے اور زیادہ چمٹ گئے۔

التمش نے اسے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔

”یہ خط اسی کے بارے میں ہے۔“ التمش نے خط ہرایا۔ ”اگر آپ کو دلچسپی ہو تو ہم چل سکتے ہیں۔“

انہیں یہ خیال بھی ابھی آیا تھا اور نہ خط کو آئے چار دن ہو چکے تھے۔ عدیم الفرستی کی وجہ سے انہوں نے اس پر توجہ نہیں دی تھی۔۔۔ لیکن التمش کسی آئینہ بند کمرے میں نہیں رہتے تھے۔ جہاں تاحد نظر بس وہی وہ نظر آتے رہیں نہ صرف اسٹیٹ ان کی ذمہ داری تھی بلکہ کوٹھی میں بسنے والوں اور ان کے مسائل کا بھی انہیں خیال رکھنا پڑتا تھا۔ جب سے کاکل اوٹی آئی تھی اس نے گھر سے باہر قدم نہیں نکالا تھا۔ خاص کر پچھلے دنوں جب بچے بیمار تھے اس نے نیند چہن خود پر حرام کر لیا تھا۔ التمش بظاہر اپنے کام اور ریسرچ کے سلسلہ میں مصروف رہتے لیکن حیرت انگیز طور پر کوٹھی اور اسٹیٹ میں جو کچھ ہوتا تھا اس سے مکمل طور پر واقف رہتے تھے۔ جس روز انہوں نے کاکل کو خود اپنے سلمنے بٹھا کر کھانا کھلایا اور اس سے بات چیت کی تھی ان کا معاندانہ برتاؤ ختم ہو گیا تھا۔ لیکن اس کے بعد ہی ہونے والے ایک چھوٹے واقعے نے اس کے بارے میں ان کے شبہات بڑھا دیئے تھے۔

ایک روز رات میں اسٹیڈی میں کام کرتے ہوئے وہ بچوں کو دیکھنے کے لئے گئے۔ شہزاد اور زینو بخار کی زیادتی کی وجہ سے بے چین تھے اور ابھی ابھی ان کی آنکھ لگی تھی۔ نرسری میں مکمل خاموشی تھی۔ ادھ کھلے دروازے سے انہوں نے دیکھا۔۔۔ کاکل اپنے ڈریسنگ گاؤن میں بیٹھی شہزاد یا زینو کی قسمیں میں بٹن مانک رہی تھی۔ اس کی گستاخ لٹ ہمیشہ کی طرح اس کے

رخسار پر جھول آئی تھی۔ اس کے تروتازہ رخسار تکان کی وجہ سے ماند لگ رہے تھے لیکن اس حالت میں بھی اسکا حسن خود اپنا جواب تھا۔ لیکن التمش کی توجہ جس بات نے زیادہ اپنی طرف مبذول کی وہ وہاں مسیح کی موجودگی تھی ویسے وہ جانتے تھے کہ مسیح وقتاً فوقتاً کاکل کی مدد کرتا تھا۔۔۔ لیکن اب انہوں نے دیکھا کہ مسیح وہاں صرف موجود ہی نہیں تھا بلکہ ایک مخصوص زوایے سے ٹکٹی باندھے اس کی نظر کاکل کے چہرے کا طواف کر رہی تھی۔۔۔ زبان حال سے وہ نظر کہہ رہی تھی۔ دوستو! ہم بھی اسی زلف کے بیمار ہوئے۔ التمش کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی اور بجائے اندر جانے کے وہ واپس چلے گئے۔۔۔ کیا مسیح کا کلیسائی دل اس کاکل بچاں میں پھنس کر رہ گیا تھا؟۔۔۔ انہوں نے ایسے سوچا جیسے اس بات کا ان سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔

”ویسے یہ بالکل آپ کی مرضی پر منحصر ہے“۔۔۔ کھیڑا کی دعوت دیکر گویا التمش دور جا کھڑے ہوئے۔

کاکل نے ان کے لا تعلق انداز کو دیکھا اور سوچا کہ انکار کر دے کیونکہ یہ دعوت رسمی بھی ہو سکتی تھی۔ اس توقع سے کہ کاکل ضرور انکار کریگی۔ لیکن وہ بھی زندگی کی یکسانیت سے تنگ آگئی تھی۔

”میں ضرور چلوں گی“۔۔۔ اس نے اعلان کیا ”شہزاد اور زینو کے لئے بھی اچھی دلچسپی ہو جائے گی۔۔۔ وہاں جنگل میں کوئی گیٹ ہاؤس تو ہوگا جہاں ہم ٹہر سکیں؟“

”نئیں جنگل نئیں جانا ہے“۔۔۔ زینو دہل کر بولا۔

”میں بھی نہیں جاؤں گا جنگل“۔۔۔۔۔ شہزاد اس کا ماؤتھ پیس تھا۔
کہانی کا اثر اب تک ان دونوں پر باقی تھا۔

التمش نے نفی میں سر ہلایا ”گیسٹ ہاؤس تو وہاں ہے لیکن کھیڈا دیکھنے
کے لئے جانے والی پارٹی میں بچے نہیں ہونگے“

”تو پھر میں نہیں جا پاؤں گی“۔۔۔۔۔ کاکل نے اپنی مجبوری بتائی
”شہزاد اور زینو بیماری کی وجہ سے کچھ زیادہ چڑچڑے ہو رہے ہیں۔“

”تو کیا مسیح اکیلے ان کے لئے کافی نہیں ہونگے؟“ التمش کے لہجے میں جو
طنز تھا وہ کاکل نے محسوس نہیں کیا۔ ”ویسے آپ کی مرضی“۔ انہوں نے اپنے
مخصوص انداز میں شانے چر مھائے اور جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ”یا پھر
۔۔۔“ انہوں نے جاتے ہوئے رک کر جملہ پورا کیا ”میرے ساتھ جانے میں
کوئی اعتراض ہے؟“

”نہیں نہیں، میں چلوں گی اگر مسیح اس مدد کے لئے تیار ہو جائیں۔“
ان کا اکھڑا ہوا انداز دیکھ کر کاکل نے جلدی سے کہا۔

”میں مسیح سے کہہ دوں گا“۔۔۔ التمش نے کہا۔۔۔ اگر انہیں کاکل کی
رضا مندی سے خوشی ہوئی تھی تو اس کا کہیں اظہار نہیں تھا۔

کسی کی معصومیت اور مجبوری سے فائدہ اٹھانا صدیوں سے انسان کا
مشغلہ رہا ہے۔ سانپ کے کاٹے کے سو منتر ہیں لیکن انسان کا کانا پانی بھی
نہیں مانگتا۔ آپریشن کھیڈا ابھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ”کھیڈا کنٹری
زبان کا لفظ ہے جسکے معنی ہیں ”خندق“۔ خندقیں کھود کر دیوہیکل ہاتھیوں

کو اسیر بنایا جاتا ہے۔ ایک زمانے میں بنگال میں جو طریقہ ہاتھیوں کو پکڑنے کا رائج تھا اس میں سنگدل اور وحشیانہ طریقے سے انہیں باقاعدہ خندقوں میں گرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ اور پھر موٹے موٹے رسوں سے انہیں کھینچ کر باہر نکالا جاتا تھا۔ اس طرح بیچارے ہاتھی بری طرح زخمی بھی ہوتے اور بعض جو سر کے بل خندق میں گرتے انکی موت تک ہو جاتی۔

میور میں بھی خندقوں کا استعمال ہوتا ہے لیکن ہاتھیوں کو خندقوں میں گرانے کے بجائے انہیں پکڑنے کیلئے بڑے بڑے پنجرے تیار کئے جاتے ہیں اور انکے اطراف خندقیں کھودی جاتی ہیں۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن والا معاملہ ہوتا ہے۔

کھیڈا کیلئے کافی وقت درکار ہوتا ہے۔ مہینوں پہلے وسیع و عظیم پنجرے تیار کئے جاتے ہیں۔ کرنائیک کے جنگل ساگوان اور بانس کیلئے مشہور ہیں اور وہی ہاتھیوں کے قید کا سامان بنتے ہیں۔ ہزاروں بانس اور ساگوان کے استعمال سے پنجرے تیار کئے جاتے ہیں اور سارے علاقے کے اطراف گہری خندقیں کھودی جاتی ہیں تاکہ اگر قیدی پنجرے سے بچ بھی نکلے تو خندق پار نہ کر سکے۔ آزاد ہاتھیوں کو غلامی کا طوق پہنانے والا کھیڈا اندرون اور بیرون ملک سے تماشہ بینوں کو کھینچ لاتا ہے پانچ سو کانٹس بھی اس تفریح طبع کیلئے سستا سمجھا جاتا ہے۔

کاکل کیلئے بھی یہ انوکھا تجربہ تھا۔ اسنے اپنے مختصر وارڈرب پر نظر ڈالی کہ موقع کے لحاظ سے کونسا لباس موزوں ہوگا۔ کچھ ایسے کپڑے بھی تھے

جو اسکی ماں نے اسے سیل سے خرید کر دئے تھے اور جنہیں کاکل کو سینے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ وہ قمیص اچھی طرح سینا جانتی تھی۔

کوٹھی کے ایک کمرے میں لسنے سلائی کی مشین، پینٹنگ کا سامان وغیرہ رکھا دیکھا تھا۔ وہ روشن اور دل آویز کمرہ کبھی شاہ نور بیگم کا ورک روم رہا ہوگا۔ میننگ کی ایک باسکٹ میں اب بھی سفید اون کا ایک نامکمل سویٹر رکھا تھا۔ مشین پر گرد کی ہلکی تہہ جم رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا اور کمروں کی طرح اس کمرے کی صفائی نہیں کی جاتی تھی۔ صرف بڑے بڑے روشن درپچوں کو بند کر کے ان پر پردے تان دئے گئے تھے۔ کاکل نے ڈوری کھینچی اور کمرہ دوپہر کی روشنی سے جگمگا اٹھا۔

انہیں صبح نو بجے نکلنا تھا۔ کاکل نہیں چاہتی تھی کہ التمش وقت پر تیار رہیں اور اسے ہی دیر کرنے کی خفت اٹھانی پڑے۔ التمش نے کھیڈا کی مصروفیت کے بارے میں ٹائم ٹیبل کی ایک کاپی اسے دے دی تھی۔ اسی کے مطابق لسنے ایک ایچی میں کچھ کپڑے اور ضروری سامان رکھا اور جب باہر نکلی تو التمش جیپ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جو ڈرائیور نے لاکر سیدھیوں کے پاس کھڑی کر دی تھی اور اگلے حکم کا منتظر تھا۔

التمش نے براؤن کار ڈرائے کی پینٹ اور بالکل سرخ قمیص پہنی ہوئی تھی جو انکے چست بدن پر بہت سج رہی تھی۔ انہوں نے براؤن کیپ لگائی ہوئی تھی۔ انکی بلند قامت ٹوپی سے باہر گردن تک پہنچے ہوئے بال جو وہاں پہنچتے ہلکا سا بیچ کھا جاتے تھے اور لا پرواہی سے کندھے پر ایک ہاتھ سے تھاما ہوا

کار ڈرائے ہی کاجیکٹ۔ وہ مردانہ حسن کا نمونہ لگ رہے تھے

جیب تک پہنچ کر انہوں نے نظر دوڑائی۔ سیدھیوں پر اترتی کاکل پر انکی نظر اٹک گئی۔ وہ شاید اسی کے منتظر تھے۔ ایک تحقیقاتی نظر۔ ایک تجزیاتی پیمانہ اور پھر تسلی۔ گویا کاکل اور اسکے لباس نے انہیں مطمئن کر دیا تھا۔ اسے دیکھ کر انکی نظر ٹھنکی تو تھی لیکن قیمتی رے بین Rayban چشمے کے اندر انکی آنکھوں میں کیا تھا وہ کوئی نہیں جان سکتا تھا۔

کاکل نے سفید فلائین کی پتلون اور سفید ہی قمیص پہنی تھی جسے اسنے بعجلت سیا تھا۔ قمیص کے ڈھیلے آستین نیچے پہنچ کر کف سے بند ہو جاتے تھے۔ قمیص کے کالر سے اسکی بلوری نازک گردن کا کچھ حصہ عیاں تھا۔ قمیص پر اسنے سرخ رنگ کی بغیر آستین اوئی جیکٹ پہنی تھی۔ جسکے بٹن کھلے چھوڑ دئے تھے یہ جیکٹ اسنے ریڈی میڈ ہی خریدی تھی۔ احتیاطاً اسنے ایک پرنٹڈ سلک کا اسکاف کندھوں پر ڈال لیا تھا تاکہ بوقت ضرورت اپنے سرکش بالوں کو قابو میں رکھ سکے۔

اسے دیکھ کر التمش مطمئن تو ہوئے لیکن انہیں ہلکا سا اچنبھا بھی ہوا۔ انہیں کاکل سے ذوق کی اس نفاست کی شاید امید نہیں تھی۔ انہوں نے جب بھی اسے دیکھا تو اندازہ ہوا تھا کہ لباس کے بارے اسکی پسند کچھ خاص نہیں تھی۔ اور اب اچانک اسمارٹ کاکل اپنے ہاتھ میں بیگ لئے مکمل اعتماد کے ساتھ جیب کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ڈرائیور نے آگے بڑھ کر اسکے ہاتھ سے ایچی لی اور جیب میں پچھے رکھ دی۔ کاکل کے بیٹھنے کے بعد التمش نے جیب

اسٹارٹ کی اور وہ چل پڑے۔

صبح کی نرم دھوپ میں یو کلبٹس کے پیڑوں کے سائے ابھی لمبے ہی تھے ہوا میں خنکی تھی۔ بڑے گیٹ سے گذر کر گھنی جھاڑیوں کے درمیان سے گذرتی جیپ نے پرائیویٹ سڑک چھوڑی اور ہائی وے پر آگئی۔ چکر دار راستے میں وادیاں گہری اور پہاڑ اونچے ہونے لگے۔ کوٹھی سے کچھ دور پہنچ کر التمش نے ایک کنارے کار روک دی۔ اوٹی پہنچنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ وہ التمش کے ساتھ باہر نکلی تھی۔ اسکی نسیمیں تنی تنی سی تھیں۔ التمش سے اٹھتی انکے آفٹر شیو لوشن کی مہک سے اور بھی زیادہ اپنے برابر انکی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی۔ اب اچانک کار روک دینا اسکے لئے ایک معہ بن گیا۔ التمش نے جیکٹ سے جو انہوں نے سیٹ کی پشت پر ڈال رکھا تھا

ایک پتلا سا ڈبہ نکالا۔ "A token gift for your first" - outhing انہوں نے کاکل کو اسکی پہلی آؤٹنگ کا تحفہ دیا۔ اس غیر متوقع تحفے نے کاکل کو بوکھلا دیا۔

وہ کہنا چاہتی تھی کہ انہوں نے ناحق تحفہ دینے کی زحمت کی لیکن بمشکل صرف تھینک یو بول پائی۔ اس نے ڈبہ لیا اور گود میں رکھ لیا۔ وہ جب بھی التمش کے ساتھ اکیلی ہوتی تو پہلے خود میں طہانیت پیدا کرنے کی کوشش کرتی۔ اپنی خواہ مخواہ کی بوکھلاہٹ کا اسکے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔ بات یہ بھی نہیں تھی کہ اسے مردوں سے بات کرنے میں جھجھک محسوس ہوتی اسے ایسے بے مطلب غمزوں سے آپ ہی نفرت تھی جسکو استعمال کر کے لڑکیاں

اپنی نسوانیت کا ڈنکا پیٹنا چاہتی تھیں لیکن وہ خود التمش کے ساتھ گنگ سی کیوں ہو جاتی تھی؟ اگر وہ اسکی فطری کمزوری تھی تو مسیح کے ساتھ اسے ایسا کیوں نہیں محسوس ہوتا تھا؟ ابھی کل ہی کی تو بات تھی کہ مسیح نے اسے بائبل کا ایک نسخہ دیا تھا تو وہ بلا جھجک اسکے ساتھ بحث مباحثے پر اتر آئی تھی۔ بحث تو وہ التمش کے ساتھ بھی کرنے لگی تھی لیکن اسکے لئے پہلے اسے اس احساس سے گذرنا پڑتا تھا جیسے وہ آگ کے لادے میں کودنے والی ہو۔

”دیکھو گی نہیں؟“ التمش نے کہا۔

اس نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا اور ڈبہ کھولا۔ اس میں ایک بہت ہی خوبصورت دھوپ کا چشمہ تھا جس کے ڈبے کی بناوٹ ہی بتاتی تھی کہ کافی قیمتی ہوگا۔ بے اختیار اسنے انکی طرف ایک شکر گزاری کی نظر ڈالی۔ التمش اسکی سراپیمگی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ انکے ہونٹوں کے کنارے قدرے جھک گئے تھے۔ انہیں اپنے برابر بیٹھی وہ حسین لڑکی انوکھی لگی جو تحفہ لے کر نخل ہو جاتی تھی۔ ورنہ انہوں نے بارہا اس سے کہیں زیادہ قیمتی تحفے لڑکیوں کو دیئے تھے جنہیں لے کر انہوں نے اسکے چہرے پر بوسوں کی بارش کی تھی۔

”آپ نے شکریہ ادا کر لیا ہو تو آگے بڑھوں“ انہوں نے کہا۔

”ہم۔۔ میں نے کہا تو ہے شکریہ۔“

”مغربی ملکوں میں لڑکیاں کسی اور طرح شکریہ ادا کرتی ہیں۔“ انہوں نے مسکرا کر جیب کو حرکت میں لاتے ہوئے کہا اور کاکل کے کانوں

تک ایک گلابی ہر دوڑ گئی۔ الٹمش نے وہ شریر جملہ جیسے خود سے کہا تھا لیکن اسکا بھی یقین تھا کہ انکے برابر جو بھی بیٹھا ہو وہ اسکے کانوں تک ضرور پہنچے جانے گا۔

کاکل نے چاہا کہ ان سے کہے کہ مغرب میں لڑکیوں کو تحفے کسی خاص مقصد سے دئے جاتے ہیں۔ جبکہ انہوں نے یہ تحفہ اپنے ہاں کام کرنی والی ایک محنت کش لڑکی کو اسکی کارکردگی کا انعام دیا تھا۔ اگر اسے اس بات پر کوئی شک تھا بھی تو وہ اس تحفے کا مقصد اس سے زیادہ کچھ نہیں سمجھنا چاہتی تھی۔ اسی میں اسکی خیریت تھی۔

الٹمش بڑی آسانی سے جیپ چلا رہے تھے۔ ہیرپن موٹر زندگی کے اندھے زاویوں کی طرح ہوتے ہیں جو اچانک راستوں میں ابھر آتے ہیں۔ پہاڑوں اور وادیوں کی یہ بلندیاں یہ پستیاں انسان کے کردار کی آزمائش بھی تو ہیں جہاں کوئی لغزش اسے خود اپنی نظروں میں گراسکتی ہے وہاں بلندیوں پر پہنچنے کے لئے کوہ کنی کرنی پڑی ہو اور ہاتھ میں شیشہ ہوتا ہے برداشت و تحمل کا

مسافت طے ہوتی رہی انہیں شام سے پہلے سستا گوڈی پہنچنا تھا جہاں سے قریب ہی دریائے کابینی بہتا ہے۔ گیٹ ہاؤز اسکے کنارے پر فضا مقام پر بنا تھا جو کھیڈا کے سین سے کچھ دور تھا۔ یہاں اور بھی سیاحوں کے ساتھ الٹمش اور کاکل کیلئے دو کمرے ریزرو تھے۔

ایک جگہ کافی دور تک کوئی ہیرپن موٹر نہیں تھا۔ تھوڑی تھوڑی دور کلورٹ بنے تھے۔ الٹمش بہت دیر تک خاموش ڈرائیو کرتے رہے

انہوں نے اب ایک طرف جیپ روک دی اور اتر آئے انہوں نے کاکل سے کچھ نہیں کہا۔ ٹوٹے کھورٹ کے پاس انہیں چپ چاپ کھڑا دیکھ کر کاکل بھی اتر آئی۔ انکی نظریں کھائی سے پرے کچھ کھوجنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ کاکل انکی محویت میں مغل ہونا نہیں چاہتی تھی لیکن التمش کے بھنچے ہوئے ہونٹوں اور پھرے کے تاثر سے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ یہی وہ جگہ تھی جہاں انہوں نے اپنی زندگی سے تعلق رکھنے والی تین اہم ہستیاں کھودی تھیں۔ اختر بخت، بیگم اور شاہ نور۔ وہ ٹوٹا کھورٹ ابھی تک اسی شکستہ حالت میں تھا جہاں سے اختر بخت کی کار کھائی میں گری اور جل کر راکھ ہو گئی۔ کاکل کو ایسا لگا جیسے التمش کا غم اسکے دامن کو بھی چھونے لگا۔ خاموشی میں کتنی یگانگت ہوتی ہے۔ انسان کچھ نہ کہہ کر بھی سب کچھ کہہ جاتا ہے۔ کاکل کا ہاتھ نادانستہ طور پر اٹھا اور التمش کے بازو پر ٹک گیا۔ ہاتھ کے اس سبک لمس میں وہ سب کچھ تھا جو ایک غمخوار کسی غمگین سے کہنا چاہتا ہو۔

التمش نے دھیرے سے گردن موڑی اور اسکے ہاتھ کو دیکھا جو انہیں اپنائیت اور دمسازی کا پیام دے رہا تھا جو اب بھی انکے بازو پر رکھا تھا۔ پھر انکی وہی نظریں کاکل کی طرف اٹھیں اور جیسے انکی نظروں ہی نے کاکل کو انکی طرف دیکھنے کی دعوت دی ہو اس نے انکی طرف دیکھا۔ زیاں التمش کا تھا لیکن آنکھ نم کاکل کی تھی۔ کچھ دیر نگاہوں کا تصادم قائم رہا نہ التمش کے ہونٹوں کے کنارے تمسخر آمیز مسکراہٹ سے پھر کے نہ کاکل کی آنکھوں نے کوئی شکایت کی۔ ہو سکتا ہے دمسازی کے یہ لمحے لاشعور ہی ہو جاتے اگر مخالف

سمت سے آنے والی کار نے کاکل کو چونکا نہ دیا ہوتا۔ اس نے دفعتاً اپنا ہاتھ ایسے ہٹا لیا جیسے کوئی چوری کرتی ہوئی پکڑی گئی تھی۔
 ”معاف کیجئے گا۔“ کاکل نے کہا۔

”معافی مانگ کر ایک اعلیٰ جذبے کی توہین نہ کرو۔۔۔۔۔ کاکل شب گیر“ انہوں نے اپنے صاف ستھرے رومال سے کاکل کے ماتھے پر آئے پسینے کو جذب کرتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں واپس جیپ کی طرف چلے لیکن اس بار الشمس کا ہاتھ کاکل کے کندھے پر تھا۔ جب کاکل بیٹھ گئی تو وہ خود گھوم کر اپنی سیٹ پر چلے گئے لیکن ان کے ہاتھ کالمس کاکل میلوں دور تک اپنے کندھے پر محسوس کرتی رہی

گیٹ ہاوس پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔ کھیڈاکی کارروائی دیکھنے کیلئے اور بھی لوگ وہاں آئے تھے۔ زیادہ تر بدلیسی ہوٹلوں میں ٹہرے تھے جہاں سے کھیڈاکا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ سرکاری افسروں نے گیٹ ہاوس کی ترجیح دی تھی کیونکہ انکی بھائیں بھائیں کرتی جیسیں مہنگے ہوٹلوں کی تاب نہیں لاسکتی تھیں اور سرکاری افسر ہونے کی وجہ سے انہیں گیٹ ہاوس کا سارا آرام بیدام حاصل ہو جاتا تھا۔ التمش کے گیٹ ہاوس کو ترجیح کی وجہ اسکا محل وقوع تھا۔ ندی کے کنارے بنے اس خوشگوار گیٹ ہاوس کے آس پاس کسی پر شور آبادی کا گمان نہیں ہوتا تھا۔ ندی کی دوسری جانب جنگل استنا گھنا نہیں تھا اور عقب میں میدانی حصہ دور تک چلا گیا تھا۔ جہاں پرانے کھنڈروں کے آثار تھے۔ اس سے کافی دور بستی میں ایک مندر تھا جہاں کھیڈاکی کارروائی شروع ہونے سے پہلے مددگار سدھے ہوئے ہاتھیوں کو دیوی کی پوجا کے لئے لے جایا جاتا تھا۔

کاکل اور التمش کے کمرے ساتھ ساتھ تھے جن میں درپچوں سے چوچھے کا منظر وہی تھا۔ کمرے آرامدہ اور غسل خانہ میں گرم پانی موجود تھا رات کے کھانے کیلئے انہیں ڈائننگ ہال ہی جاتا تھا جہاں سبھی سیاحوں کے لئے کھانے کا انتظام تھا۔

کاکل نے نہا کر اپنی فیروزی ساڑی اور اسی رنگ کا بلاؤز پہنا۔ اسی رنگ کے چھوٹے ماپس اور لاکٹ جو پتہ نہیں اس نے کب اپنے ٹرنکٹ بکس میں رکھ چھوڑے تھے۔ اسے ویسے ہی نقلی زیورات کا شوق نہیں تھا اور اصلی

زیورات اسکی پہنچ سے باہر تھے۔ یہ فیروزی سیٹ اسکی ایک سہیلی نے اے۔ اسکی سالگرہ پر تحفہ دیا تھا۔ تیار ہو کر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں خود کو دیکھ کر ایسا لگا جیسے اس نے قرون بعد آئینہ دیکھا ہو۔ وہ اس کا کل سے بہت مختلف نظر آرہی تھی جسکی ماں کا لڑ جانے تک بھی پکڑ کر اس کی چوٹی گوندھ دیا کرتی تھی۔ بھی ڈانٹ بنی دیتی کہ اور لڑکیوں کی طرح اسے سنورنے کا شوق کیوں نہیں تھا۔ اس کا کل نے آج اپنے گنے بالوں کی چوٹی بنائی اور کمرے میں رکھے گلدان سے ایک گلاب اس میں سجایا۔ لیکن سامنے کی شریر لٹ کسی طرح قابو میں نہیں آتی تھی۔ آخر تھک ہار کر اس نے اسے کان کے پچھے کر لینے پر اکتھا کیا۔

التمش اور کا کل دونوں ہی ساتھ ساتھ ڈانٹنگ ہال میں پہنچے دوسرے مہمان آچکے تھے۔ تین جوڑے اور دو اکیلے مرد۔ جب وہ کمرے میں پہنچے تو سبھی کی نظریں ان پر تھیں۔ سب کی توجہ اپنی طرف دیکھ کر کا کل کا چہرہ تمنا گیا۔ جہاں تک التمش کا تعلق تھا وہ پتلون اور سادی قمیص میں بھی اتنے ہی وجہہ لگ رہے تھے جتنے کسی اور لباس میں۔ قمیص کے پہلے کھلے بٹن سے انکی مضبوط گردن اور اس کے نیچے سیاہ بالوں کا رقبہ عیاں تھا۔ قمیص کی آستین انہوں نے کہنیوں تک پٹا دی تھیں۔ ان کی سیاہ آنکھوں کا اطمینان اور چمک بتاتی تھی کہ اپنے برابر بیٹھی کا کل کی دلکش شخصیت سے وہ بے بہرہ نہیں تھے۔ جب کئی لوگ جمع ہوں تو تعارف ایک رسم بن کر رہ جاتا ہے۔ نہ کوئی کسی کا نام ٹھیک سے سنتا ہے نہ خود اپنا بتا کر یقین کر سکتا ہے کہ اسکے

مقابل نے سن لیا۔ کاکل اور التمش جس طرح ہال میں داخل ہوئے تو وہاں موجود لوگوں کی غلط فہمی واجبی تھی۔

”آپ لوگوں نے الگ الگ کمرے کیوں لئے؟“ ایک گھامڑا فسر کی گھامڑیوی نے کہا ”ہمارا ڈبل روم تو بہت اچھا ہے۔“ وہ اپنے شوہر کی افسری میں سرشار تھی۔

”کہہ دیتا ہوں کہ ہماری لڑائی ہو گئی“ کاکل کے سرخ ہوتے رنگ کو دیکھ کر التمش نے زبان گال میں دبا کر جھک کر اس سے کہا۔ کاکل کو سراپسمہ دیکھ کر انہیں چھیدو سوجھ رہی تھی۔

کاکل دم سادھے بیٹھی رہی۔

”در اصل جب ہم نے گیٹ ہاؤس میں Booking مانگی تو سارے ڈبل روم بک ہو چکے تھے“ سہ نہیں وہ کیوں جھوٹ بولنے میں مزہ لے رہے تھے۔

”ہمیں تو انہیں دینا ہی تھا“۔ افسر لگے ہیں نامیرے ہنرینڈ“ افسر نے چچہ سالن میں گھیرتے ہوئے کہا۔

نئے بیاہتا جوڑے نے کچھ ناک سکیز کر ایک دوسرے کو دیکھا اور خاموشی سے کھانے لگے۔

کھانا اچھا تھا۔ مغلیٰ اور جنوبی ہند کا امتزاج۔

بات ہاتھی اور اسکی رقابت کی نکل آئی۔

”میں نے انکی لڑائی دیکھی ہے صاحب“ گیم وارڈن نے کہا، ”ہاتھی

میں رقابت کا مادہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اگر وہ کسی رقیب کو اپنی منظور نظر ہتھنی کی طرف متوجہ دیکھتا ہے تو اس سے گتھم گتھا ہو جاتا ہے۔“

”اور جب دو ہاتھی لڑتے ہیں تو بیچاری گھاس تباہ ہو جاتی ہے“ التمش نے کہا۔

”مگر ہر وقت وہ گھاس پر ہی تھوڑے ہی لڑتے ہونگے“ سرکاری افسر نے کینیائی کہاوت کو نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

”۔۔۔۔ اور پھر وہ اپنی بے وفا ہتھنی کو بھی نہیں بخشتا“ گیم وارڈن نے بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”ہال جی وہ تو جردری بات ہے“ افسر نے بولی ”پتنی کو تو پتی کا ہی ہو کر رہنا چاہیے۔“

”کیا خیال ہے؟“ التمش نے پھر آواز دبا کر کاکل سے کہا۔ اب کی بار کاکل بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکی لیکن نئے بیہاتہ جوڑے نے افسر کی بات پر پھر ناک سکیڑ کر ایک دوسرے کو دیکھا جیسے سخت بور ہو رہے ہوں۔

”کبھی ہاتھیوں کو خوب سی افیون کھلا کر بھی پکڑا جاتا تھا۔“ گیم وارڈن بولے۔ جب ان پر نشہ آور نیند طاری ہوتی تو آسانی سے انکے پیروں میں رسیاں باندھ دی جاتیں۔“

”میں نے ایک بار سرکس میں ہاتھی دیکھا تھا۔ وہ یوں سونڈ اٹھا کر سلام کرنا تھا۔ افسر نے اپنی سونڈ ہوا میں اٹھائی۔

نئے بیہاتہ جوڑے کا ناک سکیڑنا کم ہو گیا تھا۔ التمش سب سے

معذرت کر کے اٹھے اور ساتھ ہی کاکل بھی۔

لمبی کوریڈور طے کر کے جب وہ اپنے کمروں تک پہنچے تو کاکل کے کمرے پر وہ کچھ دیر تک رک گئے۔ انکی گہری گہری آنکھوں نے شاید کچھ کہا۔ کاکل نے اپنی آنکھیں اٹھائیں تو التمش کی آنکھوں کو نگران پایا۔

”فارسی سمجھ لیتی ہو؟“ انہوں نے اچانک کاکل سے پوچھا۔

”جی بابا فارسی میں بھی شاعری کرتے ہیں۔ ان ہی سے سیکھی“ کاکل اس بے محل سوال کا مطلب نہیں سمجھی۔

”Good“ التمش نے کہا۔

دیشب کہ می رفتی بتاؤ کردہ ازما یک طرف

اگندہ کاکل یک طرف زلف چلیپا یک طرف

ان کی آواز بوجھل ہو رہی تھی۔ کاکل حیران نظروں سے انہیں دیکھتی رہ گئی التمش نے اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسکے رخسار پر جھول آئی زلف کو کان کے پچھلے کیا اور کہا ”شب بخیر“۔ انہوں نے پلٹ کر نہیں دیکھا اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔

کاکل نے اندر آکر دروازہ بند کر لیا لیکن اس سے ایک قدم بھی آگے بڑھا نہیں گیا۔ اسکی آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ دروازے سے ٹیک لگا کے کھڑی ہو گئی۔ اس نے حافظ کا وہ شعر دہرایا جو ابھی ابھی التمش نے زیر لب پڑھا تھا (کل رات جب تم ہم سے منہ پھیرے جا رہی تھیں تو بس ہم نے اتنا دیکھا کہ تمہاری چوٹی ایک طرف ہر رہی تھی اور کھلی زلف ایک طرف) کیا

کھلوڑ کر رہے تھے حالات اسکے ساتھ۔ کیا مقصد تھا التمش کا اس طرح اچانک سوکھی زمین پر ساون کی بدلی بن کر برسنے کا پتہ صحرا پر سے خشک ہوا کا جھونکا بن کر گذر جانے کا کیا وہ اسکی قوت برداشت کو آزار ہے تھے۔ انکی انگلیوں کا لمس اب بھی اسکے رخسار میں بیدار تھا۔ اور وہاں جہاں کان کے پچھے پل بھر کو ان کا ہاتھ سرسرایا تھا۔ وہ تو اس سے نفرت کرتے تھے اسے دھوکے باز اور فتنے کی جڑ سمجھتے تھے پھر یہ التقات کیا معنی رکھتا تھا۔ کیا انہوں نے اسے اپنی پر اپرٹی سمجھنا شروع کر دیا تھا؟ اگر یہ اسکی آزمائش تھی تو وہ اسے کیوں آزمانا چاہتے تھے۔ کیا انہیں اسکی اس ذہنی کیفیت کا اندازہ ہو گیا تھا جو انکی قربت اس میں جگاتی تھی۔ دل کے دھڑکنے کی صدا تو بہت موہوم ہوتی ہے وہ انکے مغرور کانوں تک کیسے پہنچی۔ بسنے اپنا دل تھام لیا وہی کم بخت سراب کے پچھے بھاگنے لگا تھا۔ اگر اس نے اسے قابو میں نہیں رکھا تو ایک دن وہی اسکی رسوائی کا ذمہ دار ہوگا۔ بہتر تھا کہ وہ بروقت سنبھل جائے۔ التمش مغرب زدہ تھے جہاں کسی لڑکی میں دلچسپی کا اظہار عین تہذیب کی نشانی سمجھا جاتا ہے اسمیں سچائی کا ہونا ضروری تو نہیں! وہ بھی کوئی چھوٹی موٹی نہیں تھی۔ اگر ہوتی تو آج حفیظ کی بیوی بن کر اسکے ہوٹل کے برتن مانجھ رہی ہوتی اسی نے اپنے لئے وسیع تر دنیا چنی تھی اور دقیانوسی بندشوں سے باہر نکل آئی تھی۔ لیکن اسکا یہ مطلب نہیں تھا کہ کوئی اسے کھلونا بنا کر کھیلے۔ عورت اب اتنی بے بس نہیں رہی جتنی کسی زمانے میں تھی۔ زمانے کا مزاج اسکی قدریں بدل رہی تھیں۔

ان خیالات نے اسے تقویت دی لیکن انصاف کا تقاضہ یہ تھا کہ وہ خود اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھتی۔ اسکے باغیانہ خیالات کی روچا ناک رک گئی۔ کیا وجہ تھی کہ مسیح نے جب اسکی زلف چھوئی تھی تو اسکے جذبات یہ بھجان پیا نہیں ہوا۔ اسے خود ٹٹولنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ جب کہ پہلے ہی دن التمش اور انکی شخصیت مسلسل اسکے خیالات پر حاوی ہونے لگی تھی۔ کیوں اسے بار بار اپنا دامن جھٹک کر خود کو یقین دلانا پڑا تھا کہ نہیں کچھ نہیں ہوا۔

رات زیادہ ہو رہی تھی لسنے طے کیا کہ اس معمولی واقعے کو کوئی اہمیت نہیں دے گی۔ اس نے کپڑے تبدیل کئے منہ دھو کر ہلکی پھلکی مائٹی میں سونے کی تیاری کی۔ کمرے میں پنکھے کی مصنوعی ہوا میں گھٹن سی محسوس ہونے لگی تو کچھ دیر کیلئے اس نے بتی بند کر کے در پچے کے پردے ہٹا دئے اور دروازے کھول دئے خوشگوار ہوا کے جھونکوں نے اسکے سر کے ہلکے ہلکے درد کا علاج کر دیا۔ ہوا میں گھلی مدھم خوشبو۔ لسنے اسکا ایک بھرپور سانس لیا تو جان گئی کہ وہ سن کیسر کی سگندھ تھی جو گیسٹ ہاؤس کے احاطے میں اونچے اونچے پھڑوں سے کچھوں کی شکل میں لٹکتے تھے۔ وہ اور اس کی سہیلیاں بچپن میں انہیں ایک خاص طرح سے گوندھ کر لمبے لمبے گجرے بنایا کرتی تھیں۔ لیکن مدھم چاندنی میں اس خوشبو سے پرے کچھ دور ندی کے کنارے چٹان پر ایک ہیولا تھا۔ آرا مدہ نشست لے۔ ہاتھ میں جلتا ہوا سگریٹ۔

کاکل التمش کے سگریٹ پینے کے انداز سے بخوبی واقف تھی۔

سویرے کا کل دعا کرتی رہی تھی کہ ان کی مچان افسر نی سے دور ہو۔
 دعا قبول ہوئی۔ ویسے بھی ہر مچان کے درمیان فاصلہ چھوڑا گیا تھا۔ مچانوں کو
 حتی الامکان آرا مدہ بنایا گیا تھا۔ سبھی نے موقعہ کے لحاظ سے مناسب لباس
 پہنے ہوئے تھے۔ نیا شادی شدہ جوڑا بھی پوری تیاری سے آیا تھا۔ الشمس نے
 خاکی سفاری اور جنگل بوٹ پہن رکھے تھے جبکہ کا کل نے کارڈ رائے کی پتلون
 اور قمیص کے اوپر پتلون سے میچنگ جیکٹ۔ اسکے گلے میں شوخ رنگ کا مفلر
 اسکے لباس کی یکسانیت کو توڑ رہا تھا۔ اسکے دونوں کنارے اس نے جھولتے
 چھوڑ دئے تھے۔

کچھ دیر بعد انہوں نے دیکھا کہ موٹی افسر نی بھی اپنے میاں کے ساتھ
 ڈولتی آرہی تھی۔ گہری چھو لدار ساڑی اور ہاتھ میں بڑا سانشتہ دان حالانکہ
 مچانوں پر پہلے ہی سینڈوچ اور تھرماسوں میں کافی رکھ دی گئی تھی۔ افسر نی کے
 انتظام کو دیکھ کر پکھت الشمس نے نئے بیامتا جوڑے کی طرح ناک سیکڑی اور
 فی البدہہ کا کل نے بھی وہی کیا اور دونوں ہنس پڑے۔

”کیا ہاتھی آگئے؟“ ان کے مچان سے گذرتے ہوئے افسر نی نے ہانپ
 کر پوچھا۔ جھاڑیوں میں لچھ لچھ کر اس کی ساڑی نے اس کا ناطقہ بند کر رکھا تھا

”ابھی تو ایک ہی آیا ہے۔“ دوسرے مچان سے کسی نے آواز لگائی۔

تماشایہوں کی کافی تعداد جمع ہو گئی تھی۔

سننا گوڈی میں کاہنی ندی اور چٹانوں کے بیچ میدان میں مہاوت
 پالتو ہاتھیوں کو لئے پہنچ گئے تھے جنہیں پہلے سستی کے مندر لیجا یا جا رہا تھا تاکہ

پوجا کے بعد اصلی کارروائی شروع ہو۔ پوجا کے بعد ان پالتو ہاتھیوں کا رخ جنگل کی طرف موڑ دیا گیا اور پھر ”ہاکا“ شروع ہوا۔

التمش دور بین لگائے کھیڑا کے انتظامات دیکھ رہے تھے۔ ساگوان کے تنوں سے بہت بڑا احاطہ گھیرا گیا تھا۔ اس احاطے کے اندر ایک اور احاطہ تھا اور اس سارے رقبے کے اطراف کھیڑے یا خندقیں کھودی گئی تھیں تاکہ پکڑے گئے ہاتھیوں کی راہ فرار مسدود ہو جائے۔

ڈھول اور کنستریٹ کرہاکا کرنے والوں کی آوازیں قریب آنے لگیں۔ کاکل اور التمش سنبھل کر بیٹھ گئے۔ کھیڑا التمش نے پہلے بھی دیکھا تھا انہوں نے دور بین کاکل کے ہاتھ میں تھمادی اور ساری کارروائی کی وضاحت کرنے لگے۔

استناز بردست شور و غوغا تھا کہ اللہ کی پناہ۔ ہاتھیوں کا غول دریا کے کنارے پہنچنے لگا۔ جہاں پالتو ہاتھی ان کے منتظر تھے۔ شور و ہنگامے سے گھبرا کر جنگلی ہاتھی جیسے ہی وہاں پہنچے تو پالتو ہاتھیوں نے انہیں گھیر لیا اور اپنی کمر سے دھکے دے دے کر انہیں احاطے کی طرف ڈھکیلنے لگے۔ بس وہی ایک راستہ، انکی غلامی کا راستہ، ان کے لئے کھلا تھا جو سیدھے انہیں قید خانے لے جاتا تھا۔ احاطے کے دروازے پر پہنچتے ہی شاید انکی چھٹی حس نے انہیں خبردار کیا کہ آگے خطرہ ہے اور وہ واپسی کیلئے محل گئے۔ ایسے میں کھیڑا والوں نے ہر طرف سے ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔

یہ برہمست دیکھ کر کاکل لرز گئی۔ لیکن التمش نے اسے بتایا کہ ان

گویوں کا مقصد ہاتھیوں کی جان لینا نہیں تھا بلکہ قدرے زخمی کرنا تھا تاکہ وہ بس اسی راستے پر بھاگ چلیں جہاں ان کی قید کا انتظام تھا۔ زندگی میں کبھی سامنے ایک ہی راستہ ہوتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ وہ تباہی کا راستہ ہے پھر بھی ہم اس پر چل پڑتے ہیں۔

ہاتھیوں کی چٹانوں جیسے جسموں سے خون کی بہتی دھاروں نے کاکل کو نروس کر دیا لیکن وہ بڑی ہمت سے دور بین آنکھوں سے چپکائے بیٹھی رہی وہ اپنی کمزوری ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی کہ کہیں وہ التمش کے مضحکے کا سامان نہ بنے۔

جنگلی ہاتھیوں کے غول جب دھکے مکے کھا کر احاطے میں داخل ہو گئے تو فضا اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھی کیونکہ پالتوں ہاتھیوں کے تقریباً سارے ہی مہاوت مسلمان تھے۔ بنگال سے کرناٹک پہنچی ان کی ہر نسل یہی کام کرتی آئی تھی۔ انگریزی مارزن فلموں کا مشہور ایکٹر ساہو جسے Elephant Boy کہا جاتا تھا۔ یہیں سے ہالی ووڈ پہنچا تھا جو اب انگریز بیوی کے ساتھ وہاں چین کی زندگی گزار رہا تھا۔

بیچارے ہاتھیوں کی آزمائش ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ انہیں تو قید تنہا تک پہنچنا تھا جہاں سے واپس لوٹنے کا ہر راستہ مسدود ہو جاتا ہے۔ جس طرح انسان ہی انسان کی تباہی کا باعث ہوتا ہے اسی طرح سدھے ہوئے گھاگ ہاتھیوں نے بھی اپنے سادہ لوح ہاتھیوں کو دھکے دے دے کر اندرونی احاطے میں ڈھکیلنا شروع کیا جہاں تجربے کا رکھیڈا کارکن موٹے

موٹے رے لئے انکے منتظر تھے۔ ہاتھیوں کے وہاں پہنچتے ہی انہوں نے انکے پیروں اور گلے میں پھندے ڈالکر انہیں بس میں کر لیا۔ یہ کام بہت خطرناک بھی ہوتا ہے ہاتھی کا ایک ایک قدم انہیں موت سے دوچار کر سکتا ہے۔

کھیڈاکا پہلا مرحلہ طے ہوا۔ لیکن کامیاب اور فاتح قوم جس طرح مجبور و محصور قوم کی اشک شونی کرتی ہے انکے آگے اپنی بھیک کے ٹکڑے پھینکتی ہے اسی طرح مفتوح ہاتھی اب پابہ جولاں واپس ساگوں کے جنگل لے جائے جا رہے تھے تاکہ انہیں نہارا جائے۔ یہ بھی انکا ذہنی بلیک میل ہوتا ہے۔ جنگل کا وہ حصہ جہاں ہاتھی لائے جاتے ہیں ”فیل خانہ“ کہلاتا ہے جہاں انہیں مضبوط پیروں سے باندھ دیا جاتا ہے۔ انکی مرہم پٹی کی جاتی ہے پھر ان کی ٹریننگ شروع ہوتی ہے اور انکی آزادانہ روش کو کچل کر رکھ دیا جاتا ہے۔ جہاں میں حلقہ بگوشوں کے نام کچھ بھی نہیں انکی گنے اور گڑ سے تواضع کی جاتی ہے۔ دن میں دو بار ندی میں نہانے کی اجازت دی جاتی ہے جو انکا مرغوب مشغلہ ہے۔

جو غیور ہاتھی کسی قیمت پر قید برداشت نہیں کر پاتے۔ رے توڑ کر نکل بھاگنے کی کوشش انہیں ہولناک کر دیتی ہے۔

اگلے دن افسر نی اور دوسرے ساتھی جاچکے تھے۔ چند لوگ یہ دیکھنے کے لئے رک گئے تھے کہ ہاتھی سدھائے کس طرح جاتے ہیں۔ ان میں مٹھوں کے پروہت۔ سرکس کے مالک اور ٹبر مرچنٹ تھے جنہیں یہاں سے ہاتھی خریدنے تھے۔

التمش اور کاکل نے بھی اپنا مختصر سامان پیک کر رکھا تھا تاکہ ایک نظر ٹریننگ کیمپ دیکھیں اور واپس آکر سامان لیں اور چل پڑیں۔

کابینی ندی کو پیچھے چھوڑ کر میدانوں سے سیدھا راستہ جنگل جاتا تھا جہاں فیل خانے میں ہاتھی سدھائے جا رہے تھے دور دہسنے ہاتھ کو پرانے کھنڈر تھے جو اتنے پرانے بھی نہیں لگتے تھے کہ التمش کو دعوت فکر دیتے ٹوٹی دیواروں کی ساخت بتاتی تھی کہ وہ غالباً اسی صدی کے آثار تھے اسکے علاوہ انہیں فیل خانہ کا خیال ترک کر کے دہسنے ہاتھ کو تقریباً ایک فرلانگ دور جانا پڑتا۔

فیل خانہ اتنی دور بھی نہیں تھا۔ وہاں کوئی دس پندرہ ہاتھی تھے جو نوجوان فیل بانوں کی تحویل میں تھے۔ کچھ نے تن بہ تقدیر قسمت کے فیصلے کو مان لیا تھا اور رغبت سے گنا اور گڑ کھا رہے تھے۔ لیکن ان میں ایک کسن ہاتھی بھی تھا جسے اپنی آزادی ہر چیز سے زیادہ پیاری تھی۔ اسکی آنکھوں سے نہتے پانی نے ان کہانیوں کی تصدیق کر دی جو ہاتھیوں کی ذہانت اور حساسیت کے بارے میں سنی تھیں۔ ایک اور ہاتھی نے التمش اور کاکل کی تمام تر توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ وہ ایک نوجوان جیالا ہاتھی تھا اور اپنی اسیری سے بکھوٹ کر ہی نہیں پارہا تھا۔ اسکی فلک شکاف چٹکھاڑ اور جسم کے زخم جو رسوں کی رگڑ سے پیدا ہو گئے تھے اتنے گہرے تھے کہ اسکی ہڈی نظر آ رہی تھی پھر بھی وہ اپنی آزادی کی کوشش کئے جا رہا تھا۔ اسکا نوجوان فیل بان سخت آزمائش کے دور سے گذر رہا تھا۔

ظلم اور استبداد کس طرح جیالوں کو بھی گھٹنے ٹیک دینے پر آمادہ کر دیتا ہے وہ سرفروش ہاتھی اسکی بہترین مثال تھی۔ ہاتھی کی حالت زار کے ساتھ التمش سے کاکل کی ذہنی کیفیت بھی چھپی نہیں رہی گو کہ اس نے اپنی قوت برداشت سے کام لیکر اپنی گردن پھیر لی تھی لیکن اسکا چمیلی کی طرح سفید ہوتا ہوا رنگ اسکی دل کی کیفیت کا مظہر تھا۔ انہوں نے واپسی کا قصد کیا اور کاکل کی آستین چھو کر اسے واپس چلنے کا اشارہ کیا۔ شکست پندار کا منظر کچھ کم دردناک نہیں ہوتا۔

وہ دونوں جنگل کو پار کر کے میدانی حصے تک چلے آئے۔ ابھی صبح ہی تھی لیکن سورج میں تمازت آگئی تھی۔ التمش نے اپنی کیپ کاکل کے سر پر کھدی وہ جلد ہی گیسٹ ہاؤس پہنچ جانا چاہتے تھے کہ جیپ لیں اور چل پڑیں۔ انکے قدم جلدی جلدی اٹھ رہے تھے۔ دور سے اس پابجولاں ہاتھی کی دردناک چنگھاڑ اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ یکایک ایک شور غل اٹھا، ساتھ ہی لوگوں کے چلانے اور دوڑنے کی آوازیں۔

التمش نے خطرے کو محسوس کیا انہوں نے کاکل کا ہاتھ تھاما اور اپنی رفتار تیز کر دی۔ انکا خیال درست تھا۔ آزادی کے متوالے نے اپنی سلاسل توڑ پھینکی تھی اور بھاگ نکلا تھا۔ جنگل کی طرف سے سارے راستے بند پا کر لسنے ندی کا رخ پکڑ لیا تھا۔ اسکا غضب اور وحشت ایسے تھے کہ راستے کی ہر چیز کو پامال کرتا بڑھا چلا آتا تھا۔ اسکے ذہن میں انسان اور اسکی عیاری کا زخم بالکل تازہ تھا۔ اس نفرت کو جسم کا گھوا اور بھی ہوا دے رہے تھے دور سے

اس نے التمش اور کاکل کو دیکھا۔ انسان سے بدلہ لینے کی خواہش نے اسے اور بھی بھبھوکا کر دیا ساری انسانی نسل کا بدلہ وہ ان سے لینے کیلئے لپکا۔
التمش کی تیز گامی کو کاکل یوں بھی چھو نہیں پار ہی تھی۔ اسکا سانس پھولنے لگا تھا۔ بڑھتے ہوئے خطرے کے خوف سے اور بھی اسکے پاؤں لڑکھرانے لگے۔

التمش نے یکایک گیٹ ہاؤس کا راستہ چھوڑ دیا اور مڑ کر کھنڈر کی طرف چل پڑے وہ ہاتھی کی اس خصلت سے واقف تھے کہ وہ ناک کی سیدھ میں ہی دوڑتا ہے لیکن اسکے راستے سے کوئی اچانک زاویہ بدل کر نکل جائے تو بچاؤ ہو سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ہاتھی رکے اور پلٹ کر اٹکا بیچھا کرے انکا خیال سچ نکلا ہاتھی کی چنگھاڑنے کے ساتھ انکے قدم اور بھی تیزی سے اٹھنے لگے اب کھنڈر بالکل سامنے تھے اور خطرہ نیچے۔ ہاتھی تیزی سے اپنی مسافت طے کر رہا تھا۔

”کاکل چھلانگ لگا دو“ التمش نے کاکل کو دھکا دیا لیکن فوراً اسے پکڑ کر نیچے کر دیا۔ وہ کاکل کی جان کو خطرے میں ڈالنے سے پہلے خود اس کھنڈر کی گہرائی کو ناپنا چاہتے تھے۔ پس ایک ہی زقند میں وہ کھنڈر میں کود پڑے وہ گڑھا اندھا گڑھا بھی ہو سکتا تھا۔ ہو سکتا تھا وہاں اندھا کنواں ہو۔ ایسا ہی ہوا دو تین ٹوٹی ہوئی سیرھیاں وہیں ختم ہو گئی تھیں۔ وہ پھسل کر کوئی دس فیٹ نیچے آ رہے۔ کاکل کو انہوں نے پل بھر کے لئے روک دیا تھا۔ لیکن نیچے محفوظ پہنچنے کے بعد انہوں نے آواز لگائی ”اب کو دجاو کاکل“ ویسے التمش کو

کھنڈر میں کودتے دیکھنا ہی اسکے لئے کافی تھا۔ اس خطرے سے لاتعلق جو اسکی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ کاکل نے آنکھیں بند کیں اور ایک ہی چھلانگ میں کھنڈر کی اس خندق میں کود پڑی۔

پیٹ میں پرندے کی سی پھڑپھڑاہٹ، پھولی ہوئی سانس اور دھونکنی بنا ہوا دل۔ اوسان کہاں جگہ پر رہتے۔ التمش نے اسے یوں جھیل لیا تھا جیسے وہ پھولوں سے بھری ایک ٹوکری تھی۔ ڈوبتا انسان تو تنکے کو بھی سہارا بنا لیتا ہے۔ سنگلاخ سینے اور مضبوط بازوؤں نے اسے ایسے تھام لیا جہاں تحفظ تھا، دمسازی تھی۔ کاکل کے دونوں بازو التمش کی گردن میں جمائل ہو گئے تھے۔ اس نے انہیں اتنا کس لیا تھا کہ ان کے سینے سے لگے اسکے کان انکے دل کی بتدریج بڑھتی دھڑکنیں سن سکتے تھے۔ پتہ نہیں کتنے لمحے اسی طرح گزر گئے پھر ایک مخصوص خوشبو نے، جبے وہ بہت اچھی طرح پہچاننے لگی تھی اسے ہوش دلایا اور اسے التمش کی قربت کا شدید احساس ہوا۔ اس نے حیران ہو کر آنکھیں کھولیں تو انکی سیاہ آنکھوں کو نگران پایا۔ ان کی آنکھوں میں کئی سمندروں کی گہرائی اتر آئی تھی۔ ان ابروؤں کے بیچ وہ لکیر ابھرائی تھی جو ان کی محویت کی گواہی تھی۔ کاکل ان آنکھوں میں دیکھتی رہ گئی اور بھول گئی کہ اسکی بائیں اب بھی التمش کی گردن میں جمائل تھیں۔ وہ کونسی مقناطیسی کشش تھی جس نے اسکی سوچنے سمجھنے کی قوت کو سلب کر لیا تھا۔؟ وہ کونسا جادو تھا جس نے اسے دنیا و ما فیہا بے خبر کر دیا تھا؟ التمش کا دل کیوں دھونکنی بن گیا تھا۔ کیوں انکی آنکھوں کی گہرائی میں وہ ڈوبتی ہی جا رہی تھی؟ ان سب

سوالوں کے جواب ہی میں گویا التمش کا سردھیرے سے جھکا اور اس کے اور انکے لبوں کے درمیان جو موہوم سا فاصلہ تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔ اسکی آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ اس لمحے کے طلسمات میں کھو گئی تھی۔ جس نے پہلی بار اسے اجنبی لبوں سے آشنا کر دیا تھا۔ التمش نے اس کے قدم زمین پر ٹکا دئے تھے اور اسے اپنی باہنوں کے تنگ گھیرے میں لئے کھڑے تھے۔

کاکل کے دل و دماغ ایک جھٹکے کے ساتھ جاگ اٹھے۔ سننے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر انہیں دھکیلنا چاہا لیکن التمش کی گرفت اور بھی تنگ ہو گئی۔

”چپکی کھڑی رہو۔ ابھی خطرہ ملا نہیں ہے“ انکی آواز گمبیر تھی۔ انکا خدشہ صحیح تھا۔ ہاتھی نے انہیں کھنڈروں کی طرف جاتا دیکھا تو پلٹا۔ اتنی دیر میں التمش اور کاکل نے کھنڈر کی خندق میں پناہ لے لی تھی۔ وہ بظاہر ماضی کے کسی خواب یا چھوٹے موٹے راجا کی حویلی کے کھنڈر تھے اس کے جس حصے میں کاکل اور التمش محصور تھے وہاں کسی زمانے میں اناج کی بوریاں رکھی جاتی ہونگی۔ امتداد زمانے نے دیواروں اور سیڑھیوں کو ڈھا دیا تھا۔ تہہ خانے کے اس حصے میں بمشکل اتنی جگہ تھی کہ دو نفر اس طرح کھڑے ہو سکتے تھے جیسے التمش اور کاکل تھے۔

ہاتھی کا سایہ خندق کے ایک حصے پر پڑ رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کی چنگھاڑ نے کاکل کو دہلا دیا۔ زخمی اور غصیلا ہاتھی اپنے غیض و غضب میں خود کو خندق میں جھونک سکتا تھا۔ التمش نے سر پر کھڑے خطرے کو محسوس کیا اور

کاکل کو کمر سے گھسیٹ کر ٹوٹی چھت کے آسرے میں ہو گئے تاکہ ہاتھی کی نظر ان پر نہ پڑے۔ وہ اس طرح جرے کھڑے تھے کہ التمش کے گرم سانسوں کی لو کاکل کے رخساروں کو دہکا رہی تھی۔

ہاتھی کے پاؤں خندق کے پاس رک گئے تھے۔ خندق کا تجربہ اس کے ذہن میں بالکل ابھی تازہ تھا۔ وہ خود کو دوبارہ اس میں جھونکنے ہرگز تیار نہ تھا وہ وہاں کھڑا چنگھاڑتا رہا اور بدحواسی میں کاکل کے ناخن التمش کی کلائی میں دھنسے رہے۔

ایک شور مچا، کھیڑا کے کارکن اور مہاوت ر سے توڑ کر بھاگے ہوئے ہاتھی کے پیچھے دوڑ کر آ رہے تھے۔ ٹین پیٹنے کی آوازیں، لوگوں کا چلانا اور ہوا میں بندوقوں کے فار اور سینکڑوں دوڑتے ہوئے قدموں کے انتشار نے ہاتھی کو دہلا دیا اور وہ پچھلی دونوں مانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ اس کی چنگھاڑ میں زخموں کی شدید تکلیف کا کرب تھا قریب تھا کہ وہ اپنی استقامت کھو کر خندق میں جا گرے تاکہ بندوق سے نکلی ہوئی کئی گولیوں نے اسے ٹھنڈا کر دیا۔ اس کے زخمی پاؤں اور بدن میں تشج سا آیا۔ سونڈ کمزور پیچ کھا کر اٹھی اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں ساکت ہو گئیں۔

ایسے ہوتے ہیں آزادی کے متوالے

التمش نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ خطرہ ملا نہیں تھا۔ بلکہ خطرہ تو اب بالکل سامنے کھڑا تھا، کاکل انا کے لئے۔ اس نے جب خود کو ٹٹولا تو پتہ چلا کہ

وہ کوئی بیرونی خطرہ نہیں تھا بلکہ کاکل خود اپنے آپ سے خوف زدہ تھی۔ خود کو خود سے بچانا کتنا مشکل ہوتا ہے۔

التمش اور کاکل کو رسی کی سیدھی کی مدد سے باہر نکالا گیا۔ "آج کسی آر کیا لوجسٹ کو خود کھدوائیوں سے نکالا گیا۔" التمش نے ہنس کر کہا۔ ان کی حاضر دماغی اسی طرح بنی ہوئی تھی جبکہ کاکل کی حالت زبوں تھی۔ التمش کی پتلون گھٹنے پر سے پھٹ چکی تھی جہاں سے خون رس رہا تھا۔ اور کاکل کا پسندیدہ مفلر وہیں کھنڈر میں چھوٹ گیا تھا۔

ایمر جنسی وین وہاں پہنچ چکی تھی جس میں انہیں گیسٹ ہاؤس لے جایا گیا۔

غسل کر کے دونوں نے کپڑے تبدیل کئے اور التمش کی مرہم پٹی ہوئی۔ چائے کے گرم گرم پیالوں سے بڑی تقویت ملی لوگوں نے صلاح دی کہ وہ رک جائیں اور اگلے دن واپس جائیں لیکن التمش نہیں مانے۔

واپس ہوتے ہوئے وہ مسلسل منہ پھیرے جیب میں بیٹھی رہی۔ وہ کوشش کر رہی تھی کہ کھنڈر میں پیش آئے رومانی حادثے کو اپنے ذہن سے یکسر مٹا دے۔ اسے اضطراری حالت کا ردِ عمل سمجھے۔ کبھی وہ التمش پر فردِ جرم لگانا چاہتی۔ انہیں کیا حق تھا اس کے جذبات سے کھیلنے کا؟ لیکن اس کے لئے ضروری تھا کہ پہلے وہ خود کو بے گناہ ثابت کرے۔ اگر وہ سب کچھ زہر تھا تو اس نے امرت کی طرح کیسے پی لیا؟ کیوں اس کے لبوں پر اب بھی کسی احساسِ لطیف کی لرزش تھی؟ کیوں اس کے مافی الضمیر میں اب بھی التمش

کی سانسوں کی مہک بسی تھی؟ کیوں ان کی قربت میں اس کا رواں رواں جاگ اٹھتا تھا؟ کیوں؟ اس سے خود اپنے سوالوں کے جواب نہیں بن پڑ رہے تھے۔ حالات نے بے شک اسے کمزور سچویشن میں جھونک دیا تھا لیکن کیا التمش اتنے گر گئے تھے کہ اس کی مجبوری کا فائدہ اٹھائیں۔۔۔ اسے اپنا کھلونا سمجھیں۔

شائد نہیں۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر سوچا۔ خندق کے وہ لمحے جو اس کے دل کے تہہ خانے میں جاگزیں ہو گئے تھے۔ انہیں وہ شائد کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔ انکے ساتھ ہی کچھ اور لمحے بھی تو تھے جو اس سے انصاف مانگ رہے تھے۔ اسے اپنی آغوش میں جھیلنے کے بعد التمش نے یقیناً کوشش کی تھی کہ اس کے بوجھ کو انسانیت کا خوشگوار فرض سمجھ کر سہارا دیں۔ لیکن جس طرح چھتاق کی رگڑ سے چنگاریاں اٹھتی ہیں اسی طرح دو دھڑکتے دل اس قدر قریب آجائیں تو نغمے کا پیدا ہونا ناگزیر تھا اور ایسا ہی ہوا۔ وہ لمحے ان دونوں کی قدرت سے باہر تھے۔

اس کے جوار بھانا خیالات سے یکسر بے نیاز جیپ یکساں رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ التمش، بالکل خاموش تھے۔ ان کا دیا ہوا تحفہ، دھوپ کا وہ چشمہ اس نے اپنے زانو پر رکھے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ ایک زاویے پر التمش کے چہرے کا مکمل عکس اسمیں اتر آیا تھا اس کی نظریں انکے عکس پر جم گئیں۔ کبھی ان کے لبوں پر وہی مسکراہٹ کھیل جاتی تھی۔ جس کا مطلب اسکی سمجھ سے بالا تھا۔ اور پھر وہ اچانک سنجیدہ ہو جاتے۔ اس نے ترچھی نظروں سے ان کے

مضبوط بازوؤں کو دیکھا جو مشاقتی سے جیپ کو بلندیوں اور پستیوں میں کنٹرول کر رہے تھے۔ ان کے کلائی پر وہاں زخم تازہ تھا جہاں اس نے وحشت اور خوف کے زیر اثر اپنے ناخن گزروئے تھے۔ اسے ایک جھرجھری سی آئی بہت ممکن تھا کہ ہاتھ بڑھا کہ وہ ان زخموں کو چھو لیتی لیکن اس نے بروقت خود کو ٹوک دیا۔ یہ اسکا لاشعوری عمل ہوتا لیکن موجودہ حالات میں وہ کوئی حرکت ایسی نہیں کرنا چاہتی تھی جو اس کی پوزیشن کو اور بھی خراب کر دے۔

”کیا صرف سوری کہنے سے کام چل جائے گا؟“ چشمے کے گلاس میں ان کی آنکھوں میں شائد اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ اس کا سنبھلنا کچھ بھی ان سے چھپا نہیں تھا وہ یہ بھی طے نہیں کر پائی کہ تمسخر آمیز مسکراہٹ کے ساتھ جو الفاظ انہوں نے ابھی کہے تھے وہ اس کے لئے تھے یا خود اپنے لئے۔

”سوری“ سننے ان کی کلائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اوہ“ انہوں نے کلائی کی طرف ایسے دیکھا جیسے وہ ان کی نہیں کسی اور کی کلائی تھی۔ ”سو ویر تو کسی اچھے کام کے صلے میں دئے جاتے ہیں۔ میں نے ضرور کوئی اچھا کام کیا ہوگا۔ جس کا تم نے صلہ دیا۔“ اور کاکل کا دل چاہا کہ وہیں گود میں رکھا اپنا بیگ ان پر دے مارے۔

لیکن بعض حالات میں غصہ، خجالت، شرمندگی سب کچھ بیکار ثابت ہوتے ہیں اس نے خاموش ہو جانے کو ہی بہتر سمجھا۔

”مانا کہ خاموشی سونے کے مول ہوتی ہے“ کچھ دیر خاموشی سے مسافت طے ہونے پر التمش نے کہا ”کیا لوگی تم اپنی خاموشی توڑنے کے دام؟“

”سونے کو کان سے نکالا جائے تو کان کنی کہتے ہیں“ کاکل نے انہیں نارمل موڈ میں دیکھ کر چین کا سانس لیا۔ ”بخیل سے دام نکالنے کے لئے جانکنی سے کام لینا پڑتا ہے۔ آپ میری خاموشی کے دام نہیں دے سکیں گے۔“

”دام صرف پیسے ہی کی شکل میں تو نہیں چکائے جاتے“ التمش نے جیب کو کیفیٹیریا کے احاطے میں موڑتے ہوئے کہا ”لیکن معلوم تو ہو کہ مجھ پر بخالت کا تازہ ترین الزام کیوں لگ رہا ہے؟ انہوں نے جیب روک لی۔“

”زمینو اور شہزاد ذہین بچے ہیں“ کاکل نے کہا۔ انہیں صرف کھیل کود اور کہانی قصوں میں اٹھائے رکھنا ان کے ذہن کی ہمتک ہے۔“

”ہوں“ التمش نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ”اتفاق سے میں بھی یہی سوچتا ہوں۔“

”میں کل شاپنگ کے لئے جانا چاہتی ہوں۔ ان کی ضرورت کی کچھ چیزیں اور تعلیمی کھیل خریدنے ہیں۔ پیسے کی ضرورت ہے۔“

”اچھا تو اسی لئے مجھ پر بخالت کا الزام تھا۔“ التمش نے ایک بناؤٹی لمبی سانس لی جیسے انہیں کسی بڑے الزام سے بری کر دیا گیا ہو ”میں مسخ سے کہہ دیا ہوتا۔“

”میں شہزاد اور زمینو کو بھی ساتھ لے جاؤں گی“ اس نے اطلاعاً کہا۔

”یہ تو اور بھی اچھا ہوگا۔“ انہوں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا ”بلکہ ہو سکے تو انہیں وہیں بیچ آؤ Twins ہیں۔ اچھے دام آئیں گے۔“ کاکل ہنس پڑی اور ساتھ ہی التمش بھی ان کے ہموار چمکدار دانت بے عیب تھے۔ اور

ہنستے وقت آنکھوں کے کنارے جھریاں سی نمودار ہو جاتی تھیں۔

”کاکل جہاں! آج کے بعد جب بھی پیسے کی ضرورت ہو مجھ سے اجازت

لینے کی ضرورت نہیں۔ صبح سے کہہ دینا کافی ہو گا۔“ وہ سنجیدہ ہو کر بولے

”شکریہ! اور میرا نام کاکل جہاں نہیں صرف کاکل ہے۔“ کاکل نے

کہھا کر کہا۔

”چچی جان نے تو یہی کہا تھا“ انہوں نے دونوں ابرو چرمھا کر اسے دیکھا

اور دونوں ہنس پڑے۔ حور بانو سے متعلق ہر بات اب دعوتِ مزاح دینے لگی تھی۔

فضا میں کافی کی خوشبو گھلی تھی۔ وہ اور التمش جیپ سے اتر آئے اور

کیفٹیریا کی طرف بڑھے کاکل نے گویا ایک موہوم سی ”سی“ کی آواز سنی اور

دیکھا کہ پل بھر کیلئے التمش لنگڑا گئے لیکن انہوں نے فوراً ہی خود پر قابو پایا۔

”آپ جیپ میں بیٹھیں“ کاکل نے بے ساختہ انکا بازو تھام کر کہا ”کافی

میں لے آؤنگی“

”مجھے شائیلک کے قبیلے میں پہلے ہی داخل کر چکی ہو“ انہوں نے خوش

مزاجی سے کہا ”اگر کافی کے پیسے بھی دینے پڑے تو اخباروں میں چھپو ادوگی کہ

کھدائیوں میں سے نکالا گیا آرکیالوجسٹ تلاش ہو گیا ہے“ التمش کی خوش

طبعی بلندیوں پر تھی۔ کاکل کو بھی اپنا کھنچاؤ کم ہوتا محسوس ہوا۔

”جانتی ہو کاکل جہاں“ کافی کا آرڈر دیکر التمش نے کہا۔

”صرف کاکل“ کاکل نے ہاتھ اٹھا کر روکا۔

”۔۔۔ انگلستان کی بات ہے۔ ہہلا کافی ہاؤس سینٹ مائیکل ایلی۔ کارن ہل میں کھولا گیا۔ ۱۹۵۲ء کے اس ماحول کو بحسنہ لندن کے اس کافی ہاؤس میں برقرار رکھا گیا ہے۔ میں جب بھی وہاں رہتا ہوں اس کافی ہاؤس میں ضرور جاتا ہوں۔“۔۔۔ التمش نے برسبیل تذکرہ کہا۔

۔۔۔۔ اور ساتھ میں کون ہوتا ہے؟ کاکل سوچے بغیر نہ رہ سکی شاید کوئی حسنیہ جو کافی سے زیادہ ان کے ساتھ چند لمحے گزارنے کی آرزو مند ہوتی ہوگی۔

”کہہ ڈالو لڑکی“۔۔۔ التمش نے اسے کچھ سوچتا ہوا پا کر کہا ”الفاظ دلی کیفیت کو چھپانے کے لئے بنے ہیں جبکہ خاموشی بہت کچھ کہہ جاتی ہے۔“
اب وہ ان سے کیا کہتی کہ اس کا ذہن کہاں بھٹکنے لگا تھا۔ ان کی ٹیبل جہاں لگی تھی وہاں شیشے کی دیوار کے نیچے دور دور تک وادی میں کافی کے باغ پھیلے ہوئے تھے۔ سبز پتوں کے بیچ خوش رنگ بیریاں رنگ بدلنے لگی تھیں۔

”میں سوچ رہی تھی کہ جس طرح ”صفر“ ہندوستان کی دین ہے اسی طرح کافی کا تحفہ دنیا کو عربوں نے دیا۔“۔۔۔ وہ صاف جھوٹ بول گئی۔ حالانکہ اس وقت جو کچھ وہ سوچ رہی تھی اس میں ہلکا سا خوف کا شائبہ بھی تھا۔ ابھی ماضی قریب ہی کی تو بات تھی کہ وہ اپنے لئے کسی ٹھکانے کی تلاش میں ہر اسان تھی۔ اسے نوکری کی تلاش تھی اور اب وہ سب کچھ ماضی کے خلاء میں گھل چکا تھا۔ کیسے وہ سب کچھ بھول کر التمش کی ذات میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ خوف اسے اس لئے ہوتا تھا کہ اس کی ذرا سی لغزش اسے لے ڈوب سکتی تھی۔

التمش مرد تھے۔ مردانگی کا مکمل نمونہ۔ بین الاقوامی حیثیت تھی ان کی۔ ہزاروں دل ان پر نچھاور ہونے کے لئے بیتاب ہوتے ہوئے اور کیا پتہ انہوں نے اب تک کتنے دل اپنی انا کے قدموں تلے روند ڈالے ہونگے۔ اسے ان کا کھلونا نہیں بننا ہے۔ التمش کی شخصیت والے لوگ دوسروں سے اپنی پرستش کرواتے ہیں۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ اس مغرور دیوتا کے مندر کے حدود میں بھی داخل نہیں ہوگی۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ خود اپنے جذبات کی لگام کو تھامے رکھتی۔ ان کی چھوٹی چھوٹی پر اخلاق مہربانیوں کو معنی پہنانے کی کوشش نہ کرتی۔ یہ لمحہ اس کے لئے لمحہ خود آگہی تھی جس نے اسے بہت تقویت بخشی۔

”تو پھر چلیں کاکل پیچاں؟“ التمش اٹھتے ہوئے بولے اور ان کے گھٹنے کی چوٹ پھر بول گئی ”سی“۔۔۔۔۔ لیکن اس بار کاکل نے اپنا ہمدرد ہاتھ ان کے بازو پر نہیں رکھا۔

یو کلپٹس کے سرسراتے پیڑوں کے درمیان ہری ہری دوب پر چٹ پٹ، چٹ پٹ، اون کی سلائیوں کی آواز سنتے ہوئے کاکل بور ہونے لگی تھی۔ جب وہ مسیح زمینو اور شہزاد شاپنگ کے لئے گئے تو ضروری سامان اور بچوں کے لئے تعلیمی کھیلوں کے ساتھ وہ اون بھی خرید لائی تھی۔ مسیح نے دوکان دار سے پوچھا تھا کہ کیا وہ ہاتھ کے بنے سویٹر بھی دے سکتا ہے تو دوکاندار نے نفی میں جواب دیا تھا تب کاکل نے اسے سویٹر بنا کر دینے کی پیشکش کر دی تھی۔ اب وہ مسیح ہی کا سویٹر بنا رہی تھی۔

شہزاد اور زمینو ڈھلوانوں پر سرخ سرخ بیز ہوئیاں جمع کر کے ڈبوں میں ڈالتے جا رہے تھے۔ بس یوں بارش کھلی ہی تھی کہ حشرات کی اقلیم کی یہ دہنیں اپنی سرخ خملی پوشاکیں پہنے زمین سے باہر نکل آئی تھیں۔ اس نے اون اور سلائیاں تھیلی میں واپس رکھیں اور ان دونوں کا انہماک دیکھنے لگی دور دور تک چائے کے باغوں کے نشیب و فراز میں اُجلی سفید مانگ کی طرح پگڈنڈی بن گئی تھی اور اسی پر اس نے دور سے مسیح کو سائیکل پر آتے دیکھ کر ہاتھ ہلا دیا۔

شاہنگ کے لئے جاتے ہوئے مسیح نے اخلاقاً اس سے پوچھا تھا کہ کھیڈا کا تجربہ اس کے لئے کیسا رہا۔ کاکل نے اپنے حادثے کے سوائے اسے ساری تفصیل بتائی اور وہ اس کے محصورانہ جوش کو ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتا رہا۔ لیکن ایک مقام پر کاکل کی زبان کی لکنت نے اسے ٹٹولتی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ اسے شک تھا کہ کاکل نے کوئی خاص بات اسے بتانی نہیں چاہی تھی وہ التمش کا بچپن کا ساتھی تھا۔ وہ ان کی خطرناک کشش سے بھی واقف تھا جو وقت پڑنے پر ان کے دشمن کو بھی بے ضرر کر دیتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ کاکل کو اس خطرے سے آگاہ کرے جس میں وہ گھر سکتی تھی کیونکہ اس کا حاصل کچھ نہیں تھا۔ التمش نے یہ بات اچھی طرح واضح کر دی تھی کہ وہ شادی کو ایک بندھن، ایک خواہ مخواہ اڑچن سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے اور اگر لڑکیاں ان کی کشش کا شکار ہوتی تھیں تو یہ ان کی خوش فہمی تھی۔ لیکن وہ کاکل سے یہ سب کچھ نہیں کہہ سکا کیونکہ وہ خود اپنی

الحسن کا شکار ہو گیا تھا۔ وہ خود اپنی لڑائی آپ لڑ رہا تھا لیکن اسے مغر کہاں تھا! دوسرے وہ اس آزمائش میں کامیاب ہو کر سرخرو ہو سکتا تھا۔ تپا ہوا کھرا سونا بن کر ہی اس چوکھٹ پر سر جھکا سکتا تھا جو اس کا ہاتھ پکڑے دنیا کے ہر لالچ سے دور بندگی کے عروج تک پہنچا سکتی تھی۔

پگڈنڈی پر آتے ہوئے اس نے کاکل کو دور سے ہاتھ ہلاتے دیکھا اور چاہا کہ اپنا رخ بدل دے لیکن کسی انجانی قوت نے اسے کاکل کی طرف ڈھکیلنا شروع کر دیا اور وہ آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔ اس کے قریب آتے ہی شہزاد دوڑا ہوا گیا اور مسیح کے آگے بھٹنے پر محل گیا۔ مسیح نے ایک ہاتھ بڑھا کر شہزاد کو لٹکایا۔ آگے سائیکل کے ڈنڈے پر بیٹھ گیا۔ دھلی ہوئی فضا میں چشمے کے چچھے اس کی آنکھیں اور بھی نیلی ہو گئی تھیں۔ ہلکے ہریے بال ہوا سے منتشر تھے۔ وہ شاید گودام سے واپس ہو رہا تھا۔

”میں بھی بیٹھونگا“ زینو بھی اس کے پاس جا پہنچا۔

”زینو رک جاؤ۔ تم اپنی باری بعد میں لے لینا“۔ کاکل نے اسے سمجھایا کیونکہ سائیکل میں کیریر نہیں تھا اور دو تندرست و توانا بچوں کو ایک ساتھ سامنے بٹھانا مشکل تھا لیکن زینو ٹھکنے لگا۔ سائیکل سواری تو اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا جو اسے کبھی کبھی نصیب ہوتا تھا۔

”کوئی اور سائیکل ہوتی تو میں چلاتی اور اسے بٹھالیتی“۔ کاکل نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔

”تم سائیکل چلا لیتی ہو؟ مسکرا کر پوچھا۔

”بس سائیکل ہی تو چلانا جانتی ہوں۔“ کاکل بولی ”کالج اسی پر جایا آیا کرتی تھی“ اسے اپنی سائیکل یاد آئی جسے بیچنا پڑا تھا۔

”پھر تو کوئی مشکل نہیں ہے“ مسیح نے پاس ہی میدان میں پیڑ کے نیچے رکھی دو سائیکلوں کی طرف اشارہ کیا۔ باغ میں کام کرنے والے مزدور جو آس پاس رہتے تھے۔ اپنی سائیکلوں پر آتے اور انہیں پیڑوں کے نیچے چھوڑ کر باغ میں مصروف ہو جاتے۔

”زینو اپنا مسئلہ حل ہوتے دیکھ کر اچھلنے لگا۔

”لیکن!“ کاکل کچھ جھنجھکی۔۔۔“ ان کے مالک اگر اپنی سائیکل لینے آئیں

تب؟“

”بس ابھی کچھ دیر میں واپس آنا ہے۔“ مسیح کو تو شہزاد اور زینو کی ضد پوری کرنی تھی۔ فراٹے بھرتی سائیکلوں نے کوٹھی کا گیٹ چھوڑا اور باہر نکل آئیں۔ ”میں نے تو زندگی میں اتنے رنگ برنگے پھول کہیں نہیں دیکھے“ کاکل نے رستے کے دونوں جانب خود رو پھولوں کے تختوں کو دیکھتے ہوئے کہا ”تمہیں کون سے پھول پسند ہیں مسیح؟“

”لی“ گویا مسیح کا جواب پہلے ہی سے تیار تھا۔

”پھر تو ضرور کسی“ لی ”نام کی لڑکی سے شادی کرنا“ کاکل نے ترنگ میں بچکانہ جملہ کہا اور خود ہی ہنس پڑی۔ آج عرصے بعد سائیکل پر بیٹھ کر اسے اپنا لڑکپن یاد آ رہا تھا۔

”شادی عشق و محبت کا مادی تصور ہے۔“ اب کی بار مسیح نے مڑ کر

اسے دیکھا۔ گویا کاکل سے اسے اتنے کھوکھلے انداز بیان کی امید نہیں تھی۔
 سائیکلوں نے پرائیویٹ سڑک سے گذر کر ہائی وے کا راستہ لے لیا
 تھا۔ سائیکلیں جتنی زیادہ اچھلتیں شہزاد اور زینو اتنے ہی خوش ہو کر کھکاریاں
 بھرتے۔

وہ کوٹھی سے کافی آگے نکل آئے تھے اور مسیح کو فکر دامنگیر ہونے لگی
 تھی۔

”کاکل اب واپس چلیں“ اس نے نشیب اور فراز پر سائیکل چلانے کی
 مشقت سے کاکل کے سرخ ہوئے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔

زینو اور شہزاد چلائے ”نئیں نئیں اور آگے“ لیکن انہوں نے اپنی
 سائیکلیں روک لیں۔ اس سے پہلے کہ وہ واپس لوٹتے سامنے سے آتی ہوئی سیاہ
 چمکیلی کار نے انکار راستہ روک لیا۔ مسیح تو اس سیاہ کار کو جانتا ہی تھا لیکن کاکل
 بھی ان سیاہ گہری آنکھوں کو خوب پہچان گئی تھی جو شدید غصے کے عالم میں
 انہیں دیکھ رہی تھیں۔ ابرو پر آبی شکن اتنی گہری تھی کہ کوئی روڈ رولر ہی
 اسے ہموار کر سکتی تھی۔

”تامش“ زینو چلایا۔

”میں نہیں چاہتا کہ نور کے بچے ان کھائیوں کی مذر ہوں“۔ التمش کی

دبی ہوئی آواز میں اڑدے کی پھنکار تھی۔ ”Masih , I thought you had some sense“
 انہوں نے کاکل کو مکمل طور پر
 نظر انداز کرتے ہوئے اپنی مضبوط انگلیوں والا ہاتھ پچھے بڑھا کر دروازہ کھولا

”شہزاد، زمینو، بیٹھ جاؤ“

”ٹرسٹ کی فائل میری تلاش پر بھی نہیں ملی“ انہوں نے سخت لہجے میں مسیح سے کہا ”بہنچا دو۔۔ اگر فرصت ملے“ وہ شہزاد اور زمینو کے بیٹھنے کے بعد دروازہ بند کر کے لاک لگاتے ہوئے بولے اور ایکسپلیٹر کو کار کے سپینے میں گھونپ دیا اور آگے بڑھ گئے۔

کاکل کو لگا جیسے وہ دروازہ نہیں ایک تھپڑ تھا جو اس کے منہ پر لگا تھا۔ وہ نروس ہاتھوں سے سائیکل کا پینڈل ملتی رہ گئی۔

کیا یہ وہی التمش تھے جنہوں نے خندق میں اسے زندگی کا پہلا درس دیا تھا؟ جنہوں نے اوٹی واپس ہوتے ہوئے اپنے برتاؤ سے اسے یقین دیا تھا کہ وہ ان کی ملازم نہیں بلکہ ہم سفر اور دوست تھی؟ اچھا ہوا جو اس نے ان کے اور خود کے بیچ میں ایک دیوار خود ہی کھڑی کر لی تھی۔ اس نے سوچا۔

مسیح کا گورا رنگ ندامت اور سراسیمگی سے کانوں تک سرخ ہو گیا تھا غلطی ضرور ہوئی تھی۔ وہ خالی الذہنی سے سڑک پر وہاں تک نکل آئے تھے۔ جہاں سے کچھ خطرناک ہیرپن موٹر شروع ہوتے تھے۔ اور دونوں طرف کھائیاں کافی گہری تھیں۔

التمش اپنے پلان کے تحت جائیداد میں شاہ نور کے حصے کو شہزاد اور زمینو کے لئے ٹرسٹ میں تبدیلی کر رہے تھے۔ خاندانی وکیل ہمنٹ راو اسی فائل کے لئے آئے تھے۔ اور وہ فائیل دوسری فائلوں کی طرح مسیح کی تحویل میں تھی۔ دراصل مسیح گھر پہنچ کر اصلی فائل کو التمش تک پہنچانے جا رہا تھا

کہ کاکل نے اسکا راستہ کھوما کر دیا۔ کافی انتظار کے بعد بھی جب مسیح نے فائیل نہیں پہنچائی تب ڈور اسے انہیں پتہ چلا کہ بسنے مسیح، کاکل اور بچوں کو سائیکلوں پر جاتے دیکھا تھا۔ آلتمش کا ماتھا ٹھنکا۔ انہوں نے کارلی اور دل میں خدشے لئے روانہ ہو گئے۔ ان کا خدشہ شدید غصے میں اس وقت تبدیل ہو گیا جب انہوں نے کاکل اور مسیح کو ساتھ ساتھ آتے دیکھا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔
ہو نہ!

ایک دن پہلے بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ وہ لائبریری کے درجے میں کھڑے تھے۔ دور سے گیٹ میں داخل ہوتی کار مسیح ڈرائیو کر رہا تھا۔ کاکل کی بے ساختہ ہنسی بتا رہی تھی کہ وہ مسیح سے کافی بے تکلف تھی۔ کاکل کے گلے میں زینو کی بانہیں، شہزاد کا ہاتھ مسیح کے کندھے پر۔ بڑا مانوس خامدانی پیکھتی کا ماحول ہے۔ انہوں نے طنزیہ مسکرا کر سوچا۔ اور پھر یکسر اسے اپنے دماغ سے خارج کر دیا۔ پھر بھی یہ معلوم کرنا نہیں بھولے کہ ڈرائیور چھٹی پر نہیں تھا۔
”آئی ایم سوری کاکل“ مسیح نے اپنی پیشانی پونچھتے ہوئے کہا۔
”غلطی میری بھی تو تھی“ کاکل نے چنگاریاں اگلتی ان آنکھوں کو اپنے تصور سے مٹانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ بچوں کو سائیکلوں پر نیند بھی آسکتی تھی، سائیکلوں کے بریک فیل بھی ہو سکتے تھے۔ مسیح کا راستہ گو ضمیر واقعی اسے ملامت کر رہا تھا۔ اتنا غیر ذمہ دار وہ کیسے ہو گیا۔ وہ کونسی قوت تھی جو اسے صراطِ مستقیم سے ہٹا کر زندگی کے پیچدار زاویوں میں بھٹکانے لگی تھی۔

کاکل نے شکر ادا کیا کہ رات کے کھانے پر التمش مدعو تھے۔ بچوں کے ساتھ لسنے کھانا کھایا۔ کافی عرصہ بعد سائیکنگ کرنے کی وجہ سے اسکی رگ پٹھے اکڑ کر تانت ہو رہے تھے۔ سونے سے پہلے لسنے خوب گرم پانی سے انکی تواضع کی اور اپنے آرامدہ بستر پر دراز ہو گئی۔ یہ سچ تھا کہ غلطی اسکی بھی تھی۔ کوئی سچائی کھل کر سامنے نہیں آتی کیونکہ ہم اپنے مطلب کی سچائی ہی ڈھونڈتے ہیں۔ جیسے خود اپنی پسند کے کپڑے پہنتے ہیں۔ ویسے بھی انسان بہت زیادہ سچائی برداشت نہیں کر پاتا۔ اگر خود اپنی نظریں ملزم ہوں بھی تو اگلے ہی لمحے دماغ بھی خود سنبھال لیتا ہے۔ اسے التمش کا استغصہ بھی بجا لگا۔ بچوں کا بال بھی بانٹا نہیں ہوا تھا۔ دوسرے، انہوں نے ایک پل کے لئے بھی یہ نہیں سوچا کہ خدا نخواستہ سائیکس کھڑ میں گر تیں تو مسیح اور کاکل خود بھی تو اند کو پیارے ہو گئے ہوتے۔

یا انکی خفگی کسی اور وجہ سے تھی لیکن غور کرنے پر بھی وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پائی۔

صبح بالکونی سے اس نے التمش اور مسیح کو گھوڑوں پر باغوں کی طرف جاتے دیکھا۔ موقعہ غنیمت تھا وہ بلا تکلف لائبریری سے کتابیں لاسکتی تھی۔ وہ فی الحال التمش کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ تپہ نہں کس موڈ میں ہوں۔ وہ انکے آنکھوں کی خشمگینی نہیں بھولی تھی۔ لسنے غسل کیا۔ کپڑے بدلے اور چوٹی گوندھ کر لائبریری پہنچی۔ آج اس نے سوچا کہ خود کیلئے نہیں۔ بلکہ بچوں کیلئے کوئی کتاب چھانٹ لائے گی۔ وہ جب بھی لائبریری میں آتی تو وہاں کا مٹھی

سکون جیسے اسے باندھ لیتا تھا۔ آج پہلی چیز جس نے اسکی توجہ مبذول کر لی ایک تصویر تھی جو التمش کے ٹیبل پر کاغذوں اور نقشوں کے ساتھ رکھی جاتی تھی۔ وہ اس تصویر کو بہت اچھی طرح جانتی تھی ایک غضبناک شیر ایک انگریز فوجی کو جھنجھوڑ رہا تھا۔ اس نے یہ تصویر بار بار دیکھی تھی۔ وہ تصویر دراصل لکڑی کے ایک محسے کی تھی جو لندن و کٹوریہ البرٹ میوزیم کے ہندوستانی حصے میں رکھا گیا تھا۔ دو سو سال پرانا یہ مجسمہ آرٹ اور فن کی نازک قدروں کو اجاگر کرنے کی بجائے ایک بھونڈے سے انداز میں ہندوستان کی عظیم ہستی شیر میور شہید ٹیپو سلطان کیلئے حقارت اور اسکے غنیمت و غضب کی نمونہ کو کس حد تک اجاگر کرتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ شیر ٹیپو کا پسندیدہ جانور تھا اور خود اسمیں شیر کی صفات موجود تھیں۔ جنگجو، جیالا، جری، شیر دل ٹیپو کا قول تھا کہ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔

شیر کا شکار ٹیپو کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اسکی ریاست کا سرکاری نشان شیر تھا۔ سلطان کی فوج کی وردیوں میں شیر کی دھاریاں تھیں۔

انگریزوں کے خلاف ایک جنگ میں انگریز کمانڈر سر ہیکٹر مزو نے حیدر علی اور ٹیپو کو شکست دی تھی یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ اسی مزو کے اکلوتے بیٹے کو سندر بن میں ایک شیر اٹھالے گیا تھا۔ اور اسکے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے اور مزو کے خیر خواہ تماشا دیکھتے رہ گئے۔

تاریخ کا کل کا پسندیدہ سبجیکٹ تھا۔ اسے اس بات سے بھی اتفاق تھا

کہ ہر دور میں تاریخ کو مسح کیا جاتا ہے۔ اسکی ایک زندہ مثال وکٹوریہ البرٹ میوزیم میں رکھا ہوا شیر تھا۔ جسے آج بھی کینیہ پرور انگریز ٹیپو کی شخصیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر اپنے ہی ہموطنوں نے اپنے ضمیر بیچ کر ٹیپو سے غداری نہ کی ہوتی تو ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔

کاکل کو اچانک یاد آیا کہ وہ کس مقصد سے لائبریری آئی تھی۔ پھر بھی اس سے رہا نہ گیا۔ اسنے اس تصویر کے حاشئے پر پنسل سے اقبال کا وہ مشہور شعر لکھا۔

جعفر از بنگال صادق ازدکن
 ننگ آدم ننگ دیں ننگ وطن

”میں اپنے کام میں مداخلت پسند نہیں کرتا“۔ آواز آئی اور وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ واقعی التمش کے کاغذات الٹ پلٹ کرتی رہی تھی۔ انہوں نے تصویر پر اسے شعر لکھتے دیکھ لیا تھا۔ اپنی وہاں موجودگی کو جان بوجھ کر کافی دیر تک ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ہو سکتا ہے اسکی وجہ یہ ہو کہ وہ کاکل اور اسکی کارروائی کا مقصد جاننا چاہتے ہوں یا کاکل کا انہماک اور اسکی دلاؤمندی نے انہیں خاموش تماشا بنادیا تھا۔ اسکی ایک شانے پر آگے پڑی چوٹی، اسکے رخساروں پر سے کھیلی بالوں کی لٹ، وہ اب اسکے انداز کے عادی ہوتے جا رہے تھے۔ وہ محویت سے اسے دیکھتے رہے۔ کتنا مختلف تھا اس مشرقی لڑکی کا حسن جیسے گلاب کی پتیوں کو آب زمزم میں گوندھا گیا ہو۔ انہوں نے فوراً اپنے سبک ہوتے ہوئے خیالات کو لگام لگائی۔ اور نپے تلے قدموں سے چلتے میز

تک پہنچے اور سوالیہ نظروں سے اسے گھورنے لگے۔ کاکل کا اندازہ صحیح تھا۔
انکے ماتھے کی سلوٹ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

”کیا لکھ رہی تھیں آپ؟“ ان کے لمبے میں تہدید تھی۔

”میں ----- میں اسے مٹا دیتی ہوں“ کاکل نے اپنی سراسیمگی

چھپانی چاہی۔

”آپ سمجھتی ہیں ہر تحریر مٹائی جاسکتی ہے؟“ وہ تم سے زیادہ رسمی آپ
پر آگئے تھے التمش گھوم کر گئے اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے شعر پڑھا جو کاکل نے
ابھی ابھی لکھا تھا۔

پنسل ہی سے تو لکھا ہے، مٹ جائیگا اتنی دیر میں دو تین گہری
سانسیں لے کر سنے خود میں ہمت جگائی تھی۔ اسکی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ
التمش ذرا سی بات کا بتنگڑ کیوں بنا رہے تھے۔

”تقدیر میں پنسل سے نہیں لکھی جاتیں“ کاکل نے سمجھا جیسے وہ اب
کوئی ایسی بات کہنا چاہتے تھے جو وہ سننا نہیں چاہتی تھی۔

”بیٹھ جائیے“۔ انہوں نے مقابل رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔
”ہندوستان کی تقدیر میں جو غلامی لکھی تھی وہ کوئی نہ مٹا سکا“۔ کاکل نے
اطمینان سے سانس لیا۔

”میں جاؤں؟“ سنے کہا اور جانے لگی۔

”میں نے کہا نا بیٹھ جاو کاکل۔ پلیز“ کاکل نے نظریں اٹھا کر التمش کی
طرف دیکھا۔ انکی آنکھیں سنجیدہ تھیں لیکن ہونٹ مسکراہٹ کو دبانے کی

کوشش میں سکر گئے تھے۔ وہ بادل ناخواستہ مقابل رکھی کر سی پر ٹک گئی۔
یہی کیا کم تھا وہ آپ سے تم پر آگئے تھے۔ یہ نیک فال تھی۔

”تاریخ میں دلچسپی ہے تمہیں؟“

”ایم اے میں میرا سبجکٹ تاریخ تھا“ اس نے گود میں رکھے اپنے
ہاتھوں سے کہا۔

”کس سال کیا تم نے ایم اے؟“ انہوں نے پیپر ویٹ سے کھیلے
ہوئے کہا۔

”مکمل نہیں کر پائی“

”کیوں؟“

”چھوڑنا پڑا۔ حالات ہی کچھ ایسے تھے۔“ اسنے سامنے رکھی کتاب پر
نظریں جمائے تاسف سے کہا۔

”اچھا!۔۔۔ میں نے سمجھا تھا خوبصورت لڑکیاں حالات کی تابع نہیں
ہوتیں“ وہ مسکرا رہے تھے۔ وہی پاگل کر دینے والی مسکراہٹ جو کاکل کو
تشدد پر آمادہ کر دیتی تھی۔

”جب لڑکیوں سے زیادہ مضبوط اور طاقتور مرد حالات کے تابع
ہو جاتے ہیں تو لڑکیاں کیوں نہیں ہو سکتیں؟“ کاکل کو مسیح نے بتایا تھا کہ۔
التمش کو مجبوراً ہندوستان سے واپس چلے جانے والا ارادہ بدلنا پڑا تھا۔

اگر انہوں نے کاکل کے تیز دھار کی طرح کے جواب کو سنا بھی تو ان
سنی کر گئے۔

”تم نے میرے کاغذات کا معائنہ تو کر ہی لیا ہے“ انہوں نے اس کے تجسس پر الزام رکھا۔ ”اس ریسرچ میں اگر پسند کرو تو میری مدد کر سکتی ہوں“ یہ جملہ انہوں نے ایسے کہا جیسے وہ طے شدہ امر تھا۔ کاکل نے عجلت میں سوچا کہ انکار کر دے۔ لیکن التمش کے اس آفر میں اسے خود اپنی دلچسپی کا سامان نظر آیا۔

اس نے سمجھا بات ختم ہوئی اور اٹھ کر جانے لگی۔

”تم یہاں شاید کسی کتاب کی تلاش میں آئی تھیں“۔ التمش نے اسے جاتے دیکھ کر کہا۔ ”یا صرف تجسس تھا جو تمہیں یہاں کھینچ لایا تھا؟“ کاکل نے چونک کر انکی طرف دیکھا۔ یہ بات انہوں نے بالکل کاکل کو نجل کرنے کے لئے کہی تھی کیونکہ انکے لبوں پر دبی دبی مسکراہٹ تھی۔ بات ویسے سچ تھی کیونکہ وہ بھول ہی گئی تھی کہ وہ وہاں کس مقصد سے آئی تھی۔

”مجھے HANS CHRISTIAN ANDERSON کی ضرورت تھی۔“

”لڑکیاں بھی عجیب عجیب فرمائش کرتی ہیں“ التمش اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولے ”مجھے افسوس ہے کہ میں اس ولندیزی ادیب کو تمہارے حضور میں حاضر نہیں کر سکتا کیونکہ وہ ۱۸۷۵ میں مر چکا ہے۔“

”میں۔۔۔۔۔ میرا مطلب بچوں کیلئے لکھی کتاب۔۔۔۔۔“

”۔۔۔۔۔ یہ رہی“ التمش نے الماری سے خوبصورت جلد والی کتاب نکالتے ہوئے کہا

کھول کر کچھ نکال رہے تھے۔ ”یہ لیتی جاو“

”یہ۔۔۔ کیا ہے؟“ کاکل نے براؤن رنگ کے لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔

”یہ وہ چیز ہے جس کے لئے لوگ بڑے بڑے جوئے کھیلتے ہیں۔“ کیا انکے لمبے میں تلخی تھی؟ کاکل طے نہ کر پائی۔ اس نے لفافہ کھولا۔ اس میں بینک کی چک بک اور پاس بک تھے۔ اسکی سمجھ میں نہیں آیا کہ الٹمش کو کیا کہے۔

”میں نے تمہارا ذاتی اکاؤنٹ کھلوا دیا ہے۔ تم جیسے چاہو اپنا پیسہ خرچ کر سکتی ہو۔“

”میں۔۔۔ میں استنا پیسہ لے کر کیا کرونگی؟“ کاکل نے پاس بک میں کافی بڑی رقم جمع دیکھ کر کہا۔

”پیسہ آپ اپنا استعمال سکھا دیتا ہے۔ فی الحال اپنے لئے کچھ اچھے لباس بنوالیں“

الٹمش نے کہا اور بظاہر کام میں مشغول ہو گئے۔ وہ شاید کاکل کے چہرے کا وہ تاثر بھولے نہیں تھے۔ جب گیسٹ ہاؤس میں اپنے لباس کو جگہ جگہ سے پھٹا دیکھ کر اسکے چہرے پر آیا تھا۔ اسکے پاس کل دو ہی تو اچھے ڈریس تھے۔ کاکل غیر محسوس طور پر کوٹھی کی روزمرہ زندگی کا ایک حصہ بنتی جا رہی تھی۔ حالانکہ اس نے طے کر لیا تھا کہ صرف اپنے کام سے کام رکھے گی۔ لیکن کونسا کام اسکا تھا اور کونسا پر ایسا یہ طے کرنا مشکل تھا۔ ڈورا کا برتاؤ جو

مخاصمت سے شروع ہوا تھا دوستانہ اور اب کافی حد تک عاجزانہ ہو گیا تھا۔ اسکے جوڑوں کی مسلسل تکلیف، کاکل کا ہمدردانہ برتاؤ اور ان سب سے زیادہ خود اسکی چھٹی رحس، جس نے بتایا تھا کہ اسکا بیٹا مسیح اپنی تمام تر احتیاط کے باوجود اس خوبصورت لڑکی کی کشش سے بے بہرہ نہیں تھا۔ اسے اور بھی یقین اسوقت ہوا جب اپنی مصروفیت کے باوجود کاکل مسیح کیلئے پل اور بنانے لگی۔

”کس کا سویٹر بناتا ہے یہی؟“ ڈورانے اسی کی بنائی ٹوکری میں جو اس نے کاکل کو تحفہ دے دی تھی، مسیح کا نام لے کر پوچھا۔

”مسیح کا ہے ڈورا“ کاکل نے شہزاد کے کوٹ کو برش کرتے ہوئے جواب دیا۔

”بھوت اچھا ہے۔ کب پورا ہو جائیگا؟ ڈورا کی آنکھوں کی چمک کئی گنا بڑھ گئی۔

”تمہارے لئے بھی بنا دوں گی“ کاکل نے شہزاد کی کمر پر دھپ لگا کر ہٹایا اور زینو کے بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔

”ہم کیا کرے گا؟“ ڈورانے پیار سے تھپک کر سویٹر ٹوکری میں رکھا۔ ”ہم ٹوڈا لوگ تو بس یہ پہنتا ہے“ لسنے اپنے سات گز کی چادر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”یا ٹھنڈی لگے تو شال“

”لیکن تم تو کرچن ہو۔“

”مگر کم تو وہی ہونا“ کاکل کو ایسے لگا جیسے اس وقت بھی

ڈورا کو اپنے ٹوڈا ہونے پر فخر تھا۔

”بی بی آج ہم کو بستی جانا ہے“ سننے کچھ جھجک کر کہا۔ ”رات کو اُدر

ہی رہینگا“

”کاکل کو اسکی شرمساری سمجھ میں نہ آئی۔ سننے ڈورا کو سوالیہ نظروں

سے دیکھا۔ ”ضرور جاو ڈورا“۔ اب تک ڈورا سے بتائے بنا ہی چلی جایا کرتی

تھی۔

”اور تم کو بھوت کام ہو گیا“ ڈورا نے کہا۔ جیسے یہ کوئی نئی بات تھی

ولیسے ہی وہ زیادہ تر اپنی کھٹیا میں پریشان دھوپ سینکتی پڑی رہتی یا پہاڑوں

میں جا کر اپنے علاج کے لئے جڑی بوٹیاں لے آتی۔ التمش کے لاکھ سمجھانے پر

بھی وہ ڈاکٹری علاج کی قائل نہیں ہوتی۔ جڑی بوٹیوں سے اسکا روگ عارضی

طور پر کم تو ہو جاتا تھا۔ لیکن پھر وہی تکلیف ادھر کچھ دنوں سے اسکے ٹوڈا بستی

کے دورے بھی بڑھ گئے تھے۔

”آج کھانسا ماں بھی گیا ہے“۔ ڈورا نے جاتے جاتے شوشہ چھوڑا۔

”اسکا دوسرا بی بی کے گھر میں نیاز ہے“ کاکل نے ٹھنڈی سانس بھر کر

دروازے کی طرف دیکھا جس سے ڈورا ابھی ابھی باہر گئی تھی۔ اسکا مطلب

تھا آج کھانا بھی اسے ہی بنانا تھا۔ کوئی ایسی بڑی بات بھی نہیں تھی۔ التمش

کے ٹیبل پر لسنے ڈپارٹمنٹ آف ٹورزم کا دعوت نامہ دیکھا تھا۔ صرف وہ اور

بچے ہونگے۔ ارھر کی پتلی کچڑی سے کام چل جائے گا جو شہزاد اور زمینو بھی شوق

سے کھاتے تھے۔

مقررہ وقت پر وہ لائبریری پہنچی التمش گویا اسکے منتظر ہی تھے۔ انہوں نے کتابوں کی ایک فہرست اسے پکڑادی۔ ان میں کافی کتابیں خود انکی لائبریری میں موجود تھیں چند ایک کیلئے بیرونی ممالک کو خط لکھنے تھے۔ اس جگہ کاکل کی ٹاپنگ کی ادھوری ٹریننگ کام آئی۔ سبکٹ بھی چونکہ اسکا پسندیدہ تھا۔ وہ بہت جلد التمش کے کام کرنے کے ڈھنگ کو سمجھ گئی۔

”یورپ سے جو قومیں ہندوستان آئیں ان میں پرتگالی اور فرانسیسی اتنے کامیاب نہیں ہوئے جتنے انگریز“ التمش نے بحث طلب نظروں سے کاکل کو دیکھا۔

”انگریزوں نے ہماری ہی کمزوری سے فائدہ اٹھایا۔ راجاؤں اور نوابوں کو اکسا کر مال و زر کے بدلے میں انہیں اپنی فوجیں دیں۔ کاکل نے کہا۔ ”جب کہ فرانسیسی انگریزوں ہی سے شمالی افریقہ میں الجھے ہوئے تھے۔“ ”غداروں کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ التمش نے ہاتھ سے قلم رکھ کر کرسی سے ٹیک لگالی۔ ”ذرا سنبھل کر جواب دیجئے گا کیونکہ اس میں آپ کے آبا و اجداد بھی شامل ہیں۔“ کاکل انکی چھپر پر مسکرا دی۔

”آپ کا مطلب نظام علی خان آصف جاہ دوم سے ہے؟ بھلا وہ میرے آبا و اجداد کیوں ہونے لگے؟۔ ویسے ٹیپو سلطان سے وعدہ خلافی اور بے وفائی کی سازش میں مرہٹے بھی تو پیش پیش تھے۔ اور جناب آصف جاہ دوم کے والد کا تعلق شمالی ہند سے تھا۔ انہیں دکن کا صوبیدار بنا کر بھیجا گیا تھا۔ ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے مغلیہ حکومت سے غداری کی اور خود مختاری کا

سے نکالی کتابوں کو الٹ پلٹ کر کہا۔ لیکن یہ زیادہ تر بیرونی مورخوں کی لکھی ہوئی ہیں اور انہوں نے ٹیپو سلطان کے ساتھ انصاف نہیں کیا؟۔

ٹیپو سلطان کی موت کے بعد بھی برسوں تک انگریز ٹیپو سے خائف رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تاریخ میں ٹیپو کے بارے میں بہت سی ایسی ویسی باتیں لکھی گئی تھیں۔ تاریخ داں اور آرکیالوجسٹ ہونے کے ناطے التمش کی نظر سے سلطان کے بارے میں اس طرح کے مونو گراف اور مضامین گذرے تھے جن میں سلطان کے کردار کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ کاکل سے متفق تھے۔ جہاں ایک طرف وہ فرانس سے متعلق پیرس کے سیمینار میں لئے گئے فیصلوں پر فرانسیسی ٹیم کی مدد کر رہے تھے تو دوسری طرف وہ ٹیپو سلطان کی زندگی اور اسکے کردار کی چھان بین کر رہے تھے۔ لیکن تاریخ کی کتابوں میں مورخین کے اتنے متضاد بیان ہوتے ہیں کہ کس کے بیان کو صحیح اور کس کو غلط سمجھا جائے طے کرنا مشکل ہوتا ہے اور یہیں آرکیالوجیکل دستاویزات کام آتی ہیں جو کسی حد تک مشعل راہ ہوتی ہیں

”پھر بھی کوئی دستاویز اتنی گہرائی میں نہیں جاتی کہ فتح و شکست کے وقت انسانی جذبات کی ترجمانی کر سکے“ التمش بغور کاکل کو سنتے رہے۔ ”کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ واجد علی شاہ کے دل و دماغ کی کیا حالت ہوگی جب انگریزی فوجوں کا قبضہ لکھنؤ پر ہو گیا؟ کنیزیں ہاتھ جوڑ جوڑ کر جان عالم سے التجا کر رہیں تھیں کہ ”نکس چلو جنیا ہمار کہا مانو“۔ وہ بار بار اپنی گستاخ لٹ کو کان کے پیچھے کئے جا رہی تھی اور التمش اسکے خاموش تماشا بنی تھے۔“ کیونکہ

ایک بادشاہ جب اپنی سلطنت ہارتا ہو تو وہ محض ایک زمین کا ٹکڑا نہیں ہارتا بلکہ اپنی رعایا کا غرور خورداری، جذبات اور احساسات بھی ہارتا ہے جس کا وہ امام ہوتا ہے۔ محافظ ہوتا ہے۔“

التمش نے پانی کا گلاس خاموشی سے کاکل کی طرف کھسکا دیا۔ دل میں وہ مطمئن تھے کہ کاکل کو اپنے کام میں شامل کر کے انہوں نے غلطی نہیں کی تھی۔

”معاف کیجئے۔ میں بہہ گئی تھی۔“ اسے اچانک احساس ہوا کہ لسنے اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔

”بہتے دریا ہی بنجر زمینوں کو سیراب کرتے ہیں۔“ التمش بولے۔
 ”لیکن۔۔۔۔۔ آپ کو دیر ہو گئی ہے“ اس نے گھڑی دیکھ کر کہا ”ڈنر میں نہیں جلیئے گا؟“

”نہیں ارادہ نہیں ہے“ وہ بولے

یعنی اس کا مطلب تھا کہ التمش کی قسمت میں بھی وہی ارہر کی پتلی کھجری لکھی تھی۔

وہ شہزاد اور زینو کو لینے کیلئے نرسری گئی تو وہاں ایک غدر مچا ہوا تھا۔ کمرے کی ہر چیز وہیں تھی جہاں اسے نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ کرسیاں الٹی ہوئی۔ بستر ادھر لے ہوئے۔ شہزاد اور زینو رنگین چاک سے چہرے رنگے ہوئے ریڈ انڈین اور بحری قزاق بنے ہوئے تھے۔ کاکل ایک کو پکڑنے جاتی تو دوسرا بھاگ نکلتا۔ وہ ہانپ گئی دور بے بسی سے ہنستی ہوئی کھڑی ہو گئی اور اس کی نظر

دروازے میں ٹیک لگائے سینے پر ہاتھ باندھے التمش پر گئی۔ وہ ساری کارروائی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔

"Damsel in distress" انہوں نے کہا اور ایک ہی چھلانگ میں زینو کو دیوچ لیا ادھر کاکل نے شہزاد پر فتح پالی۔ جائے فرار مسدود دیکھ کر زینو اور شہزاد نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس موقع پر التمش کی مدد بہت کام آئی ورنہ دونوں کا موڈ تانڈور قص کا ہو رہا تھا۔

التمش اور اسنے دونوں کے منہ دھلائے اور شب خوابی کے کپڑے پہنا دیئے۔ جس مہارت سے التمش اسکی مدد کر رہے تھے اسے دیکھ کر کاکل کو تعجب ہوا۔

"کتنے بچے تھے آپ کے کرتب میں؟" بے اختیار اسکے منہ سے نکلا اور بالکل اسی لمحے میں جیسے التمش نے اس سے پہلی ملاقات میں پوچھا تھا۔
 پل بھر کو وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر ہنس پڑے۔
 "میں چل کر ٹیبل لگاتی ہوں" کاکل ڈاننگ ہال کی طرف چلی۔
 "نہیں آج کچن ہی میں کھانا کھایا جائے گا" التمش نے اسے روکا اور زینو کو اپنی پشت پر سوار کر لیا۔ شہزاد کاکل کے کندھوں سے چمٹ گیا۔

کچن کے سیاہ آبنوسی ٹیبل پر دودھ کا گلاس، پھل اور مکھن رکھے گئے۔ روشنی کے ہالے میں بیٹھے التمش نے بچوں کے گلے میں نیپکین لگائے تب تک کاکل نے کچڑی گرم کی۔ کچن میں انکے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے التمش بچوں کو انوکھے لگے۔ وہ چاروں اسوقت ایک مکمل فیملی تصویر تھے۔ بے لاگ،

نار مل، ہنستے بولتے

”تامش“ شہزاد بولا ”جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو کاکل سے شادی کروں گا“

”میں بھی“ زمینو نے ہمیشہ کی طرح شہزاد کا ساتھ دیا۔

”لو بھئی سو نمبر میں اپنا تو چانس گیا“ التمش بولے کاکل نے ہنس کر

زمینو کے منہ میں کھڑی بھراچھ ٹھونس دیا۔

کاکل جانتی تھی یہ ہنستے مسکراتے لمحے عارضی تھے۔ کل وہ پھر اپنا کاروباری لبادہ پہننے لگی انکی آنکھوں میں اجنبیت آجائیگی۔ لیکن پھول بھی تو چند لمحوں کیلئے ہی کھلتے ہیں۔ پھر بھی اپنی تازگی اپنی نگہت بانٹ جاتے ہیں۔ ایسے میں کوئی قنوطی ہی سوچ سکتا ہے کہ کل کو یہ مرجھا جائینگے۔ انکی پتیاں بکھر جائینگی۔ کاکل بھی ان مہکتے لمحوں کو اپنے دل کے کسی گوشے میں بسالینا چاہتی تھی۔ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئی تو سامنے ہی قد آدم آئینے میں خود کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ کیا یہ وہی لڑکی تھی جو کبھی اپنے مستقبل کی فکر میں ہراساں تھی؟ کہاں تھیں وہ آنکھیں؟ وہ فکر مند آنکھیں جن پر خود انکی پلکیں بوجھ بن رہی تھیں؟ وہ چمپی رنگت جو اندرونی غیر یقینی ہونے کی وجہ سے ٹیالی ہونے لگی تھی؟ اب وہاں جو لڑکی کھڑی تھی وہ شبنم سے دھلے گلاب کی طرح تھی جس کی آنکھوں میں خواب سے محل رہے تھے۔ حیران ادھ کھلے لبوں سے آبدار ہتھیلی جھلک رہی تھی۔ ٹٹکی لگائے آئینے میں دیکھتی آنکھوں نے ایک خواب بنا۔ اسے ایسا لگا جیسے اچانک کسی نے اسے دہن کی طرح سنوار دیا۔ سرخ قیمتی جوڑا، ہاتھوں میں مہندی، سرماتھے تک ڈوپٹے میں

چھپا، کپکپاتے ہونٹ اور سر گئیں بوجھل آنکھیں۔ لسنے ہاتھ اٹھا کر اپنے
 رخسار کو چھوا تو چوڑیوں کی چھنک اسے صاف سنائی دی۔ لیکن وہاں کچھ
 ایک اور عکس تھا۔ وجہہ خوبصورت دہانے والا جو مسکرا رہا تھا۔ زرین
 اچکن اور برہنہ سر۔ وہ اسے متعجب نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جو رفتہ رفتہ
 وارفتگی میں بدل گئی تھیں۔ اس کے خوبصورت خمیدہ بال کہیں کہیں سنہری
 جھلک لئے ہوئے تھے۔ اس کی خاموشی نظریں اس سے بہت کچھ کہہ رہی تھیں
 جس کا ایک ایک لفظ کامل کا دھڑکتا دل سن رہا تھا۔ وہ اب تک خود سپردگی
 کے اس احساس سے کبھی دوچار نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہیولا اس کے بالکل
 قریب کھڑا تھا۔ وہ اس کی گرم سانسوں کو خوب پہچانتی تھی۔ وہ پراسرار چمک
 اس کی جانی مانی تھی۔ ایسے لگا جیسے وہ مضبوط بانہیں ان لمبی انگلیوں والے
 ہاتھوں نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا جذبات کا جوش کھاتا سمندر اسے تنکے
 کی طرح بہالے گیا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور لسنے اپنا سر اپنے خیالی
 ہیولے کے سنگلاخ سینے سے ٹکا دیا۔ وہ کچھ دیر اور ان بانہوں کے گھیرے میں
 پرسکون لمحے گزارنا چاہتی تھی جو اسکے لئے دائمی بن جاتے۔ اس ہاتھ نے جس
 کا لمس بہت سبک تھا۔ اس کی تھوڑی اونچی کی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔
 اور اسکے ساتھ ہی اسکے خوابوں کا وہ محل مسمار ہو گیا کیونکہ وہ خوابوں کا محل
 نہیں تھا جو اسکے جذبات کے بیجانی سمندر سے بیش بہا موتی بن کر ابھرا بلکہ وہ
 واقعی التمش تھے جو اس کی تھوڑی اونچی کئے اپنی اتھاہ گہری سیاہ آنکھوں سے اس کی
 حیران آنکھوں میں تعجب سے کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے تھے۔

کاکل نے پلٹ کر انکے سراپے کو دیکھا۔ اور پھر

خود کو نظروں سے ٹٹولا۔ کہاں تھا وہ دلہنوں والا سرخ زرین جوڑا جسکا پر تو رخساروں کو رنگین کر رہا تھا۔ وہ کنگن وہ جھومر، گلے کی وہ چنٹا وہ ست لڑا، وہ پہنچیاں، ہیرے زمرہ کی انگوٹھیاں اور التمش نے بھی زرین اچکن نہیں پہنی تھی۔ وہ تو اسی نیلی قمیص میں تھے جس میں ابھی ابھی اسکے ساتھ پنچوں کو سلا کر گئے تھے۔ گہری نیلی قمیص کے کھلے بٹن سے مضبوط گردن عیاں تھی۔ جسکی رگ میں موہوم سی پھڑک تھی۔

دیکھتے دیکھتے انکے ہونٹوں کے کنارے جھک گئے اور وہی مسکراہٹ جس نے کاکل کے ہر احساس کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اسے ایسا لگا جیسے اسنے بجلی کے زندہ تار کو چھو لیا ہو۔ اسنے اپنے ہاتھ انکے بازوؤں سے ہٹالئے اور ایک قدم پیچھے ہٹی۔ التمش سے اسکی نظریں ملیں اور وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ اس نے بعجلت خود کو غسل خانے میں بند کر لیا اور دروازے سے سرٹکا کر کھڑی ہو گئی لیکن دروازہ بند کرنے سے پہلے اسنے التمش کا دبا دبا سا قہقہہ ضرور سن لیا جو ایک فاتح کا قہقہہ ہو سکتا تھا۔

وہ پسینے میں شرابور تھی۔ اسکا سارا جسم بید کی طرح کانپ رہا تھا۔ اور رونے کے باوجود آنکھیں بالکل خشک تھیں جیسے کسی نے ان دونوں آنکھوں میں الاو جلادئے ہوں۔ اسکا دل چاہا کہ دروازے سے اپنا سر دے مارے لیکن وہ یوں ہی پھٹنے لگا تھا۔ اسنے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور وہیں بیٹھ گئی۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ ہاتھ روم سے لگے آئینے میں

خود سے آنکھ ملا سکتی۔ شرمندگی پشیمانی، خجالت، غصہ بے بسی، وہاں کیا نہیں تھا جو اسے کچوکے لگا رہا تھا۔ کیا ہو گیا تھا اسے؟ کیسے بہہ گئی تھی وہ اپنے جذبات کی رو میں؟ ایک بات مسلم تھی۔ اس نے ہمیشہ کے لئے خود کو التمش کی نظروں سے گرا لیا تھا۔ کیا سوچ رہے ہونگے وہ؟ اس نے اپنے دہکتے رخساروں کو ہاتھوں کے کٹوروں میں تھام لیا۔ انکا قہقہہ بتاتا تھا کہ وہ اسے بھی ایک خام، رومان زدہ، سستی ناولوں میں بسنے والی چھو کری سمجھ رہے تھے کسی گرم سینے کی مستلشی، جس پر سر رکھ کر موم بن جائے پگھل جائے۔ وہ ایسی موم تو کبھی نہیں تھی۔ اس دامن کو آج کس چنگاری نے چھو لیا تھا جسے اس نے ہمیشہ مہمل سمجھا تھا۔ کیا یہ وہی چنگاری تھی جسے اس نے ہمیشہ حقارت سے محض جگنو کی بے ضرر چمک سمجھا تھا۔ محبت سے منکر خود پسندوں کا یہی حشر ہوتا ہے۔ وہ خود اپنی نظروں میں خطا کار ہوتے ہیں پھر بھی کوئی سزا خود کے لئے تجویز نہیں کر پاتے لیکن یک طرفہ محبت ناکرہ گناہ کی سب سے بڑی سزا ہے۔

کاکل نے اٹھ کر منہ دھویا اور بغیر لباس تبدیل کئے بستر پر آگری پہلی بار اسکے آنسو بہ نکلے جو تکیے میں جذب ہوتے رہے۔ تکیہ دل کے ماروں کا سب سے بڑا ازدان ہے۔ غمخوار ہے جو رات کے اندھیرے میں کئی داستانیں سمیٹ لیتا ہے۔ لب مہر بند جیسے کسی گونگے نے خواب دیکھا جسے وہ کسی کو سنا نہیں سکتا۔

لیکن التمش وہاں بذاتِ خود پہنچے کیسے تھے؟ شہزاد اور زمین کو سلانے

کے بعد وہ دونوں اپنی اپنی راہ نکل گئے تھے۔ کاکل اپنے کمرے میں اور التمش جانے کہاں؟ ضرور لائبریری گئے ہونگے کیونکہ وہ استنا جلد سونے کے عادی نہیں تھے اور واقعہ بھی یہی تھا جب وہ لائبریری پہنچے تو انکی نظر کتابوں کے اس بنڈل پر پڑی جو انہوں نے کاکل کے لئے منگوادی تھیں۔ وہ لئے پاؤں بنڈل لئے پہنچے کہ کاکل کو دیدیں۔ کاکل کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ انہوں نے تھپتھانے کیلئے ہاتھ اٹھایا لیکن اسی وقت انہوں نے کاکل کا عکس شیشے میں دیکھا جو کھوئی کھوئی سے خود کو آئینے میں تکے جا رہی تھی۔ وہ دبے پاؤں آگے بڑھے، بنڈل نیچے رکھ دیا اور کاکل کی محویت کو دلچسپی سے دیکھتے رہے۔ اور نتیجہ اس وقت کاکل کے سامنے تھا۔ اسکا دل چاہ رہا تھا کہ خود کو کہیں اس طرح گم کر دے کہ پھر کبھی التمش سے آنکھیں چار کرنے کا خطرہ نہ ہو۔ کیونکہ ہمت وہ اب خود میں نہیں پا رہی تھی کاکل نے چاہا تھا کہ وہ زمین کی آخری حد تک پہنچ جائے تاکہ التمش سے آنکھیں چار نہ کرنا پڑیں کیونکہ اس میں تاب نہیں تھی کہ ان آنکھوں میں تمسخر اور مضحکہ دیکھے لیکن اللہ نے زمین بھی تو گول بنائی ہے۔ گھوم پھر کر انسان وہیں پہنچ جاتا ہے جہاں سے چلا تھا۔ چند قوسیں، چند زاوے زندگی انہیں کا تو مرکب ہے تاحیات انکا حساب جوڑتے رہو پھر بھی یہی چند لکیریں نئے مسائل کھڑا کر دیتی ہیں۔ شائد زندگی اسی کا نام ہے

کاکل کا خوف بے بنیاد تھا۔ کیونکہ جب وہ سٹیڈی میں پہنچی تو التمش اپنے کام میں مہمک تھے۔ بجز ایک سرسری نظر کے جو اسکی آہٹ پر اٹھی انہوں نے اسکا کوئی نوٹس نہیں لیا۔

”شہزاد اور زمینوں کو کتنے دنوں کے لئے لے جائیگا؟“ التمش کچھ دنوں سے بچوں کو ایک بھرپور آؤٹنگ دینا چاہتے تھے۔ میوور کا مشہور عام دسہرہ اس کام کیلئے عین مناسب تھا۔ کیونکہ ٹیپو سلطان کے متعلق ریسرچ کا کام بھی اسی خطے میں تھا۔

التمش نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”یعنی مجھ سے یہ امید کی جارہی ہے کہ دسہرے کے ہنگامے میں میں دو پٹانے دونوں ہاتھوں میں تھامے ہو بچ جاؤں؟“

کاکل ان کے دونوں اٹھے ہاتھ اور چہرے پر لائی پریشانی دیکھ کر ہنس پڑی۔

NO Way ”کاکل جہاں، تمہیں بھی چلنا ہوگا“ انہوں نے صاف صاف کہا اور کاکل کچھ سوچ میں پڑ گئی۔

”کیا بات؟ کوئی اعتراض؟“ ان کی تیوری چرٹھ گئی۔

”نہیں نہیں کوئی اعتراض نہیں“ کاکل نے جلدی سے بات بنائی۔ ”میں نے سوچا کچھ وقت مل جائے تو آپ کی ریسرچ کے سلسلہ میں جو نوٹس میں نے مختلف کاغذوں پر تیار کئے انہیں اکٹھا کر لوں۔“

”مس کاکل حسین، آپ کا پہلا فرض شہزاد اور زمینوں ہیں۔ چاہے وہ کتنے ہی گردن زدنی کیوں نہ ہوں۔“ التمش نے اسے اس کا فرض یاد دلایا۔

وہ چشم زدنی میں اپنا موڈ بدل لیتے تھے۔ اپنے لہجے پر زبردست اختیار حاصل تھا انہیں۔ کاکل کا دل چاہا کہ وہ سارے کاغذات۔ دو من وزنی

کتابوں سمیت ان کے مغرور سر پر دے مارے۔ اور لائبریری سے نکل جائے
لیکن فرق ہوتا ہے سوچنے اور کر جانے میں۔

لیکن التمش کے نارمل برتاؤ نے اسے بڑی ہمت دے دی تھی۔
دلولے اور جذبات کی جس آندھی نے آئینے کے سامنے اسے مبہوت کر دیا تھا
وہ بالکل اس کی داخلی کیفیت تھی جس سے التمش یکسر بے بہرہ تھے۔ اس نے
خود کو یقین دلایا۔ کیا پتہ وہ اسی وقت پہنچے ہوں جب وہ پلٹی تھی اس نے
کئی زاویوں سے حالات کا جائزہ لیا اور مطمئن ہو گئی۔ اسے اپنے دل پر سے
ایک بوجھ سا اٹھتا محسوس ہوا۔ کیا ہوتا جو وہ سب کچھ سچ ہوتا؟ یہ سوچ کر ہی
وہ کانپ گئی۔ اس بار وہ بال بال بچ گئی تھی۔ آگے اسے محتاط رہنا ہوگا۔ اسی
میں اسکی خیریت ہے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنے ذہن کو بھٹکنے نہ
دے ویسے اب اس کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ اس نے رفتہ رفتہ اپنی
مصروفیت اتنی بڑھالی تھی کہ فالتو باتوں کے لئے اس کے پاس وقت نہیں تھا
وہ نادانستہ ہی کوٹھی اور باغات کے معاملے میں دلچسپی لینے لگی تھی جیسے شروع
ہی سے اس ماحول کا حصہ رہی ہو۔ لیکن وہ اپنے ماضی سے بھی شرمسار نہیں
تھی۔ یہی کیا کم تھا کہ وہ نامساعد حالات میں تنہا بھری دنیا کا مقابلہ کرنے
کے لئے نکل آئی تھی؟ اب یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ خود کو خوابوں کے حوالے
کر دے؟ وہ بھی ایسے خوابوں کے کہ جن کی تعبیر کے بارے میں اسے یقین تھا
کہ صد فیصد الٹی ہوگی۔ عورت اور مرد کے تعلقات کی حد تک اس نے صرف
اپنے ماں باپ کو دیکھا تھا۔ اس کا یہ محدود تجربہ بھی خوشگوار نہیں تھا۔ اور

اب التمش کا نظریہ بھی عورت کے بارے میں کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی یہ امر مسلمہ تھا کہ انہیں اپنی مرحوم ماں اور بہن سے دلی لگاؤ تھا۔ لیکن ان رشتوں کے آگے وہ عورت کو محض ایک دلچسپی کا سامان سمجھتے تھے۔ جس کی طرف مسیح نے بھی بند بند الفاظ میں اسے خبردار کیا تھا۔ التمش کی شخصیت ہی ایسی تھی کہ لوگ اور خاص کر عورتیں ان کی طرف کھینچی چلی آتی تھیں۔ شائد انہیں اپنی اس کشش کا احساس بھی تھا جسے بڑی کامیابی سے وہ اپنی موبوم مسکراہٹ کے پچھے چھپا جاتے تھے۔ ہو سکتا ہے یہ ان کی فتوحات کا احساس تھا جو مسکراہٹ بن کر ان کے لبوں کے کنارے سے جھک جاتا تھا۔ کاکل انکی مقناطیسییت کھیڑا کے موقع پر دیکھ چکی تھی جب نئی بیاہتا لڑکی کی نظر بار بار التمش کی طرف مبذول ہو رہی تھی جسے اس کے شوہر نے تاڑ لیا اور اسے لئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

ایک اور موقع پر جب مسیح بنگلور گیا ہوا تھا التمش نے کسی سمینار میں کاکل کو بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی تھی۔ کاکل کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ غیر ممالک کے لوگ اپنے سمیناروں اور جلسوں میں کس دلچسپی سے شامل ہوتے ہیں۔ باہر سے آئے ہوئے وفود میں چند ایک کافی بزرگ عورتوں اور مردوں کی موجودگی اس کی شاہد تھی۔

بل کھائے اوپر جاتی سیزھیوں کے پائیدان پر ایک ضعیف خاتون سیزھی پر پہلا قدم رکھتے ہنچا رہی تھیں۔

”کیا تم ایک بوڑھی عورت کو اوپر چڑھنے میں مدد دو گے؟“ انہوں

نے اپنے عین چٹھے کھڑے التمش سے درخواست کی۔ اس سے پہلے کہ اس خاتون کا جملہ پورا ہوتا التمش نے اپنا بازو پیش کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ دھیرے دھیرے سیدھیاں چڑھتے ہوئے وہ اس کے ملک اور سمیناروں کے دلچسپ پہلوؤں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ آخری سیدھی پر انہوں نے اس عورت کو چھوڑا۔ اس کا شکریہ قبول کیا لیکن بظاہر حیرت سے مدھر اُدھر دیکھ کر پوچھا ”آپ نے کہا تھا کسی ضعیف عورت کی مدد کہاں ہے وہ؟“

کاکل کو ان کی یہ ادا بہت پسند آئی۔ ہمارے اپنے ملک میں عام طور پر لوگوں کو بڑھاپے سے پہلے ہی بڑی بے دردی سے انکی بزرگی اور اس سے پیدا ہوئی لاچاری کا احساس دلا کر دلا کر ادھ موا کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اچھے بھلے طاقتور بوڑھے غیر ضروری ہمدردی کا ناجائز فائدہ اٹھا کر ”پیر تسمہ پا“ بن جاتے ہیں۔

اس خوبصورت ریاکاری کے لئے وہ التمش کو کس طرح مورد الزام

ٹہراتی؟

جب التمش اپنا مقالہ پڑھ رہے تھے تو کاکل نے دیکھا کہ التمش کو دیکھتے ہوئے اس بزرگ خاتون کی نظروں میں گر مجوشی اور مادرانہ شفقت تھی جیسے وہ عرصہ سے انہیں جانتی ہوں۔

چند ایسی نگاہیں بھی تھیں جو مقالے سے زیادہ التمش میں دلچسپی لے رہی تھیں۔ ان خواتین کو نفسِ مضمون سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ پھر بھی وہ وہاں موجود تھیں کیونکہ ایسے ہی موقعوں پر ذی حیثیت پڑھے لکھے بر بھی تلاش

التمش کی محدود جانکاری پر افسوس تھا۔

Oh ! come on Mummy بیٹی نے منکسر مزاجی سے کام

لیا۔

کاکل کو تخیل ہی میں التمش "فیشن پریڈ" پڑھتے ہوئے بڑے انوکھے

لگے۔

"یہاں تو بات نہیں ہو سکتی" لڑکی نے ناز و انداز سے گردن ایک طرف کو موڑ کر اپنے خوبصورت بالوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہا "میں کب آسکتی ہوں آپ کے گھر؟۔ اس موقع پر التمش نے ایک عجیب حرکت کی۔ انہوں نے ایک طرف کو کھڑی ہوئی کاکل کی کلائی پکڑ کر اپنے قریب کیا اور اسے اپنے ایک بازو کے گھیرے میں لیتے ہوئے کہا "جب بھی آپ چاہیں"

ابھی تو وہ فی الحال مصروف ہے "اماں نے کھسیا کر کہا اور بیٹی کو لئے آگے بڑھ گئیں۔ ایک فوٹو گرافر نے بڑھ کر ان دونوں کی تصویر کھینچ لی۔ اسے التمش کی کسی لڑکی کے ساتھ تصویر چاہیے تھی۔

"یہ تم الگ کیوں کھڑی تھیں" انہوں نے اپنا بازو اسی طرح رکھے

اس سے پوچھا "لائبریری میں تو خوب بولتی ہو"

وہ، وہ میں نے سوچا۔۔۔ کاکل تصویر کے بارے میں سوچ رہی

تھی کہ قربت والی تصویر اگر اخبار میں چھپ جائے تو کیا ہوگا۔

"کیا سوچا؟۔۔۔۔۔ وہ کیسے بتا دیتی کہ ان کی قربت اسے کتنا سراسیمہ

کر رہی تھی۔

”میں نے سوچا“۔۔۔ اس نے ہٹا کر کہا۔۔۔ ”شاید مجھے بیچ میں دخل نہیں دینا چاہیے۔“

”کمال ہے، تاریخ کے ایک اہم نکتے کو لے کر یہ سمینار تھا جو تمہارا اپنا سبجیکٹ ہے“

کاکل بس ”اوہ“۔۔۔ کہہ پائی۔

”اس اوہ کا کیا مطلب ہوا؟“ انہوں نے پلٹ کر اس کے پروفائیل پر نظر ڈالی۔ وہ اس کی سرا سمیگی سے مزہ لے رہے تھے۔

”میں سمجھی آپ اس لڑکی کی بات کر رہے ہیں۔“

”شکریہ آپ کا جو آپ نے یہ نہیں سمجھا کہ میں اس کی ماں کی بات کر رہا ہوں۔“ کاکل ہنس پڑی۔

”اب تمہاری سزایہ ہے کہ اس سمینار کی ایک رپورٹ تیار کرو“
انہوں نے کاکل کو نوٹس لیتے دیکھ لیا تھا۔

اگلے دن جب وہ کام ختم کر کے باہر نکلی تو کارڈور ہی میں مسیح سے مڈ
 بھید ہو گئی۔ مسیح نے اس کا بنا ہوا سویٹر پہنا ہوا تھا جو اس پر بہت چڑھتا تھا۔
 ”بہت چڑھ رہے ہو ڈان جان“ کاکل نے چھیدا۔

”سویٹر بنا کر تم نے اپنا نام نیکی کاروں میں لکھوا لیا ہے“ مسیح نے
 مسکرا کر سویٹر کے نرم اون پر ہاتھ پھیرا۔

”سینٹ مسیح ایک ٹانگا بھی ادھر ادھر ہوا تو آپ سیدھا مجھے دوزخ میں
 بھجوا دیں گے“ اس نے ہنس کر کہا اور چلی گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ ریسرچ کے
 سلسلہ میں لئے گئے نوٹس کو مربوط فائل کی شکل میں سیور جانے سے پہلے ہی
 تیار کر کے التمش کے حوالے کر دے۔

جب وہ اپنے کمرے میں پہنچی تو ڈور اوہاں اس کے کپڑے تہہ کر کے
 رکھ رہی تھی جنہیں جلدی میں اس نے یوں ہی چھوڑ دیا تھا۔
 ”بی بی کام کھتم ہو گیا“ ڈور نے آج اسے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا۔
 آج کل بھوت (بہت) دیر تک کام کرتا۔

کاکل نے مختصراً ہاں ”کہا اور کتابوں کا بنڈل ٹیبل پر پٹک کر بیڈ
 پر ٹک گئی۔

”چھوٹے سرکار کے ساتھ کام کرتا؟ ڈور نے پوچھا۔

”ہوں“ کاکل نے اپنی دھن میں کھوئے کھوئے کہا اور ریفرنس کی وہ
 کتاب اٹھا کر دیکھنے لگی جس کے متن پر اسے شک سا تھا۔ وہ اندھا دھند کام
 کر کے التمش سے اپنی ہنسی اڑوانا نہیں چاہتی تھی۔

”ڈورا ایک بات بولے گا“ ڈورا کو بات ختم نہ کرتے دیکھ کر کاکل نے کتاب بند کر دی۔

”بی بی برائیاں مانے گا تو ڈورا بولے گا۔“

”ہاں کہو ڈورا، میں برا نہیں مانونگی“ کاکل نے متوجہ ہو کر کہا۔

”بی بی! مالک لوگ سے دور ہی رہنا مانگتا۔۔۔ ڈورا نے کاکل کو رائے دی۔

”میں سمجھی نہیں ڈورا“ کاکل اس کا مطلب سمجھتی ہوئی بھی بولی۔

”چھوٹا سرکار مالک ہے۔ اس سے جاستی بولنے کا ٹھیک نہیں ہے۔

۔۔۔ تمہارا دھرم کرنے کو آیا۔ سجاد بابا۔ جینو بابا کے واسطے چھوٹا سرکار کو بولو تم ان کا کام نہیں کرے گا۔“

”کیوں؟ کیوں انکار کروں میں؟“ کاکل نے مسکرا کر پوچھا۔

”ابی تم کو کیسا سبجانا“ ڈورا نے عاجز آ کر کہا ”یہ بڑا آدمی لوگ

چھو کری لوگ کے واسطے اچھا نہیں رہتا۔“

جب سے ریسرچ کے سلسلہ میں کاکل کا وقت الشمس کے ساتھ زیادہ

گزرنے لگا تھا ڈورا کو ایک فکر سی لاحق ہو گئی تھی۔ وہ الشمس کی کشش

اور انکی ضد سے اچھی طرح واقف تھی۔ بچپن ہی سے وہ جو چیز حاصل کرنا

چاہتے حاصل کر کے ہی رہتے۔ کاکل حسین تھی، ذہین تھی جب اس کا حسن

خود اس کے راہب بیٹے کے پاؤں ڈگ سکتا تھا تو اسے یقین تھا کہ الشمس بھی

اس سے بے بہرہ نہیں ہونگے۔ کیا ہوا جو انہوں نے بھی کاکل کو اپنی ضد کا

مسئلہ بنالیا وہی تو امید کی ایک کرن تھی جو اس کے پیٹے کو پادری بننے سے روک سکتی تھی۔

کاکل کو ڈورا کی یہ پر خلوص فکر بہت اچھی لگی۔ بظاہر سخت گیر چہرے والی ڈورا کا دل موم کا تھا جو ایک اجنبی لڑکی کے لئے فکر مند تھا کیا وہ جانتی نہیں تھی کہ التمش کے گاہے گاہے ہلکے پھلکے موڈ کو اصلیت سمجھنے میں اس کی تباہی تھی۔

”ایسا کبھی نہیں ہو گا ڈورا“ اس نے کہا۔

”کیا کبھی نہیں ہو گا؟ مسیح نے آتے ہوئے پوچھا۔

”سہی کہ چائے باغوں سے نکل کر ہمارے لبوں تک کیسے پہنچتی ہے۔ تم کبھی نہیں بتاؤ گے۔“ کاکل نے ڈورا کے چہرے پر آتے تاثر کو دیکھ کر بات بنادی۔ گویا وہ نہیں چاہتی تھی کہ ان کی بات چیت بیٹے تک پہنچے۔

”بی بی کو استنا شو کہ ہے تو دکھاتا کیوں نہیں کار کھانا؟ ڈورا نے موقعہ غنیمت جان کر رائے دی۔

”انہیں ہی تو فرصت نہیں ہوتی آئی“ مسیح بولا۔

”چلو ابھی چلو۔ مجھے تو فرصت ہی فرصت ہے“ کاکل دراصل ڈورا کی منو لیتی نظروں سے دور ہو جانا چاہتی تھی۔ ویسے بھی اسے کھلی ہوا کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے شہزاد اور زینو کی باقاعدہ کلاس لینی شروع کر دی تھی۔ آج انہوں نے اسے بالکل عاجز کر دیا تھا۔ اسکے فوراً بعد ہی لائبریری پہنچی تھی جیسے جیسے ریسرچ پراجکٹ آگے بڑھ رہا تھا کام بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ التمش

کام کی حد تک بڑے سخت گیر ثابت ہو رہے تھے۔ ڈور کی صحت کی حالت دیکھتے ہوئے کاکل نے مسیح سے کہکر باغات میں کام کرنے والی ایک عورت کو بلایا تھا جو اس کی غیر حاضری میں بچوں کا خیال رکھتی تھی۔ پھر بھی کاکل کے فرصت کے اوقات راشن ہوتے جا رہے تھے۔ اس کی اسے کوئی شکایت نہیں تھی اسے شروع ہی سے علم حاصل کرنے کی لگن تھی اور الشمس کے ساتھ کام کرتے ہوئے اسے اپنے علمی ذوق کی تکمیل کا موقع مل رہا تھا۔ وہ جہاں تک ہو سکے اپنی سیدھی سادھی زندگی کو پیچیدگیوں سے بچائے رکھنا چاہتی تھی۔ آج ڈور کی جرح نے اسے اور بھی زیادہ خبردار کر دیا تھا۔

مسیح کے ساتھ وہ باہر نکل آئی۔

باغات اور کارخانہ اس نے سو بار دیکھا تھا اور مسیح بھی یہ بات اچھی طرح جانتا تھا۔ شاید وہ بھی ماں کی مٹولتی نظروں سے دور ہونا چاہتا تھا۔ کاکل اکثر مسیح کو چینی راہب درونا کی مثال دیکر چھیڑا کرتی تھی۔ چائے کے بارے میں اس حکمت کا تعلق راہب درونا سے تھا۔ درونا ہمیشہ خدا سے لو لگائے رہتا۔ اسی عالم میں ایک بار اس کی آنکھ لگ گئی جب وہ جاگتا خود سے استا برہم ہوا کہ اس نے اپنی آنکھوں پر سے پوٹے کاٹ کر پھینک دئے جنہوں نے اسے سلا کر خدا تعالیٰ کی پرستش میں خلل ڈالا تھا۔ کہتے ہیں جہاں درونا نے اپنے پوٹے کاٹ کر پھینکے تھے وہاں کچھ پودے اگ آئے جن کے پتے نیند کو دور رکھتے تھے۔ یہی چائے کے پودے تھے۔

”پادری صاحب کر سکتے ہو تم بھی درونا کی طرح؟ ذرا انگلی میں سوئی

چھو کر تو دکھا دو "کاکل نے حسب معمول مسیح کو چھیڑا۔" مجھے یقین ہے جب بھی تم خدا سے لو لگا کر آنکھیں بند کرتے ہو گے تو اچھی لڑکیاں پری بن کر تصور میں اتر آتی

"لڑکیاں تو نہیں" مسیح نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا
 "تو پھر کون!" کاکل نے آنکھیں پھاڑ کر کہا "کہیں خدا درخواستہ بارہ سنگھے تو

اب مسیح اسے کیسے بتاتا کہ اسکے تصور میں لڑکیاں نہیں بس للی کے نازک پھول اس کی تپسیا کو بھنگ کرنے چلے آتے ہیں۔ جنھیں وہ اپنی قوت ارادی سے جھٹک دینے میں کامیاب ہوتا ہے تب بھی اس کا دل گیان میں نہیں لگتا۔ تب اس کا دل واقعی خود کو سزا کا مستحق سمجھتا ہے

"چینیوں میں اذیت کی برداشت بہت ہوتی ہے" وہ درونا کی طرف لوٹتے ہوئے بولا "اذیت ناک سزائیں چینیوں نے ہی ایجاد کیں۔ اسی لئے انکے عقیدوں اور داستانوں میں بھی خود غزیدگی کی جھلک ملتی ہے۔ درونا کی داستان اپنی جگہ ٹھیک ہے لیکن کچھ دستاویزیں بتاتی ہیں کہ چینی شہنشاہ شن نانگ نے تین سو سال قبل مسیح چائے دریافت کی تھی"

اور ایک مسیح تم ہو جواب کہیں جا کر پیدا ہوئے ہو Lazy ،
 bum کاکل نے مسیح کو الزام دیا اور وہ ہنس پڑا۔

وہ ٹہلتے ٹہلتے باغان کے سبزہ زار سے گذر رہے تھے۔ ہر طرف مسطح پودوں کے قالین سجھے تھے۔ چائے کا خود رو پودا سات میٹر کی لمبائی تک پہنچ

جاتا ہے لیکن باغات میں اسے ایک میٹر سے زیادہ بڑھنے نہیں دیا جاتا جو سو سال تک ہمارے پیالوں کو خوشبودار سیال سے بھرتا رہتا ہے۔

”شاعر انگور کی کشید کی بات کرتے ہیں“۔۔۔۔۔ مسیح کو کاکل سے بات کرنا اچھا لگ رہا تھا جو ہاتھ میں ایک چھڑی لئے ستلی کی طرح کیاریاں پھلانگ کر اس کے ساتھ چل رہی تھی۔ ”میں نے ایک تصویر دیکھی تھی کہ کس طرح سینکڑوں انگوروں کی روح سلب ہوتی ہے تب کہیں ایک خوش رنگ جام بھرتا ہے“۔۔۔۔۔ مسیح نے جیبوں میں ہاتھ ڈالے کاکل کی طرف مڑ کر کہا ”جانتی ہو جب ساڑھے چار کیلو پتیاں مر جھاتی ہیں تب کہیں ایک کیلو چائے کی پتی حاصل ہوتی ہے“۔

”ہاں بہت سی موتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا نوحہ کوئی نہیں لکھتا“ کاکل بولی ”مگر ہر مرتبہ اپل ایک اور زندہ لمحے کو جنم بھی تو دیتا ہے۔ ذرا اس بوڑھی عورت کو دیکھو جسے انہی پتیوں نے عمر کے اس سنگ میل تک بھی روزگار دیا ہوگا“۔ کاکل کی رجائیت آج مسیح کی زندگی میں نئی امنگ جگا رہی تھی۔

عورتوں کے پرے کے پرے بڑی تیزی اور چابکدستی سے چائے کی نرم کوئل پتیاں توڑ کر اپنی پیٹھ پر باندھی لمبی ٹوکریوں میں جمع کرتے جا رہے تھے۔ تازہ اور کھلی ہوا میں کام کرنے کی وجہ سے ان کے چہرے شاداب اور لبوں پر لگنناٹ تھی۔ باغات میں چائے کی پتیاں جمع کرنے کا کام چابکدستی کی بنا پر ہی عورتوں کا خاصہ مانا جاتا تھا۔

باغاں کے ایک خطے کو سر جوزف بینکس کے نام سے موسوم کیا گیا تھا
 اختر بخت نے وطن واپس ہوئے انگریزوں سے جب کوٹھی اور باغ خرید ا تھا تبھی
 سے یہ بورڈ جوں کاتوں لگا تھا۔ بادو باراں جب اسے کجلا دیتے تو فوراً اسے
 تازہ کر دیا جاتا کیونکہ اسی برطانوی ماہر نباتیات نے سب سے پہلے ۱۷۷۸ء میں
 چائے کے پودے چین سے ہندوستان میں درآمد کئے۔ ورنہ ۱۷۷۳ء تک بھی
 چائے کیا ہوتی ہے ہندوستان میں کوئی نہیں جانتا تھا۔

باغاں میں اس چھوٹے سے احاطے کو کارخانہ کہنا زیادتی تھی کیونکہ
 اختر بخت کی وہ ٹی اسٹیٹ اتنی بڑی نہیں تھی جہاں خود کفیل فیکٹری لگائی
 جاسکتی۔ پھر بھی محدود انداز میں وہاں کام ہوتا ہی تھا۔ ہری پتیاں جمع کر کے
 عورتیں کارخانہ لے جاتیں جنہیں تول کر انہیں اجرت دی جاتی اس کے بعد
 ان پتیوں کو سکھایا جاتا اور پھر جب ان پر سے بہت گرم ہوا گزاری جاتی تو
 اس کا رنگ سیاہ ہو جاتا۔ پتیوں کو چھانٹ کر مختلف قسموں میں مستقسم کر کے
 انہیں بڑے کارخانوں میں بھجوا دیا جاتا۔

”یہ ہمارے باغ کی سب سے زیادہ قیمتی چائے ہے۔“ مسیح نے ایک
 کو نیل توڑ کر کا کل کو دی۔

اس میں کوئی خوشبو نہیں ہے ”کا کل نے سونگھ کر کہا۔

”حتا پتھر پر پستی ہے تب ہی رنگ دیتی ہے۔ اس کلی نے آزمائش کی
 تپش کہاں جھیلی ہے۔“ مسیح نے فلسفیانہ بات کہی۔ ”چائے بھی انسان کے

کردار کی طرح ہے، جتنا جھیلیتی ہے اتنا نکھرتی ہے۔“

کاکل نے اسکی بات سن کر بڑی سنجیدگی سے تالیاں بجائیں اور کہا
 ”آفاقی ذہن آٹھ ہستیوں کے مانے گئے ہیں۔ ارسطو، افلاطون، آرسیمیدس،
 نیوٹن، گاس، خیام، لیوناردو داوینچی۔۔۔“

مسیح انگلیوں پر گنتا رہا ”یہ تو سات ہوئے، آٹھواں کون ہے؟“
 ”تم خود۔۔۔ مولانا مسیح۔“

عام طور پر سادہ سیدھا مسیح جب کوئی فلسفیانہ بات کرتا تو کاکل فوراً
 اسے لے اڑتی۔ اسے مسیح کو چھیننے میں مزہ آتا تھا۔ اور مسیح وہ لمحے اپنے دل
 کے نہاں خانے میں بڑی احتیاط سے سجالیتا
 ”کاکل اگلے ہفتے میں جا رہا ہوں۔“ کاکل کے کمرے کے دروازے
 پر رک کر مسیح نے کہا۔

”کہاں؟ کہاں جا رہے ہو؟“ کاکل نے حیرت سے پوچھا، یوں تو مسیح کا
 جانا آنا لگا ہی رہتا تھا لیکن اس بار بات کچھ مختلف لگتی تھی۔

”میں نے فیلڈ ورک کے لئے مشنری میں اپنا نام دیدیا تھا۔“ وہ اپنی
 نیلی آنکھوں سے کاکل کے چہرے کا جائزہ لینے لگا کہ شاید وہاں وہ ردِ عمل نظر
 آجائے جو وہ دیکھنا چاہتا تھا۔

”تو دور چلے جاؤ گے؟“

”ہاں۔ شاید کھلتے جانا ہو۔“

”قیامت سے پہلے تو لوٹ آؤ گے نا؟“

”کوشش کرونگا۔“ مسیح نے بناوٹی ہنسی سے کہا۔ وہ پل بھر کی خوشی جو کاکل کے چہرے کا تاثر دیکھ کر ہوئی تھی، کافور ہو گئی۔

”مسیح I will Miss you“ کاکل نے صدق دلی سے کہا۔ اور یہ حقیقت تھی۔ مسیح کی بے لاگ دوستی میں کہیں خندق کہیں کھائیاں نہیں تھیں جہاں اس کے پھسل کر گرنے کا احتمال ہوتا۔ وہ اس کے ساتھ ہنس بول بھی لیتی تھی۔ محل بھی جاتی تھی۔ مسیح نے اس کی زندگی میں ایک سچے دوست کی کمی پوری کر دی تھی۔

”اگلے ہفتے تم سب بھی تو میسور جا رہے ہونا!“

”ہاں، بچے، میں اور تاش“

”تاش!“ مسیح نے سوالیہ نظروں سے کاکل کو دیکھا۔ جیسے اس کا بے تکلفی سے التمش کا نام لینا اسے عجیب لگا ہو۔

”تم اور بچے ہی تو کہتے ہو انہیں“ کاکل نے کھسیا کر کہا۔

”اور تم کیا کہتی ہو؟“ مسیح خواہ مخواہ ایک معمولی بات کو ہوا دے رہا

تھا۔

”Come on“ مسیح! کاکل نے لٹھ کر کہا ”مجھے کچھ بولنے کی

ضرورت نہیں پڑتی۔

”ہاں“ مسیح نے کاکل سے پرے دیکھ کر کہا ”تاش کے آگے بہت کم

لوگ بول پاتے ہیں۔“

مسیح کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ کئی

بار اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ اس سے التمش کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا تھا پھر بات کو مائل جاتا۔ وہ خود بھی اب کاکل کے لئے معمر بنتا جا رہا تھا۔ وہ خدمتِ خلق کے لئے جانا بھی چاہتا تھا اور دل گرفتہ بھی تھا۔ آخر وہ کون سی مجبوری تھی جس نے اسے اس فیصلے پر مجبور کیا؟

اس کے ہاتھ میں اب بھی مسیح کی دی ہوئی کوئیل، چائے کی ایک کلی اور دوپٹیاں موجود تھیں جہنیں وہ تیز ہواؤں سے بچالائی تھی۔ اس نے ایک صاف ستھرے کاغذ کی تہہ میں وہ کوئیل رکھی تاکہ کوئیل کا سبز رنگ کتاب کے صفحے کو نہ چھوئے اور دبیز کتاب کے اوراق کے بیچ رکھ دیا اور رکھنے سے پہلے کچھ سوچ کر اس کاغذ پر لکھ دیا۔ "میسح I Miss you" اور اس پر اپنے دستخط کر دیئے۔

اگلے دن سویرے ہی وہ میسور کے لئے چل پڑے۔ کار میں التمش کے برابر کاکل اور چٹھے شہزاد اور زینو۔ التمش نے ڈرائیور کو دو دن بعد میسور پہنچ جانے کیلئے کہہ دیا تھا۔ ساتھ اس لئے نہیں لیا تھا کہ سفر میں بچے اگر سو جائیں تو جگہ کی تکلیف نہ ہو۔

صبح کی دلفریب ہوا میں وہ آگے بڑھتے رہے۔ باہر کی خوشبوئیں کار کے اندر التمش کے آفٹر شیو لوشن کی خوشبو میں مل کر ایک نئی خوشبو کو جنم دے رہی تھیں۔ رومن سینڈل سے جھانکتے اور صاف ستھرے متناسب پیر کاکل کے نازک سینڈل میں جکڑے ہوئے پیروں کے مقابل بڑے اور مضبوط نظر آرہے تھے۔ اتفاق ہی کی بات تھی کہ آج کاکل کے لباس کا رنگ انکے لباس

کے رنگ سے میل کھا گیا تھا۔ آج اسنے بھی گہری سرمی پتلون پر سفید بلاوز پہنا تھا۔ اور التمش کاٹی شرٹ بھی سفید تھا جس سے انکے مضبوط اور ورزشی بازو جھانک رہے تھے۔ لمبی اور خوش وضع انگلیوں والے ہاتھ سٹیرنگ کے کنٹرول رہے تھے۔ انہوں نے دو ایک بار کاکل پر بھرپور نظر ڈال کر اس کے لباس پر اطمینان ظاہر کیا تھا۔ پل بھر کو انکی نظر اسکے سیاہ چشمہ لگائے چہرے پر رک گئی تھی۔ کیونکہ ان کا دیا ہوا چشمہ اسکے حسین چہرے پر بہت جگ رہا تھا۔ کاکل ان کی نظروں سے بے بہرہ نہیں تھی۔

عجیب حال تھا کاکل کا بھی۔ وہ حتی الامکان کوشش کرتی کہ التمش کے سائے سے بھی دور رہے لیکن جب انکے ساتھ ہوتی تو اسکا دل چاہتا کہ وہ لمحے کبھی ختم نہ ہوں۔ التمش کی دلی کیفیت سمجھنا اسکے لئے ناممکن تھا۔ اس نے اب یہ کوشش ہی چھوڑ دی تھی۔ بلکہ خود اپنے اطراف پردے گرانے لگی تھی تاکہ ان کی گہری نظروں سے اپنے دلی جذبات کو روپوش رکھے۔ لیکن یہ پردے مکڑی کے جالوں جیسے ثابت ہو رہے تھے۔ دبیز سے دبیز مکڑی کا جالا بھی کہاں پردہ بن پاتا ہے۔ اسکا ثبوت التمش کی وہ نظریں تھیں جو اسکی روح میں سرایت کر جاتی تھیں۔ ہونٹوں کا وہ خم جو اسکی اپنے آپ کو سنجیدہ اور لاتعلقی بنائے رکھنے کی کوشش کو مسمار کر دیتا تھا اس کے پاؤں اکھیر دیتا تھا۔ کیا وہ جان بوجھ کر ایسا کرتے تھے؟ شاید نہیں یہ تو خود اس کے نادان دل کی کارستانی تھی جو ان کی ایک گرم نظر سے ہی پگھل جاتا

تھا۔ اسے بہت ڈر لگتا تھا کہ یہ ننگہ اسے کہیں کانہ چھوڑے گا۔

”۔۔۔۔۔ اور تمہاری والدہ؟“ انہوں نے اچانک پوچھا اور وہ اپنے

انہماک سے اچھل پڑی۔ ”میرا خیال ہے وہ کافی تعلیم یافتہ اور سمجھدار
ہونگی التمش پہلی بار اس سے ذاتی سوال کر رہے تھے۔ پہلے دن انہوں نے جو
کچھ پوچھا وہ سارے سوال غلط تھے۔ ان کا جواب کاکل کیا دیتی؟۔

دونوں بچے اپنی چہلوں کا اسٹاک ختم کر کے سوچکے تھے۔ اپنی ماں کے
بارے میں بتاتے ہوئے کاکل میں نئی زندگی آگئی تھی۔ اس سے آج تک اس
ہستی کے بارے میں کسی نے کچھ نہ پوچھا تھا جو اعلیٰ ترین کردار کی مالک تھی۔
جس نے سخت آزمائش کے دور میں بھی مسکرا کر انا سیکھا تھا۔ اس کی ماں ایک
ایسی کشتی تھی جسے مسلسل کنارے کی تلاش رہی لیکن ہر کنارہ اس تک پہنچتے
پہنچتے معدوم ہو جاتا لیکن وہ کبھی ملول و دل شکستہ نہیں ہوتی۔ اس کا یقین
تھا کہ کشتی سلامت ہو تو کناروں کی کیا کمی ہے۔ ایک نہیں تو دو سرائل جائے
گا۔ اور اسی رجائیت میں اس نے دنیا چھوڑ دی لیکن اپنا یہ یقین وہ اپنی بیٹی کو
دے گئی۔

”گریٹ خاتون تمہیں تمہاری ماں“ التمش نے کہا لیکن کاکل کے گلے
میں ایک سسکی سی آکر پھنس گئی تھی۔ اس نے اپنا سر گھمایا تاکہ التمش اسکی
آنکھوں میں آئے آنسو نہ دیکھ پائیں۔ التمش نے کار ایک طرف کو روک لی۔
وہ کاکل کو سنہلنے کا موقعہ دے رہے تھے۔ انہوں نے جیب سے اپنا ستھرا
رومال نکالا۔ کاکل کا چہرہ پلٹا یا اور اس کی نمناک آنکھیں پونچھیں۔ ان کی

دلجوئی سے کاکل کا دل اور بھی بھرا آیا۔ لیکن اس نے ضبط سے کام لیا۔
 ”معاف کیجئے“ کاکل نے خود کو سنبھال کر کہا۔ ”میں نہیں چاہتی تھی
 کہ۔۔۔۔۔“

”لیکن میں چاہتا تھا“ التمش نے رومال جیب میں رکھ کر کار سٹارٹ
 کرتے ہوئے کہا ”میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ حیرت انگیز خوبیاں تمہیں کہاں
 سے ملی ہیں۔“ کاکل کے خیال میں وہ تعریفی جملہ انہوں نے اس کے اشتہار دل
 کو مرہم کی طرح پیش کیا تھا جس کے لئے وہ ان کی شکر گزار تھی۔ حالانکہ
 التمش اس وقت محض اخلاقی اظہار ہمدردی کے موڈ میں نہیں تھے۔ کاکل
 کے جوہر ان پر ایک ایک کر کے کھلتے جا رہے تھے۔ ایک ایسی نا تجربہ کار
 لڑکی جسے انہوں نے بادل، نا خواستہ قبول کیا تھا وقت پڑنے پر بڑی ذمہ
 داریاں بھی سنبھال لیگی۔ یہ انہوں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ صرف یہی نہیں
 بلکہ وہ رفتہ رفتہ ان کے دل میں اپنی جگہ بناتی جا رہی تھی۔ ان کا دل جو ایک
 ایسا قلعہ تھا جس کا دروازہ کئی حسینوں نے کھٹکھٹایا تھا لیکن مایوس ہو کر چلی
 گئی تھیں۔ وہ کئی بار خود کو یقین دلاتے کہ کاکل کی مقناطیسییت ان کے لئے
 بے معنی ہے۔ وہ مسیح کے پاکباز نا تجربہ کار دل پر ضرور اثر کر سکتی ہے لیکن وہ
 جب بھی کاکل کو مسیح کے ساتھ ہنستے بولتے دیکھتے تو ان کی جھلاہٹ بڑھنے لگتی
 وہ اس حقیقت کو ماننے سے پہلو ہتی کر جاتے کہ کاکل کا وہی حسن اور اس کی
 شخصیت کی وہی خوبیاں جو مسیح کو اپنی راہ سے ہٹا رہی تھیں ان پر بھی اثر انداز
 ہو رہی تھیں۔ کاکل نے بہت دیر سے کچھ نہیں کہا تھا۔ انہوں نے پلٹ کر اس

کی طرف دیکھا وہ سوچکی تھی۔ نیند سے بوجھل اس کا سر سیٹ کی پشت سے پھسلتا ہوا ان کی طرف جھکتا جا رہا تھا۔ انہوں نے اپنی طرف سے کوئی کوشش نہیں کی کہ دھکیل کر اسکی سمت بدل دیں حتیٰ کہ اس کا سر ان کے کندھے سے آگیا۔ اس کے معطر بالوں کی خوشبو نے بتایا کہ وہ بہت تیزی سے ان کے احساسات پر چھائی جا رہی تھی۔

میور میں ہوٹل کی بکنگ پہلے ہی سے موجود تھی۔ وہاں پہنچ کر زمینو اور شہزاد ایسے چاق و چوبند اٹھے جیسے کبھی سوئے ہی نہیں تھے۔ دسہرے کے نو دن اور ان کی گھماگھی شروع ہو چکی تھی۔

دسہرے کے تہوار کو برائی پر نیکی کی فتح مانا جاتا ہے۔ دیوی چامند کی سراہنا اور تعظیم کے اظہار کے طور پر میور میں یہ تہوار منایا جاتا ہے۔ پوجا سے قطع نظر اس کی ثقافتی اہمیت بھی ہے۔ یوں تو ملک بھر میں یہ تہوار منایا جاتا ہے لیکن میور کے دسہرے کو صرف مذہبی نہیں تاریخی اہمیت بھی حاصل ہے۔ وہاں یہ تہوار وجئے نگر سے چلا آیا جس میں مٹی کے درخت کی پوجا کی جاتی ہے۔ رولمت ہے کہ پانڈولپنے ہتھیار مٹی کی کھوہ میں چھپا کر رکھتے تھے اور جب مہا بھارت کی لڑائی لڑنے کا وقت آیا تو انہوں نے اس درخت کی پوجا کی اور اپنے ہتھیار حاصل کئے۔ وہ دن دسہرہ کا دن تھا۔

دسہرہ کو قومی تہوار منانے کا سلسلہ کوئی پندرہویں صدی سے جا ملتا ہے جس میں وجئے نگر کے حکمران اپنی رعایا کی دلچسپی اور خوشی میں خود کو شامل کرتے اور رعایا کی خوشنودی حاصل کرتے۔ ایسے ہی موقعہ پر کسی قوم کی

ثقافت اور تہذیب کا اندازہ ہوتا ہے کہ کس خوش اسلوبی سے اس کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی فوج اور اسلحہ کی نمائش رعایا میں طمانیت اور حکومت وقت کی طاقت پر بھروسہ پیدا کرتی ہے جو برسرِ اقتدار حکومت کی بقا کے لئے بہت ضروری ہے۔

میور میں آج تک یہی کوشش کی جاتی ہے کہ دسہرہ اسی شان و شوکت سے منایا جائے جیسا کہ وجئے نگر کی ریت تھی۔ سلطان حیدر علی اور پھر ٹیپو سلطان نے بھی اس روایت کو برقرار رکھا۔ حیدر علی اسی ریاست کے والی وڈیار کے ملازم تھے۔ ترقی کرتے کرتے انہوں نے سلطنت خداداد کی بنیاد رکھی تھی لیکن میور اور اسکے مہاراجہ کے اعزاز پر کبھی حرف نہ آنے دیا۔ چنانچہ میور سلطنت خداداد کی پروٹکٹوریٹ ہونے کے باوجود پرانی نمک خواری کا لحاظ کرتے ہوئے دسہرے کے روز حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی طرف سے مہاراجہ کو نذر گزارتی جاتی۔

التمش نے بچپن میں کئی بار دسہرے کا جشن دیکھا تھا اور اب انہیں شہزاد اور زمینو کا بچپن یہاں کھیچ لایا تھا کیونکہ اوٹی میں بچوں کی دلچسپی کے سامان کم تھے۔ اس کے علاوہ ٹیپو اور اسکے انداز حکومت کا یہ پہلو بھی بڑا جاندار تھا کہ بسنے اپنے دور حکومت میں دسہرے کی اہمیت کو کبھی کم نہ ہونے دیا۔ جو بے تعصبی کی ایک مثال تھی ورنہ بعض انگریز مورخوں نے مختلف مذاہب میں تفرقہ پیدا کرنے کی غرض سے ٹیپو کو متعصب ثابت کرنے کیلئے لڑی چوٹی کا زور لگا دیا ہے۔

ڈھول، نیزیاں، زربفت کی جھولیں پہنے بھاری بھر کم ہاتھی جن کی سچی سجائی عماریوں پر سنہری اور روپہلی چھتریاں، تلوار کے پھیر، ناحتی گاتی اپنے فن کا مظاہرہ کرتی۔ نازنین، آزادی کے بعد مختلف قومی بیڑے، جھانکیاں اور NCC کے چستی سے مارچ کرتے نوجوان لڑکے لڑکیاں اور ان سب کے چمکے گنگا جمنی عماری میں بے پناہ جتنے والے عالم پناہ۔ میوور کے مہاراجہ شیاام راج وڈیار کی سواری۔ مہاراجہ جو کبھی گٹھے ہوئے جسم کے چست نوجوان تھے ایک زمانہ میں ٹینس کے بہترین کھلاڑی مانے جاتے تھے۔ التمش کے بچپن میں ان کا مونپا اس خطرناک حد کو پار کر گیا تھا کہ التمش کے دوستوں نے انہیں ہزبائی ٹینس کی بجائے ہز ہیوی ٹینس کہنا شروع کر دیا تھا۔ ویسے اس میں مضحکہ کا کوئی دخل نہیں تھا کیونکہ والی میوور نہایت خلیق و ملنسار انسان تھے جنہوں نے بدلتے وقت کو بالکل صحیح طرح محسوس کیا تھا۔ وہ قومی یکجہتی کے زبردست حامیوں میں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کرناٹک کے ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنے اپنے مذہب کے پابند اور کاربند ہوتے ہوئے بھی مذہب کو نفرت کا ہتھیار کبھی نہیں بننے دیا۔

شہزاد اور زینو نے گویا خود کو ہنگاموں میں جھونک دیا تھا۔ آج ان کی ہر خواہش پوری کی جا رہی تھی۔ کھیل تماشے حتیٰ کہ کشتی بھی دیکھی تھی جو کاکل کے روٹنگھٹے کھڑی کر دیتی تھی۔ وہاں بہت بڑا - Merry - go - round بھی لگا ہوا جس پر بیٹھنا شہزاد اور زینو کے خیال میں لازمی تھا۔ اس پر بیٹھا گیا لیکن ان کے اس اصرار کو نامنظور کر دیا گیا کہ وہ اس پر تنہا بیٹھیں۔

آخر وہ کاکل اور التمش کے ساتھ بیٹھنے پر رضامند ہو گئے۔ کاکل کو حیرت تھی کہ التمش بچوں کی ہر دلچسپی کو مقدم سمجھ رہے تھے۔

”انہوں نے آج اتنی دھول پھانکی ہے کہ کھانے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔“ جب کاکل نے ان کی برف کے لڈو کی فرمائش کو ٹھکرا دیا تو التمش نے کہا۔

ان کی خریدی ہوئی چیزیں بڑھتی جا رہی تھیں اور ساتھ ہی میلے کا شور بھی اتنے میں جلوس نکلنا شروع ہوا۔ سینکڑوں گھوڑے ہاتھی کرتب دکھاتی ٹولیاں، ایک اژدھام تھا۔ ہاکروں نے بھی جوش میں آکر اپنے پھیپھڑوں میں ہوا بھری تھی اور چلا چلا کر لوگوں کو اپنی طرف راغب کر رہے تھے۔ جلوس میں سب سے آخر ”بھالے سلطان“ تھے جو مہاراجہ کی سواری سے پہلے آتے تھے تنی ہوئی گردنیں، کندھوں پر چمکدار بھالے وہ گویا مہاراجہ کے روایتی باڈی گارڈ تھے۔ ابھی ان کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا لیکن شور غوغا اتنا بڑھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی اور اس کے ساتھ ہی وہ واقعہ ہوا جس نے کاکل کے ہی نہیں التمش کے بھی ہوش اڑا دیے۔ شہزاد اور زینو غائب تھے۔

التمش سے اجازت لے کر ڈرائیور رالمو نے دونوں بچوں کے ہاتھ تھامے اور قریب سے تماشا دکھانے کے لئے ایسی جگہ جا کھڑا ہوا تھا جو قدرے اونچائی پر تھی لیکن خلقت کا ایک ریلا ایسا آیا جو ان دونوں کو ساتھ بہالے گیا بدحواس رالمو نے جب آکر خبر دی تو اس کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے

”بابا لوگ۔۔۔۔۔ بابا لوگ“۔۔۔ وہ ہکھلایا۔

”بچے کہاں ہیں“ کا کل خطرے کو محسوس کر کے تقریباً چلا پڑی

”مجھ سے ہاتھ چھڑا کر پتہ نہیں بابا لوگ کہاں چلے گئے“۔۔ وہ فضا میں

خسکی کے باوجود پسینے میں تر تھا۔

”کیا بکتے ہو“ التمش اٹھ کھڑے ہوئے صاف ظاہر تھا کہ شہزاد اور زینو

بھیر میں کہیں کھو گئے تھے۔

وقت برباد کرنا بیوقوفی تھی۔ اس اثر دھام میں بچوں پر کیا گزری

ہو گی۔ سوچ کر کا کل اوسان خطا ہو رہے تھے۔ التمش کی تجویز کے مطابق

دوبارہ ملنے کے لئے مقام کا تعین کر کے تینوں شہزاد اور زینو کی تلاش میں بکھر

گئے۔ التمش کا کل کو تنہا چھوڑنے کے لئے راضی نہیں تھے لیکن اس نے انہیں

یقین دلایا کہ اسے کچھ نہیں ہو گا۔ دونوں کا ایک ہی سمت میں جانا فصول تھا

کا کل کو جتنی دعائیں یاد تھیں اس نے کر ڈالیں۔ اس جم غفیر میں دو

چھوٹے کھوئے ہوئے بچوں کو ڈھونڈنا کوئی کھیل نہیں تھا۔ وہاں کوئی ایسا

نہیں تھا جو انہیں جانتا ہو۔ بچے اغوا بھی ہو سکتے تھے۔ بھیر میں کچلے بھی جاسکتے

تھے۔ کا کل پر ہیبت سوار تھی۔ اسے ایسے لگ رہا تھا جیسے چیونٹیوں کی بل میں

گھس پڑی ہو۔ جہاں گورے کالے بوڑھے جوان عورت مرد جیسے اسے شکنجے

میں کسے جارہے تھے اور رات نے اندھیرے کا جال پھیلانا شروع کر دیا تھا۔

بڑھتے ہوئے اندھیرے میں مشعلوں کی روشنی سے لپکتے شعلوں سے میلے نے

اپنی خصوصیت کھو کر ہستناک شکل اختیار کر لی تھی۔

بھیڑ میں مدغم کاکل کو ہوش نہیں رہا کہ بچوں کی تلاش میں کتنے گھنٹے گزر گئے۔ بدحواسی نے اسے پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ مہاراجہ کی سواری گزر گئی۔ جلوس کھلے میدان کی طرف بڑھ گیا تھا۔

کاکل کو پہلی بار احساس ہوا تھا کہ وہ شہزاد اور زینو کو کس قدر چاہنے لگی تھی وہ خود کو بھی کسی حد تک ان کے کھوئے جانے کا ذمہ دار ٹہرا رہی تھی، اسے ڈرائیور کی بات نہیں ماننی چاہیے تھی لیکن بعض جلدی میں کئے گئے فیصلے بعد میں صرف پچھتاوا دیتے ہیں۔ وہ اپنے جلتے جلتے آنسو پیتی رہی اور پاگلوں کی طرح دونوں بچوں کو تلاش کرتی رہی۔

ہر تلاش ایک وقت آنے پر رک جاتی ہے۔ اب اسے صرف ایک ہی امید تھی کہ ہو سکتا ہے التمش اور ڈرائیور انہیں تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے ہوں۔ وہ چارو ناچار واپس ہوئی لیکن اس نے دور ہی سے دیکھ لیا کہ مقام مقررہ پر التمش تنہا کھڑے تھے۔ ظاہر ہے کہ بچوں کی تلاش میں وہ بھی ناکام رہے تھے۔ احساس ناامیدی نے اسے پاگل سا کر دیا۔ آنسوؤں کا دریا جو وہ اب تک پیتی رہی تھی اپنا بند توڑ کر بہہ نکلا۔ وہ دوڑ کر التمش سے پٹ گئی اور اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

”کاکل۔۔۔ کاکل“ التمش نے اسے دلاسہ دینے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ان کی آواز صدا بہ صحرا رہی۔ ”خود کو سنبھالو کاکل“۔ انہوں نے کہا لیکن بے سود۔

”کاکل، ہوش میں آؤ“ اور انہوں نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ ”شہزاد اور زینو

کو کچھ نہیں ہوا ہے۔ وہ مل چکے ہیں“ انہوں نے اسے متوجہ کر کے ایک ایک لفظ صاف صاف کہا۔

وہ پھٹی پھٹی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی جیسے اسے ان کی بات کا یقین نہ ہو۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں“ التمش اسے باہوں کے گھیرے میں لئے وہیں پتھر پر بیٹھ گئے۔ وہ جانتے تھے کہ کاکل انتہائی تشویش کے عالم میں تھی۔ ”سچ کہہ رہا ہوں، میں اس لئے یہاں چلا آیا کہ مجھے موجود نہ پا کر تم اور بھی زیادہ پریشان ہوگی۔“

”کہاں ہیں وہ دونوں؟“ کھوئے ہوئے حواس قابو میں لاتے ہوئے اس نے پوچھا۔ التمش کو اس کے آنسوؤں سے تر چہرہ اور بکھرا ہوا پن استہنا چھا گیا کہ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اپنے گستاخ خیالات کو عملی جامہ پہنا دیتے لیکن اس وقت وہ اس کے دل کی حالت سمجھ رہے تھے۔ اس کے جذبے کا احترام لازم تھا۔

”چلو“ انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور وہ کشاں کشاں ان کے ساتھ چل پڑی۔

دسہرے کے موقع پر ایسی ہی ناگہانی وارداتوں کا خیال کر کے پولیس چوکیاں قائم کی گئی تھیں۔ جو خلقت کو دیکھتے ہوئے کم تھیں تاہم ایسی ہی ایک چوکی نعمت ثابت ہوئی تھی۔ التمش کاکل کو لئے وہاں پہنچے۔

”دیکھا نہ میرا ساتھ نہ دینے کا نتیجہ“۔ انہوں نے راستے میں اس کا ہاتھ

دبا کر کہا "اگر تم میرے ساتھ ہو تیں تو اتنی پریشانی نہیں اٹھانی پڑتی۔۔۔۔۔
پریشان تو تم نے مجھے کیا ہے۔ کاکل جہاں جس کا بدلہ میں تم سے کبھی ضرور
لوں گا۔"

وہ سچ کہہ رہے تھے۔ انہوں نے رپورٹ کرنے کے لئے فوراً پولیس
چوکی کا رخ کیا تھا۔ اور دونوں بچے انہیں وہیں مل گئے تھے۔ وہ مقررہ مقام
پر بہت دیر سے کا کل کا انتظار کر رہے تھے۔

”ایسے موقعوں پر بہت سے غیر سملجی حرکتیں کرنے والے لوگ چور اچکے بد معاش شرابی سبھی نکل آتے ہیں۔ میں تو سوچ کر پاگل ہو گیا تھا کہ کہیں تم ان کے ہتھے نہ چرھ گئی ہو“

”یعنی خواہ مخواہ۔۔۔“ کا کل نخل ہو کر بولی ”اب مجھے لے جا کر کوئی کیا کرتا؟“

”بہت سارے استعمال ہیں آپ کی جنس کے“۔۔۔ کسی دن آپ کو اغوا کر کے بتاؤں گا“ سر سے پریشانی کا پہاڑ کھسک جانے پر اسے التمش کی شوخی بری نہیں لگی۔ وہ ہنس پڑی۔ ”جب اتنا اچھا ہنس لیتی ہو تو رونے کی کیا ضرورت ہے؟“ انہوں نے رک کر اس سے کہا۔

”میری ایک فلسفی سہیلی کہتی تھی کہ آنکھیں خدا نے رونے کے لئے
بی بنائی ہیں۔“

”اور لب؟“۔۔ لبوں کے بارے میں کیا فرمان تھا آپکی سہیلی کا؟۔۔
التمش نے شرارت سے اس کے لبوں پر نظر جما کر کہا ”یا لبوں کا مصرف کبھی

کسی نے بتایا ہی نہیں۔“

بات خطرناک حدود میں داخل ہو رہی تھی۔ کاکل نے دیکھا کہ اس کا ہاتھ اب تک آتش کے ہاتھ میں تھا جس پر بار بار ان کی گرفت مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اس نے شکر کیا کہ پولیس اسٹیشن آگیا تھا۔ وہ دوڑ کر اندر پہنچی اور پچھے پچھے آتش داخل ہوئے۔

وہاں کارنگ ہی نہ لایا تھا۔ دو تین سپاہی شہزاد اور زمینو کو گھیرے بیٹھے تھے۔ آتش بازی کی دوکان سے شائد وہ ٹکیاں لائی گئی تھیں جنہیں جلاؤ تو سانپ کی طرح لمبی ہو جاتی ہیں۔ دو گلاسوں میں دودھ رکھا تھا۔ مٹھائیوں کی پلیٹ بھی تھی۔ اور بڑی زندہ دل بات چیت چل رہی تھی۔ پریشانی یا رونے دھونے کا کوئی منظر نہیں تھا۔ کاکل کو لپٹے ہر اس آنسو اکارت جاتے نظر آئے۔ وہ ان دونوں کے غائب ہونے اور پھر جانے کی کہانی سننے کے لئے بیتاب تھی

”ایسا تو ہوتا ہی ہے جناب“ دونوں کو بیٹھنے کے لئے کرسیاں پیش کرتے ہوئے انسپکٹر نے اپنی اردو سے ہار کر انگریزی میں کہا ”جہاں استنا بڑا مجمع ہو وہاں بھانت بھانت کے لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ جیب کترے، چور، بد معاش ایسے ہی موقعہ کی تلاش میں تو رہتے ہیں۔ آپ کے بچے بتاتے ہیں کہ کوئی انہیں ہاتھی پر بٹھانے کا لالچ دیکر لے گیا تھا۔“

شہزاد اور زمینو ان کے قریب ایسے آکھڑے ہوئے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ ”جھوٹ کہا تھا کاکل، اس نے ہمیں ہاتھی پر بٹھایا ہی نہیں“ شہزاد بولا۔ ”اب اسے صابن کے پانی سے گلے کرانے پڑیں گے“ زمینو نے بھی حامی بھری

کیونکہ ان کے پاس جھوٹ کی یہی سزا تھی کہ صابن کے کیلے پانی سے منہ صاف کیا جائے۔

”اور کاکل شہزاد نے اس کے ہاتھ کو کاٹ لیا تھا۔“ اس نے شہزاد کی شکایت کی

”زمینوں نے اس کے گھر کے دو مٹی کے گھرے توڑ دئے“ زمینوں کی شکایت میں شہزاد کیوں چٹھے رہتا۔ پھر تو شکایتوں کا دفتر کھل گیا۔“

”شہزاد نے اس کی ماں کی آنکھ میں مکا مارا تھا“

وہ مجھے چھری سے مارنے آئی تھی۔۔۔“ شہزاد نے اپنی نیکر سنبھال کر خود کی مدافعت کی۔ ”زمینوں نے پنجرہ کھول کر اس کے طوطے کو اڑا دیا“

”اس نے اچھل کود کر اس کی کھٹیا توڑ دی“

”وہاں ایک موٹی آنٹی تھی۔۔۔ اس نے اسے ڈور کی بھینس کہا تھا“

۔۔۔ کاکل کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ دونوں اتنے لائق تھے۔ اس کے ردِ عمل پر التمش بھی مسکراتے ہوئے کبھی اسے کبھی زمین اور شہزاد کو دیکھتے رہے۔

”اب آپ خود ہی سمجھ سکتے ہیں کہ اغوا کرنے والوں نے خود ہی انہیں کیوں واپس لا کر چھوڑ دیا“۔۔۔ انسپکٹر بولا ”آئیے اب آپ کو ان بد معاشوں کے بھی درشن کروادوں“۔

وہ کاکل اور التمش کو حوالات کی طرف لے گیا۔ وہاں ایک نحیف و لاغر شخص جس کی بڑھی ہوئی داڑھی تھی، گھٹنوں میں سر دیئے ہوئے بیٹھا تھا۔

اس کے ساتھ ایک اور شخص حوالات کی سلاخیں پکڑے کھڑا تھا۔

”اٹھ بے!“ انسپکٹر نے آواز لگائی اور بیٹھے ہوئے شخص نے سر اٹھایا

”سر مجھے بے قصور بند کیا ہے۔“۔۔ کھڑا ہوا شخص بلبلیا۔

”بے قصور!“ انسپکٹر نے پولیس والوں کی مرغوب گالی دی۔ ”بچوں

کو اس کے ساتھ مل کر غائب نہیں کیا تو نے؟“

”نہیں سر۔۔ میں تو اسے راستے میں ملا تھا۔۔ بچے اس سے سنبھل

نہیں رہے تھے۔ اس نے مجھ سے مدد مانگی اور کہا یہ بچے کھو گئے ہیں اور میں

انہیں پولیس چوکی لجا رہا ہوں۔ دیکھئے آپ کے بچے نے میرا کان بھی کاٹ لیا“

۔۔۔ اس نے اپنا ہولہان کان آگے کر دیا۔

انسپکٹر اور ان دونوں کی بات چیت کڑی زبان میں ہو رہی تھی جو

التمش کی تو سمجھ میں آگئی کیونکہ ان کا تعلق اسی خطے سے تھا۔ لیکن کاکل اس کا

ایک لفظ بھی نہ سمجھ پائی۔ اس نے دیکھا التمش سنجیدہ بنے رہنے کی کوشش

کر رہے تھے۔

”شہزاد نے اسی کا ہاتھ کاٹا تھا“۔۔۔ زینو نے چلا کر داڑھی والے کی

طرف انگلی اٹھائی۔

وہ شخص دونوں بچوں کی طرف اس طرح سہما ہوا دیکھ رہا تھا جیسے وہ

ما فوق الفطرت ہوں۔ انسپکٹر نے تفتیش کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ وہ

داڑھی والا کوئی عادی مجرم نہیں تھا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ کسی کا بچہ اٹھا لو

تو پیسہ مل جاتا ہے۔ بد قسمتی سے اس نے ان آفتوں کو مول لیا۔ ان دونوں

نے اسکے گھر میں وہ غدر مچایا کہ اس کی بوڑھی وہی ماں نے کہا کہ یہ عام بچوں جیسے نہیں ہیں۔ یہ انگریز کے بچے معلوم ہوتے ہیں۔ خیریت اسی میں ہے کہ انہیں حفاظت سے واپس کر دو۔

داڑھی والا جو شدید ار دو جانتا تھا ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

”میں بھوت (بہت) گریب (غریب) سرکار“۔۔۔ اس نے کہا اور اپنے کان پکڑ لئے جیسے وہ اب کبھی ایسا کام نہیں کرے گا۔ اس کے ہاتھ پر شہزاد کے کانٹے کا زخم تازہ تھا۔

”اس سے کہو کہ چودہ انجکشن لگوائے جا کر“۔۔۔ التمش نے دبی زبان سے کاکل کے کان میں کہا۔

”ہا۔ ہا۔۔۔!“ کاکل کو اس پر ترس آیا۔

”گھنٹہ بھر پہلے تو تم اس کے لئے سولی کھڑی کر رہی تھیں“۔۔۔ التمش مسکرا کر بولے۔ انہوں نے انسپکٹر سے سفارش کی کہ دونوں کو چھوڑ دیا جائے۔

”انسپکٹر نے انہیں رہا کر دیا۔ اور التمش نے کچھ روپے نکال کر داڑھی والے کو دیئے۔

”میرا بھی کان کاٹا تھا“ کن کٹے نے بھی ہمتی گنگا میں ہاتھ دھونے چاہے

”بھاگ جا، ننیں تو میں تیرا دوسرا بی کان کاٹتا“۔۔۔ انسپکٹر نے کہا اور وہ تیر کی طرح بھاگ نکلا۔

”میرے کو بی انعام ملنا چاہیے سر“۔۔۔ انسپکٹر نے التمش سے کہا۔

”ہاں، ہاں ضرور۔۔۔۔۔ التمش نے جیب سے والیٹ نکالی۔

”یہ نہیں۔۔۔۔۔ انسپکٹر نے انہیں ہاتھ سے روک دیا۔ التمش اچنبھے میں پڑ گئے۔ پولیس میں رشوت کا رواج تو پیسے ہی کا تھا۔

”میرے کو انعام کے واسطے ان دونوں میں سے ایک کو چھوڑنا۔۔۔۔۔ انسپکٹر نے ہنستے ہوئے انوکھی رشوت مانگی۔۔۔۔۔ التمش اور کاگل ہنس پڑے۔

زمینو اور شہزاد کے لئے بھی یہ لمحہ فکر یہ تھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں پہل بھر کے لئے ان کی بات ہوئی اور شائد قرعہ زمینو کے نام گرا۔

”میں فل آجاؤں گا؟“ التمش نے کہا۔

”کل کیوں؟ ابھی کیوں نہیں۔۔۔۔۔؟“۔۔۔۔۔ التمش نے پوچھا۔

”میں اپنا میڈی چھوڑ آیا ہوں نا۔۔۔۔۔“ سبھی ہنس پڑے۔

پولیس کی جیب میں وہ سب روانہ ہو گئے۔

شہزاد اور زمینو کو دسہرے کے ہنگامے اور گھما گھمی ہی کافی نہیں تھی بلکہ چھک چھک ٹرین سے واپسی کا سفر ایسی نعمت تھی جو انہیں پہلی بار نصیب ہو رہی تھی۔

دسہرے کے میلے میں انہیں شاپنگ کی کھلی چھوٹ تھی۔ یکشاگان، مکھوٹوں، غباروں اور چٹا پٹنم کے لکڑی کے کھلونوں کے علاوہ وہ ہر چیز جو ان کی نظر کو گر ویدہ کر لیتی خریدی جاتی۔ شہزاد تو سارے کا سارا خریدنے پر محل گیا۔

”دیکھ لینا اب یہ مہاراجہ کے محل کی بولی لگائے گا۔“۔۔۔۔۔ التمش بولے

اور کاکل دونوں کی انگلیاں تھامے آگے بڑھ گئی۔

اس کا چہرہ بدن، کمر تک جھولتی چوٹی۔۔۔ جسے اس نے جوڑے کی شکل میں باندھ لیا تھا۔ اب بچوں کی تلاش اور افراتفری میں کھل کر پشت پر جھول گئی تھی۔ التمش نے چاہا اپنی نظریں ہٹالیں لیکن جیسے وہ اسیر ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ یہ سوچ سوچ کر جھٹلا جاتے کہ وہ، ایں قدر سی لڑکی ان کے احساسات پر کیسے چھا گئی تھی۔ اس نے انہیں تنگدل اور حاسد بنا دیا تھا۔ انہیں کاکل کا مسیح سے ہنسنا بولنا بھی گوارا نہیں ہوتا تھا اور اس کا ذمہ دار وہ کاکل ہی کو ٹہراتے تھے کہ مسیح کو آسان نشانہ جان کر وہ اسی پر کند پھینک رہی تھی۔

میوئل پہنچ کر انہوں نے اپنا مختصر سامان کار میں رکھا اور میو پلانم چلے گئے۔ اسٹیشن پر التمش نے ڈرائیور کو کار سے اوٹی واپس ہو جانے کے لئے کہا۔ اور خود کاکل اور بچوں کے ساتھ ٹرین کا انتظار کرتے رہے۔

میو پلانم مغربی گھاٹ کے دامن میں چھوٹا سا اسٹیشن ہے جہاں نیلگری ایکسپریس سے آنے والے سیاح۔ چھوٹی سی، چھک چھک ٹرین سے اوٹی پہنچائے جاتے ہیں۔ یہیں سے بلندی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ہولے ہولے آگے بڑھتی یہ ٹرین۔ قدرت کے خوشگوار ترین مناظر سے گزرتی۔۔۔ گنگناتی اوپر چڑھتی چلی جاتی ہے۔ احتیاط کے مد نظر پٹریوں کے ساتھ تیسری پٹری بھی موجود ہوتی ہے تاکہ انجن فیل ہو جائے تو تیسری پٹری میں لگے ہوئے گیر کی طرح کے کھانچے ٹرین کو حادثے سے بچائے رکھیں۔

فضاء میں یو کلبٹس کی خوشبو نے ماحول کو اور بھی خوشگوار کر دیا تھا میور سے آتے ہوئے کاکل نے احتیاطاً بچوں کے گرم کپڑے ساتھ رکھ لئے تھے لیکن اپنی شال کار میں بھول آئی تھی۔ میور میں چنداں گرم کپڑوں کی ضرورت نہیں پڑی۔ لیکن اب جوں جوں ٹرین اوپر چڑھتی گئی اسے اپنی شال یاد آنے لگی۔

التمش نے التبتہ سفر شروع کرتے وقت ٹی شرٹ پر اپنی لیڈر جیکٹ پہن لی تھی۔ اتنی سردی نہیں تھی کہ وہ اس کی زپ بند کر لیتے۔ انہیں نمناک سرد موسم کی عادت تھی۔۔۔ انہوں نے اپنی جیکٹ اتار کر کاکل کے کندھوں پر ڈال دی۔

”نہیں۔۔۔ میں یو نہی ٹھیک ہوں“۔ کاکل نے جھوٹ کہا۔
 ”پہاڑوں کا موسم اچانک بدلتا ہے“۔۔۔۔۔ التمش نے گویا پیش گوئی کی۔ واقعی ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی تھی۔۔۔ لیکن کچھ دور آسمان بالکل نیلا تھا۔ سفید بادل دھنسنے ہوئے روئی کے گالوں کی طرح تھے جو لاجوردی آسمان کی ستر پوشی کی کوشش کر رہے تھے۔

کھٹا کھٹ، کھٹا کھٹ، اوپر چڑھتی ٹرین۔۔۔ نیچے وادی میں زمری پتے سورج کی ہر کرن سے تاوان وصول کر رہے تھے۔ ہلکی پھوار میں گویا کئی خوشبوئیں جاگ پڑی تھیں۔ جن کی غیر مانوس سی مہک میں مٹی کی سوند اہٹ بھی شامل تھی لیکن کاکل کی قوت شائقہ پر سب زیادہ حاوی اس جیکٹ کی مہک تھی جو التمش نے ابھی ابھی اس کے کندھوں پر ڈالی تھی۔ اور وہ پھر اس وادی

ممنوع، میں نکل آئی تھی جہاں، درد گنہام کا کوئی علان نہیں تھا۔ اس نے خود کو سنبھالا۔۔۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں التمش اس کی ذہنی کیفیت سے آگاہ نہ ہو جائیں۔۔۔ وہ ایک مہذب دنیا سے تعلق رکھتے تھے۔ کسی لڑکی کو ٹھٹھرتا دیکھ کر اس کی مدد کرنا ایک لاشعوری عمل تھا۔ وہ کاکل ہی تھی جو ایک اخلاقی رویے میں بہت کچھ تلاش کرنے لگی تھی۔ اس نے خود کو ملامت کی اور سنبھل کر بیٹھ گئی۔ وہ قدرتی مناظر کی دلدادہ تھی سہرے سے ٹکراتی سرد ہوا اسے تقویت دینے لگی۔ اسے ہمیشہ چہرے پر ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اچھے لگتے تھے

التمش اپنے کیرے سے تصویریں لینے میں مشغول تھے۔

”بس، بالکل اسی طرح بیٹھی رہو“ التمش نے کہا اور وہ چونکی۔ تب اسے احساس ہوا کہ شہزاد اور زمینو اپنے چہروں پر یکشاگان کے مکھوٹے لگائے اس سے لپٹے ہوئے تھے۔

”Beauty and the beast“۔۔۔ التمش نے مسکرا کر

کیرہ بند کرتے ہوئے کہا۔

ساتھ سفر کرنے والا ایک عمر رسیدہ جوڑا انہیں دلچسپی سے دیکھ کر مسکرانے لگا تھا۔

گھر پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔ ڈورا اور خانسا ماں نے سارے انتظام چوکس رکھے تھے۔ کاکل نے بچوں کو نہلا کر شب خوابی کے کپڑے پہنائے کھانا کھلایا۔ ان کی خریدی ہوئی چیزیں ٹھکانے پر لگائیں۔ وہ دونوں سونے

کے لئے تیار ہی نہیں ہوتے تھے۔ آخر جب کاکل نے اجازت دی کہ وہ اپنا اپنا سامان سرہانے رکھ کر سو سکتے ہیں تب کہیں وہ راضی ہوئے لیکن اس نیند نے جو ان کی آنکھوں سے کوسوں دور معلوم ہوتی تھی۔ تکیوں سے سر لگتے ہی انہیں آدبوچا۔

ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اس نے خود پر توجہ دی۔ گرم غسل نے اس کے تھکے ہوئے جسم کو تقویت دی۔ میوڑ اور وہاں کے شور شرابے کے بعد کوٹھی اور وہاں کاسکون بہت بڑی نعمت تھا۔ اپنی ساری ٹکان کے باوجود اسکے دل میں ایک ترنگ تھی۔ خوشگوار سی نامعلوم سی جیسے وہ کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتی تھی۔ زندگی میں کچھ لمحے زندہ جاوید بن جاتے ہیں یہی لمحے تو زندگی کا حاصل ہیں جیسے اندھیری رات میں کوئی ٹوٹا ہوا ستارہ روشن سی لکیر چھوڑ کر کالعدم ہو جائے۔

اس کا دل بے اختیار چاہا کہ خدائے برتر کے آگے اپنا سر جھکا دے اور وہ سب کچھ کہدے جو اس کے دل میں تھا۔ دراصل زندگی میں بہت کم مواقع ایسے آتے ہیں جب تہہ دل سے دعا کے لئے ہاتھ اٹھتے ہیں۔ اس کا اساس یہی اس معبود حقیقی پر کامل بھروسہ اور اعتقاد جس کو ہم جانتے نہیں اس کے آگے اپنا دل کھول کر نہیں رکھتے۔ اپنے راز ہم اسی کو بتاتے ہیں جس پر ہمیں کامل بھروسہ ہو۔ اور کاکل کا راز تو اس کی زندگی کا حاصل تھا وہ کیسے اسے عام کرتی۔ اس نے سوچا آج بس اپنا دل کھول کر رکھ دے۔ وہ سب کچھ اس خداوند عظیم سے مانگ لے جو اس کے احساس کی گہرائیوں سے آتش فشاں بن کر

اہل رہا تھا۔

وہ ڈائننگ روم میں پہنچی لیکن التمش وہاں نہیں تھے۔ ”چھوٹے سرکار نے آکسو آفس میں بلایا ہے“ خانساں نے کہا۔ وہ لائبریری کو ہمیشہ آفس کہا کرتا تھا۔ التمش کی پلیٹ انکے آگے جوں کی توں رکھی تھی۔ اسکا یہ مطلب تھا کہ وہ ابھی ڈائننگ روم پہنچے ہی نہیں تھے۔ وہ شش و پنج میں پڑ گئی۔ ایسی کونسی ایرجنسی تھی کہ التمش نے کھانے پر آفس کو ترجیح دی حالانکہ وہ خود بھی تھکے ہوئے ہونگے۔ لیکن کاکل نے کبھی انہیں تھکا ہوا یا منڈھاں نہیں دیکھا تھا۔ ٹینس کی کئی سیٹس کھیل کر آئے ہوں یا رائیڈنگ سے۔

جب وہ لائبریری پہنچی تو التمش کو ٹیبل پر مصروف دیکھا۔ انہوں نے نیلے رنگ کا ڈریسنگ گاون پہنا ہوا تھا جو کاکل کے آمد کے پہلے دن اس یادگار ملاقات پر پہنا تھا، غسل کے بعد انکے چپکے ہوئے بال اب سوکھتے اپنی اصلی شکل لے رہے تھے۔ انکی چوڑی کلائی والے ہاتھ کی دراز انگلیوں کے بیچ سگریٹ جل رہا تھا جسکی خوشبو لائبریری کی خوشگوار مہک میں گھل مل کر ایک نئی انوکھی خوشبو کو جنم دے رہی تھی۔ وہ کسی سوچ میں گم تھے۔ ٹیبل پر رکھی ہوئی کتابیں دیکھ کر اچانک اسے یاد آیا کہ اس نے مسیح کو دی ہوئی کونپل جلدی میں ایک کتاب میں دبارکھ دی تھی۔ مسیح کا تحفہ وہ کھونا نہیں چاہتی تھی اس نے کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھیں۔

”کچھ کھو گیا ہے؟“ التمش نے پوچھا۔ انکے تیور بدلے ہوئے تھے۔

”ہاں میں نے ایک کتاب رکھی تھی“۔ کاکل نے تلاش جاری رکھی۔

”وہ یہ تو نہیں“ انہوں نے کتاب کاکل کی طرف بڑھا دی۔ لسنے اشتیاق سے لیکر اسکے صفحات کو ہوا دی لیکن وہ کوئیل اور وہ نوٹ غائب تھے کاکل چپ ہو رہی۔ کوئیل کی تلاش بے سود تھی۔ اور وہ کوئی اتنی اہم بات بھی نہیں تھی۔

”آپ نے مجھے بلایا؟“

التمش نے اسے آگے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ابھی وہ بیٹھنے بھی نہیں پائی تھی کہ انہوں نے ایک ٹیلیگرام اسکی طرف بڑھا دیا۔

”یہ سب ہمارے یہاں ٹھہریں گے“۔ التمش نے ٹیلی گرام کی طرف اشارہ کیا۔ ان کے ٹھہرنے کا انتظام آپ کو کرنا ہوگا۔“

تار میں چار نام لکھے تھے ان میں ایک نام وردو فرانس تھا ایک چینی چیاوزو اور دو انگریز ایک امریکی تھی جن میں ایک عورت بھی تھی کیرون وارڈ۔ کاکل کو اندازہ لگانے میں مشکل نہیں ہوئی کہ یہ سب التمش کی اس جماعت سے تعلق رکھتے تھے جو بدیشیوں کے ہندستان میں عمل دخل پر ریسرچ کر رہی تھی۔ تاریخ کے عمل کے لئے تین اہم چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک تو آثار قدیمہ کا جائزہ دوسرے تحریری دستاویزات اور تیسرے وہ روایات جو سنیہ بہ سنیہ چلی آتی ہیں۔ کاغذی تیاریاں اور دستاویزات کافی فراہم ہو چکی تھیں۔ اب شاید التمش کا عملی دور شروع ہونے والا تھا اور کاکل کا آزمائشی۔

ظاہر ہے مہمان نوازی کی ذمہ داری اسے اس لئے سونپی جا رہی تھی کہ مسیح وہاں موجود نہیں تھا۔ لیکن وہ کہاں تک اس کی اہل ہو سکتی تھی۔

اہوں نے سوچا ہوگا کیونکہ کاکل کی موجودہ ذمہ داریاں ہی اسے ایک پل کی فرصت نہیں دے رہی تھیں۔ ایم اے کا نصاب کبھی کاا کر رکھا تھا۔ لیکن وہ اس پر مناسب توجہ نہیں دے پا رہی تھی ایک تو اس نے خود ہی اپنا کام بڑھا لیا تھا جس سے اب مفر نہیں تھا۔ ایک بار بارش ہو جائے تو بادلوں میں پانی کو واپس نہیں رکھا جاسکتا۔ لیکن وہ التمش کے سامنے اپنی مجبوری ہرگز ظاہر نہیں ہونے دیگی کیونکہ شاید وہ جان بوجھ کر اسے اس آزمائش سے گزارنا چاہتے تھے۔ اس نے فیصلہ کر لیا۔

اب رہے التمش کے تیور۔۔ ان کو بدلتے دیکھ کر وہ چونک ضرور ہڑتی تھی لیکن یہ کوئی پہلا موقعہ نہیں تھا جو وہ ان کا تلون طبع دیکھ رہی تھی۔ اس نے تجزیاتی ذہن پایا تھا۔ ماضی میں ان کا ہلکا پھلکا برتاؤ غالباً اس میں ذہنی تناؤ دور کر کے خود اعتمادی پیدا کرنے کی ایک کوشش تھی جس نے اپنا کام ضرور کیا تھا۔ ابتداء میں جو قدرتی جھجک اور التمش کی ذات سے مرعوبیت اسے محسوس ہوتی تھی اس میں اب کافی حد تک کمی آگئی تھی۔ اس نے گھنٹوں ان سے بحث مباحث کئے تھے۔ ان سے اختلاف و انحراف کیا تھا اب بھی اگر وہ چاہتی تو صاف انکار کر سکتی تھی کہ کوٹھی میں آکر رہنے والوں کی مہمان نوازی اس کی ذمہ داری نہیں تھی لیکن التمش کے روکھے پھیکے کاروباری انداز نے اسے بھی ضد پر آمادہ کر دیا۔ وہ اس مغرور شخص کو بتا دیگی کہ اس کی شخصیت کے اور بھی کئی پہلو تھے لیکن ان کے اگلے جملے نے اسے چونکا دیا۔

”میری طرف سے آپ اسے نئے جاب کا آفر سمجھ سکتی ہیں۔“

”نیا جاب!۔۔۔ آفر!“ کاکل کو ٹھی اور کو ٹھی کے لیکنوں اور روزمرہ کی زندگی میں اتنی رچ بس گئی تھی کہ وہاں اپنی حیثیت بھول ہی گئی تھی۔
التمش کی طرف سے اس آفر نے اسے گنگ کر دیا۔

”آپ کے یہاں آنے سے پہلے میں نے کوشش کی تھی کہ اپنے اسکول کے زمانے کی ایک شفیق ریٹائرڈ استانی، مس پریرو، شہزاد اور زینو کی ذمہ داری سنبھال لیں لیکن تب ان کی مجبوریاں ایسی تھیں کہ انہوں نے معذرت کر لی تھی۔ اور جب انہوں نے رضامندی ظاہر کی تب آپ آچکی تھیں۔“

کاکل کے گلے میں پھندا سا لگ رہا تھا۔ ”تو آپ چاہتے ہیں اب مس پریرو ہی شہزاد اور زینو۔۔۔“

”Exactly“ التمش نے دھیرے سے کہا ”آپ غالباً سمجھ گئی ہونگی کہ ہماری ریسرچ کا عملی دور اب شروع ہونے کو ہے۔ آپ کی مصروفیات بڑھ جائیں گی۔ تب میں چاہتا ہوں کہ زینو اور شہزاد کا کوئی مناسب انتظام رہے۔“

ان کی بات سن کر کاکل کا دل دکھ گیا۔ حلق کا وہ بھرا ہوا پن جو کچھ دیر سے اسے محسوس ہو رہا تھا آنکھوں کی طرف سیال بن کر بڑھنے لگا۔ وہ پلٹ گئی التمش کا فیصلہ ہرگز نامناسب نہیں تھا۔ ایک آجر کی حیثیت سے وہ اسے ایک نیا جاب آفر کر رہے تھے جسے منظور کرنا یا نہ کرنا اس کے اختیار میں تھا۔ لیکن

وہ سراسر اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ شہزاد اور زینو اس کی کمزوری بن چکے تھے۔ اور وہ ان ہی کو اس سے چھین رہے تھے۔ نہ صرف استنا ہی بلکہ زینو اور شہزاد پر بھی یہ ظلم تھا۔ ان کی چھوٹی سی زندگیوں میں کاکل نے ایک رفیق، ایک ہمدرد ساتھی کی جگہ بنالی تھی۔ انہیں اس سے محروم کیا جا رہا تھا۔ یہ جذباتی اور حسیاتی تشدد نہیں تو اور کیا تھا؟ وہ عاجل فیصلوں کی عادی نہیں تھی وہ چاہتی تھی کہ کھانے کے بعد اپنے کمرے میں پہنچ کر اس بارے میں سوچے تب ہی وہ طے کر سکے گی۔ رات ویسے بھی گہری ہو چکی تھی۔ اس کا خیال غلط تھا کہ التمش ہال تک نہیں پہنچے تھے دیر تو اسے وہاں آنے میں ہوئی تھی۔

التمش جب ڈائیننگ ہال میں پہنچے تھے تو وہاں کاکل نہیں تھی۔ انہوں نے سوچا کہ جب تک وہ لائبریری کا ایک چکر لگا کر دیکھ لیں کہ کونسی ڈاک آئی تھی۔ وہ تقریباً چار دن غیر حاضر رہے تھے۔ کافی ڈاک جمع تھی جس میں وہ نیلی گرام بھی تھا انہوں نے سوچا کہ جو کتابیں کاکل نے جلدی میں ٹیبل پر ہی رکھ چھوڑی تھیں انہیں اٹھا کر شیلف میں سجادیں۔ لیکن پہلی ہی کتاب میں انہیں مسیح کی دی ہوئی وہ کوئیل ملی جس کے ساتھ کاکل نے لکھا تھا Masih I miss you دیکھتے ہی دیکھتے ان کی شگفتہ مزاحیہ پرواز کر گئی کاکل کے بارے میں شک و شبہات جنہیں انہوں نے وہم سمجھ کر تقریباً بھلا دیا تھا۔ دوبارہ عود کر آئے۔ ابھی چند لمحوں پہلے انہیں جو شدت کی بھوک لگی تھی کافور ہو گئی۔ کاکل اس ساری واردات سے بے خبر اپنے دل میں ایک

ایک چٹکی سی لی۔ ابھی کل ہی کی بات جب ٹرین سے اوٹی آتے ہوئے پہلی بار اسے وہ احساس ہوا تھا جسے عام طور پر محبت کہا جاتا ہے۔ اس نے بہت کوشش کی تھی کہ التمش سے محبت کے اس اقرار کو اپنے دل میں جگہ نہ دے۔ خود کو جھٹلاتی رہے۔ لیکن اب یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح اس پر واضح ہو گئی تھی۔ جس سے انکار محض ہٹ دھرمی تھی۔ خوشی و مسرت انسان کو تجزیاتی نقطہ نظر عطا کرتی ہے۔ کاکل اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتی تھی کہ التمش کی قربت نے کئی بار اسے ایسے لمحے عطا کئے تھے جنہیں وہ اپنی زندگی کا حاصل سمجھ سکتی تھی۔ اس غیر مشروط اقرار کے بعد اس میں دو تبدیلیاں آئی تھیں۔ اس نے بالغ نظری سے طے کیا تھا کہ محبت یکطرفہ بھی ہو سکتی ہے کیونکہ اسے یقین تھا کہ التمش کی طرح کے لوگ محبت کو تصنیعِ اوقات سمجھتے ہیں اور دوسری جانکاری کو اسی جانکاری کا ردِ عمل کہا جاسکتا تھا جو اس کے لئے زیادہ اہم تھی وہ یہ کہ خود کو التمش کا کھلونا بننے سے بچائے رکھے۔ اگر وہ اپنی انا میں سرشار تھے تو اسے بھی اپنی خودداری پر ناز تھا۔ محبت ایک لطیف جذبہ ضرور ہے لیکن وہ اپنی سطح سے گر کر اس کی پابجائی نہیں کر سکتی تھی۔ اور اب تو وہ خدشہ ہی ختم ہو چکا تھا۔ التمش نے خود ہی اس کے اور اپنے درمیان فاصلہ بڑھالیا تھا۔ اس کی وجہ صاف تھی۔ انہیں محبت پیشے سے اور صرف اپنے پیشے سے تھی۔ ریسرچ کے ابعادی مراحل، خاندانی بکھیروں کی یکسوئی، ماں باپ اور بہن کی مفارقت کا صدمہ۔ انکا دل جب ان مسائل سے فرار ڈھونڈتا تو انہوں نے کاکل کو دل جوئی کا سہل مرکز سمجھا تھا۔ اور کاکل کو یقیناً

اس کی شکست ان سے تھی لیکن اب بیٹے ہوئے لمحوں کی گرد جھٹکنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ اس میں اس کی ناتجربہ کاری کا بھی دخل تھا۔ اور اب تجربے نے اعتماد اور خود پر بھروسہ کرنا سکھا دیا تھا جو اس کی سملجی اور انفرادی بقا کے لئے ضروری تھا۔ وہ کوئی سوہنی نہیں تھی کہ کسی مہیوال کے فراق میں کچا گھڑالے دریا میں کود پڑتی۔ اسے اتنا تو یقین تھا کہ زندگی میں اب کوئی اور التمش کی جگہ نہیں لے پائیگا لیکن وہ اپنا معصوم دل کی اس ٹھوکر کو زندگی اور موت کا سوال بنانا نہیں چاہتی تھی۔

مسح کو گئے ہوئے پندرہ دن ہو گئے تھے۔ اسے کرسمس سے پہلے واپس ہونا تھا اور اب کرسمس کے لئے دو چار دن ہی بچے تھے وہ اگر موجود ہوتا تو کاکل کا ہاتھ بٹاتا۔ اب سب کچھ کاکل ہی کو کرنا تھا، کوٹھی میں رہائشی کمروں کی کمی نہیں تھی بلکہ اوپر والے کمروں کا مشرقی یونٹ یونہی بند پڑا رہتا تھا۔ یہ کمرے بھی اور کمروں کی طرح ہوادار اور کشادہ تھے۔ آنے والے مہمان بھی بھانت بھانت کے تھے۔ کاکل نے قیاس آرائی کی۔ تین مہمان جو مرد تھے۔ ان کے کمروں کی سجاوٹ کے بارے میں طے کرنا مشکل نہیں تھا۔ آرام دہ اور پریکٹیکل فرنیچر اور قالین اور پردے کافی تھے۔ لکھنے پڑھنے

کے لئے ٹیبل کرسی اور روشنی کا انتظام ہر کمرے میں ضروری تھا۔ چینی آرکیالوجسٹ کے کمرے میں التبتہ ضروری اشیاء کے ساتھ کاکل نے ایک دو چیزوں کا اضافہ کر دیا۔ مینٹل پیس پر پور سلین Laughing

Buddha رکھ کر دیوار پر چینی Scroll لٹکا دیا جس پر بہترین چینی سوزن

کاری کی ہوئی تھی تاکہ چینی مہمان چیاؤزو کو ”گھر“ کالس ملتا رہے۔ اس کے علاوہ ایک شلف میں ایک چھوٹا سا بجلی کا Tea Maker جیسمن چائے کا ڈبہ اور بہترین چینی فنجان بھی رکھ چھوڑے کیونکہ چینی چائے کے رسیا ہوتے ہیں۔

کیرن کے لئے البتہ زیادہ اہتمام کی ضرورت تھی کیونکہ عورت خواہ کسی عمر کی ہو زیادہ باریک بین اور نفاست پسند ہوتی ہے اس لئے کاکل نے خود اپنے کمرے سے کشمیری رائٹنگ بیورو جو بہترین صنعت کاری کا نمونہ تھا اٹھوا کر کیرن کے کمرے میں رکھوا دیا۔ کاکل نے اس کمرے کی کراسکیم اور فرنیچر پر بھی خاص توجہ دی تھی حالانکہ اس کے لئے اسے ڈرائیور کے ساتھ بازار جانا پڑا تھا تاکہ فرنیچر اور قالین کے مطابق پردے خریدے۔ پردے اسے خود سینے پڑے لتنے کم وقت میں کوئی ٹیلر اس کے لئے تیار نہیں ہوا تھا کیونکہ کرسمس کا کام ہی ان کے لئے بہت تھا اس نے لائبریری سے بائبل کا ایک نسخہ کیرن کے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ اس کا قیافہ کہتا تھا کہ کیرن وارڈ اس اہتمام کو ضرور پسند کریگی۔

جب التمش مہمانوں کو لئے واپس پہنچے تو کاکل بچوں کے ساتھ شام کی سیر سے واپس ہو رہی تھی۔ وہ سب ہی مہذب اور سنجیدہ قسم کے لوگ تھے۔ ”میری ساتھی مس کاکل حسین“ التمش نے تعارف کروایا۔

”فیو!! کس دنیا سے حاصل کیا ہے انہیں؟“ امریکن نیل کرو کرنے سیٹی بجا کر گرجموشی سے کاکل سے ہاتھ ملا کر کہا۔

مسکرا کر سر جھکاتے چینی ڈاکٹر چیا زو کی کرنچی آنکھیں سلوٹوں میں چپ گئیں۔ فرانسیسی وردو نے جھک کر کاکل کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔
انگریز کیرن وارڈ نے "Hi" کہا اور آفتاب کے شانے سے جھول گئی

"زمینو اور شہزاد۔۔۔ میرے دو توام بھانجے۔"

کاکل کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ زمینو اور شہزاد نے خود ہی اپنے ہاتھ بڑھادے۔

"دو سے کیوں ملواری ہو، ایک ہی سے تعارف کافی تھا" کیرن نے جھک کر ان کے رخساروں پر بوسے دئے۔ "یہ دونوں جڑواں ہیں نا؟"
وردو نے انہیں بچپن میں دیکھا تھا۔ اس لئے سب کو بتایا کہ شہزاد نے کس طرح اس کے کپڑے گیلے کر دئے تھے۔

"اب تو میں ہاتھ روم جانے لگا ہوں" شہزاد نے فخر سے کہا۔
"میں بھی۔۔۔۔ زمینو نے بتایا۔"

کیرن کاکل کی توقع کے خلاف کافی کم عمر تھی۔ اسکی عمر بمشکل پچیس چھبیس سال ہوگی۔ جبکہ وردو نے نوجوانی کے دور کو بہت چمچھے چھوڑ دیا تھا۔
نیل کروکر ایک آزاد منش نوجوان تھا چیا زو کی عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔
چینیوں کی جلد ہی ایسی ہوتی ہے کہ درپردہ بڑھتی ہوئی عمر راز ہی بنی رہتی ہے

کیرن کا تعارف کراتے وقت آفتاب نے بتایا کہ وہ ان کے شفیق پروفیسر ایکلس وارڈ کی بیٹی ہے۔ وہ "Pleistocene Geology"

کے بہت بڑے ماہر تھے۔ افسوس کہ جیالوجی کا یہ ماہر چلی کی کھدائیوں کی نذر ہو گیا تھا۔ ”پروفیسر وارڈ آر کیا لوجی“ کے بہت ہی محترم ماہر مانے جاتے تھے۔

خانساں خاص کر وردو کی آمد سے بہت خوش تھا۔ دنیا اپنے قدردانوں کو کبھی نہیں بھلاتی۔ وردو نے اسے Cordon Bleu کا نام دے رکھا تھا جو کھانے پکانے کے فن کا اعلیٰ ترین ماہر مانا جاتا ہے

خانساں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لئے بے چین تھا۔ کیونکہ عیسائی مہمانوں کی آمد پر التمش نے اپنی طرف سے کرسمس ڈنر دینا طے کیا تھا۔ جس میں اپنے کچھ قریبی حلقے کے لوگوں کو مدعو کیا تھا۔ ان میں فادر بینیڈکٹ بھی شامل تھے۔ جو Love Dale میں التمش کے پرنسپل رہ چکے تھے۔ گو انہیں ریٹائر ہوئے عرصہ گزر گیا تھا لیکن التمش نے اب بھی ان سے اپنے تعلقات قائم رکھے تھے۔ ان کی شخصیت بنانے میں فادر بینیڈکٹ کا بڑا حصہ تھا۔ اسی دن کو ٹھی میں اگلی آمد مسیح کی تھی۔

”مسیح کب آئے؟“ کاکل نے اسے اپنے دروازہ پر کھڑا دیکھ کر مسرت

سے کہا

”مسیح اسکے لئے بے لوث استقبال کو مسکراتا ہوا دیکھتا رہا۔

”یہ کیا عاشقوں کی صورت بنا آئے ہو۔ اچھے بھلے گئے تھے۔“ کاکل نے

ٹھیک ہی کہا تھا۔ مسیح سرخ و سفید رنگ سا نولا گیا تھا۔ اس رنگ پر اس کی نیلی آنکھیں اجنبی لگ رہی تھیں۔ لیکن جس چیز نے کاکل کو فکر مند کر دیا وہ اس کی آنکھوں میں گھلی مدھم سی اداسی تھی۔

”مسیح کیا بات ہے؟ ٹھیک تو ہوا!“ اس نے قریب پہنچ کر تشویش سے پوچھا۔

”بالکل ٹھیک ہوں، تم کیسی ہو کاکل؟“ مسیح نے اپنے سونے ہوئے انداز میں جان ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

”بندوں کی خدمت میں یہ حشر ہوتا ہے تو خدا کی خدمت میں کیا گت بنتی ہوگی؟“ وہ اپنی چہل پر واپس آگئی۔ ”تم خدمت خلق کے چکر میں گئے تھے نا؟“

”بندوں کی خدمت ہی خدا کی خدمت ہے۔ جہاں میں گیا تھا کاکل وہاں ہر طرف بد نصیبی، غربت اور بیماریاں ہی تھیں۔“

”اور تم وہ سب وہاں ختم کر آئے؟“ کاکل کو مسیح کی حالت زار پر غصہ آنے لگا ”میں کہتی ہوں انسان جب تک اپنی مدد آپ نہ کرے کوئی اس کا مقدر بدل نہیں سکتا۔“

”تمہارا خیال غلط ہے۔ کوئی زخم خود اپنا علاج نہیں کرتا۔ اگر کوئی اور اس کا مداوانہ کرے تو وہ ناسور بن جاتا ہے۔ ہمارے سماج میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جنہیں احساس دلانا پڑتا ہے کہ اپنے زخم کو ناسور نہ بننے دیں۔“

”تأمل سے ملاقات ہوئی؟“ کاکل اس وقت بحث کے موڈ میں نہیں تھی۔

”نہیں ابھی آیا ہوں، تمہیں یہ دینے چلا آیا۔“ مسیح نے اپنا ہاتھ آگے کر کے ایک نہایت ہی خوبصورت ڈبہ دیا۔

”میرے لئے تحفہ ہے؟“ کاکل نے اشتیاق سے ڈبہ کھولا۔ ڈبے میں بند وہ ایک بیش قیمت جیڑ میں ترشا ہوا محبت کے دیوتا کیو پڈ کا مجسمہ تھا۔

”مسح یہ میں نہیں لے پاؤں گی۔ یہ بہت قیمتی ہے“ اس نے قطعیت سے کہا۔

”یہ جس چیز کا دیوتا ہے وہ اس سے بھی زیادہ قیمتی ہے کاکل“ اس نے کاکل کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”جو کچھ بھی ہو مسح۔ میں یہ نہیں لوں گی۔ میں نے آج تک کسی سے اتنے قیمتی تحفے نہیں لئے۔ مسح کچھ دیر اسے اداس نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس کے لہجے کی قطعیت کو اس نے مسحوس کیا۔ پھر بغیر کچھ کہنے سننے اس نے وہ مجسمہ کاکل کے ہاتھ سے لے لیا اور واپس جانے لگا۔

”مسح“۔۔ کاکل نے اسے روکا۔ اسے اپنی بے رحمی پر خود ہی غصہ آیا۔ مسح ہی تو اس کا ایک سچا دوست تھا اس دنیا میں۔ اسے اس کے تحفے کو ٹھکرانا نہیں چاہیئے تھا۔ قیمتی تحفے غیروں سے نہیں لئے جاتے۔ مسح تو اس کا اپنا مخلص دوست تھا جو دنیا کی ہر طمع اور ہر غرض کو ٹھکر کر اس راہ کار ہر وہ تھا جو سیدھے خدا تک لے جاتی ہے۔

میں نے انکار کیا اور تم موقعہ غنیمت جان کر میرے تحفے سمیت چمپت ہو رہے ہو؟“ اس نے مجسمہ مسح کے ہاتھ سے چھینتے ہوئے کہا۔ کاکل نے وہ مجسمہ اپنے رائٹنگ ٹیبل پر سجا دیا جو اس نے کیرن کے کمرے میں رکھے بیورو کے بدلے خود رکھ لیا تھا۔ وہ مسح کی آنکھوں میں پیدا ہوئی اس مدہم چمک کو

نہیں دیکھ پائی کیونکہ وہ پلٹ کر جا چکا تھا۔

مسیح دراصل اپنے مشن سے ناکام واپس لوٹا تھا۔ اس نے جذام بستی میں اپنی ٹیم کے ساتھ رات دن ایسے کام کیا تھا جیسے خود سے انتقام لے رہا ہو، وہ انتھک محنت کرتا تھا تاکہ کاکل کا خیال اس کے دل سے نکل جائے۔ پھر بھی اپنے اس درد کا مداوا نہ ڈھونڈ سکا جو اس کے اور خدا کے بیچ حائل ہو رہا تھا۔ آخر تھک ہار کر وہ واپس چلا آیا۔

مسیح کے جانے کے بعد کاکل کو رات کے کھانے کے لئے تیار ہونا تھا اس نے دیکھ لیا تھا کہ آنے والے مہمانوں میں کوئی ایسا نیک چرما نہیں تھا کہ تندہی سے تیار ہونے کی ضرورت ہوتی۔ وہ سب اعلیٰ تعلیم یافتہ مفکر سادگی پسند تھے جو اونچی سوسائٹی کے نام نہاد اصولوں سے دور تھے پھر بھی ان کا وقار تھا۔

کاکل نے اپنا تازہ دھلا ہوا کانسی شلوار قمیص پہنا قمیص کا گلا اس کی پسند سے کچھ زیادہ ہی بڑا ہو گیا تھا جس کا اثر کم کرنے کیلئے وہ ہمیشہ ہی موتی کی وہ لڑی پہن لیا کرتی تھی جو اس کی ماں کو عزیز تھی۔ اس کی ماں کی وہی ایک نشانی تھی جو بکنے سے بچ گئی تھی کیونکہ فدا حسین اسے بے مایہ سمجھتے رہے تھے گو اس کا لباس سادہ تھا لیکن اس میں وہ مشرقی حسن کا ایک نمونہ لگ رہی تھی

جب وہ سب کے درمیان پہونچی تو التمش کو اچلتی ہوئی نظر کچھ دیر کے لئے اس پر رک گئی تھی جے صرف مسیح نے دیکھا تھا۔ پھر وہ حسب معمول مہمانوں سے محو گفتگو ہو گئے تھے۔

”کاکول“ کیرن نے جوش سے کہا ”کتنے خوبصورت موتی پہنے ہیں تم نے“ وہ کاکل کے موتی چھو کر معائنہ کرنے لگی۔

”شکریہ“ کاکل نے انکساری سے کہا ”یو نہی معمولی سے ہیں۔“

معمولی نہیں۔۔ اچھے موتی ہیں ”چیاوزو قریب آکر بولا“
Hanadarna یا بے نقص موتی تو ہزاروں میں ایک ہوتا ہے جیسی تم ہو

کاکل نے خجانت سے نظریں چرائیں مگر التمش سے نظر نہ چرا سکی جو
چیاوزو اور اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ اس کے چہرے پر گلابی ہر کو چڑھتا
دیکھ کر وہ معنی خیزی سے مسکرانے لگے تھے۔

”چیاوزو۔ بوڑھے گیڈر“۔۔ نیل کرو کر بولا ”تم اس خوبصورت
لڑکی پر مر مٹے ہو۔ حالانکہ اس سے ہاتھ سب سے پہلے میں نے ملایا تھا۔“
چیاوزو ہنس پڑا اور اس کی آنکھوں کے کنارے جھریاں پڑ گئیں ”لیکن
گلے میں نے اسے پہلے لگایا ہے“ چیاوزو نے شفقت سے کاکل کو پلٹا کر کہا۔
”تھینک یو انکل“ کاکل نے ہنستے ہوئے ”انکل“ پر زور دے کر کہا اور
ایک زوردار قہقہہ پڑا۔

” Hanadarna you have a Sense of
humour“ چیاوزو بولا۔

چیاوزو نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ امریکہ میں گزارا تھا لیکن اس کا بچہ
اور تلفظ اب بھی چینیوں جیسا تھا۔

کاکل کھانا چنوانے کے بہانے وہاں سے بھاگ نکلی۔

خاندانوں نے لوازمات کی تیاری میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا اس کی توجہ کا خاص مرکز اس کا مداح وردو تھا۔ ”وردو کیا آتے ہی تم نے اسے رشوت دی ہے جو گھوم پھر کر تمہاری ہی طرف آ رہا ہے۔“ التمش نے نیپکن کو ہونٹوں سے چھواتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں مردم شناس ہے۔ قدر دانوں کو یاد رکھتا ہے“ وردو نے لقمہ کو منہ میں رکھنے سے پہلے کہا
دنیا چھوڑتے ہوئے اسے بھی
ساتھ لے جاؤں۔“

”پہلے اس کی تینوں بیویوں سے تو اجازت لے لو“ التمش نے کہا ”وہ وہاں تمہاری اچھی خبر لیں گی یہاں بھی تم اسے کیوں لے آئے۔“

ایسا لگتا تھا کہ سفر نے سبھی کی بھوک بڑھا دی تھی۔ حتیٰ کہ کیرن وارڈ بھی مغلیٰ کھانا ڈٹ کر کھا رہی تھی۔ کھانے کے بعد چائے اور کافی کا دور چلا۔ شام میں بارش کے بعد ٹھنڈ بڑھ گئی تھی۔ آشدان میں مدہم شعلوں کی آنچ مزہ دے رہی تھی۔ کھانے کے بعد کاکل نے جھاڑ فانوس اور دوسری تیز روشنیاں بجھا دی تھیں۔ اب صرف ٹیبل اور ایستادہ لمپوں کی مدہم روشنیاں جل رہی تھیں۔ وردو نے اپنا پائپ سلگایا تھا اور نیل کر وکر آشدان کے قریب کھڑا چنگاریوں کو کریدنے لگا۔ کیرن التمش کی پسندیدہ کرسی کے برابر ایک عظیم کش نماسیٹ میں دھنس گئی تھی۔ التمش نے اپنا سگار سلگانے سے پہلے کیرن کا سگریٹ جلایا۔ لائٹر کی روشنی میں کاکل نے

دیکھا کیرن کی نظریں انھیں اور عجیب انداز سے الشمس کے چہرے کا طواف کر کے لوٹ گئیں۔ الشمس کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ تھی جیسے کہ ان کی تمام تر توجہ کا مرکز کیرن ہی ہو۔ کاکل نے خود کو ٹوکا کہ اسے اس قدر تفصیل سے انہیں دیکھنے کی کیا ضرورت تھی۔

”تمہارے باغاں کی چائے مجھے بہت پسند آئی الشمس“ چیاوزو نے الشمس سے کہا ”اور ہاں تمہارا شکریہ خاص کر جیمسین ٹی کے لئے کرتا ہوں جس کا تم نے میرے کمرے میں انتظام کر رکھا ہے۔“ شکریہ کی مستحق مس حسین ہیں“ الشمس نے کاکل کی طرف اشارہ کیا۔

”کاکول کو چیاوزو کے لئے کمرے میں افیون رکھنی چاہیے تھی۔“ کیرن نے سگریٹ کا کش لے کر کہا۔ ”یہ بھی تم انگریزوں ہی کی مہربانی تھی۔ اب وہ مرے کہاں“ چیاوزو نے کیرن کی بات کا براہمانتہ ہوئے کہا۔ وہ سب آپس میں بے تکلف معلوم ہوتے تھے۔ مگر چیاوزو مطلب کی بات کہہ ہی گیا۔

دو سو سال پہلے جب ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا دور شروع ہوا تو انگریز چین سے اپنے لئے چائے لاتا رہا اور جب یہ شوق مہنگا ہونے لگا تب انگریز ذہن رسائے اپنی مشکل آسان کرنے کی ترکیب نکالی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں افیون کی کاشت شروع کی جسے وہ چینیوں کو چاندی کے مول بیچنے لگے اور سستے داموں ان سے چائے وصول کرتے رہے۔ چینی افیون کے غلام بن کر رہ گئے۔ تب انگریزوں نے ہی اپنے مقصد گاہکوں کو دنیا بھر میں بدنام کرنا شروع کر دیا کہ چینی افیون خبی ہوتے ہیں۔ چینیوں کو

ہوش آیا تو انہوں نے اس خباثت کو روکنے کی کوشش کی جس پر انگریز
مشتعل ہو گئے۔ اور چینیوں پر جرمھائی کر دی جسے تاریخ ”تین افیونی جنگوں“
کے نام سے یاد کرتی ہے۔ ہندوستان چنیا بیگم کے ستم سے آزاد رہا۔ یہ بھی
انگریزوں کی چال تھی۔ انہوں نے ہندوستان میں افیون پر امتناع عائد کیا
ہوا تھا تاکہ اپنی مقصد براری کے لئے محض چینیوں ہی کو اس کا عادی
بنایا جائے

”جلتے ہو انگریز آج بھی دنیا میں سب سے زیادہ چائے پینے والی قوم
ہے جو ہر سال ایک سو ملین کلو گرام چائے کی پتی استعمال کرتی ہے“ کیرن
نے فخر سے کہا۔

”کیرن تم نے ہمیں بھی بہت ستایا ہے“ نیل کرو کر بولا ”لیکن ہم نے
بھی تمہیں خوب مزہ چکھایا“

نیل کرو کر کا اشارہ شہرہ آفاق تاریخی واقعہ سے تھا۔ جسے ”بوسٹن ٹی
پارٹی“ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جب انگلستان نے چائے پر ٹیکس بڑھا
دیا تھا تو چائے سے لدے جہازوں کی چائے امریکی شہریوں نے بوسٹن کی
بندر گاہ کے پانی میں پھینک دی تھی۔

کیرن نے اپنا سگریٹ الیٹرے میں بجھایا اور ایسے پوز میں کھڑی
ہو گئی جیسے صلیب پر چڑھ گئی ہو۔ سارا ہال قہقہوں سے گونج اٹھا۔

وردو کی رائے تھی کہ آج کی شام خوش گپیوں کے نام لکھی جائے اور
کام کا سرا اگلے دن سے پکڑا جائے۔ سب نے رضا مندی دیدی۔

کاکل نے جب اطمینان کر لیا کہ سب انتظام پلان کے مطابق چل رہا ہے تو ان سب کو ہال میں چھوڑا اور اپنے کمرے میں چلی گئی لیکن نیند اس سے ابھی دور تھی کیونکہ اسے صبح کی کلاس کے لئے شہزاد اور زینو کی کاپیاں تیار کرنی تھیں۔ وہ اپنے کام میں مہتمک تھی۔ مخالف سمت کی کوریڈور میں کئی قدموں کی چاپ نے بتایا کہ آخر کار مہمان اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔ اسے وہ چاروں ہی پسند آئے تھے۔ جو ایک بہت ہی سنجیدہ پیشے سے تعلق رکھتے ہوئے بھی عام انسانوں کی طرح ہنستے بولتے، ایک دوسرے سے پرجوش بھی کستے۔ پھر بھی ان کا ایک رکھ رکھاؤ تھا جو انہیں عام سطح سے اونچا کئے ہوئے تھا۔

دروازہ پر کھٹکا ہوا۔ کاکل پلٹی۔

”اندر آسکتا ہوں؟“ التمش نے اجازت لی۔ کاکل نے بیاض بند کر دی اور کھڑی ہو گئی۔ التمش اندر چلے آئے۔ ”میں ابھی ان سب کو ان کے کمروں میں چھوڑ آیا ہوں۔“ انہوں نے وضاحت کی۔ ”تمہارے کمرے میں روشنی دیکھی تو سوچا تمہارا شکریہ ادا کرتا چلوں۔“ میں نے ہر کمرے پر نظر ڈالی ہے۔ بہت ہی کم وقت میں تم نے بہت ہی اچھا انتظام کر دیا۔“

التمش کی تعریف نے اس کے دل کی دھڑکن بڑھادی لیکن اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔ کہتی بھی کیا۔ کجخت گلابی ہر تھی جو روکنے کے باوجود چہرے پر چرہی آرہی تھی۔

”تھینک یو پینڈا ڈرنا“ انہوں نے چیاوزو کا دیا ہوا نام دہرایا اور جانے

کے لئے پلٹے۔ اچانک ان کی نظر کیو پڈ کے ٹبے پر پڑی۔ وہ تھا ہی اتنا خوبصورت کہ ان کی نظر چوک ہی نہیں سکتی تھی۔

”بہت خوب“ التمش کے منہ سے نکلا اور انہوں نے وہ مجسمہ اٹھالیا اور اسے ہر طرف سے دیکھنے لگے ”میں نہیں جانتا تھا کہ آرٹ میں تمہارا ذوق اتنا اونچا ہے“ انہوں نے بے لاگ تعریف کی اور تبھی ان کی نظر ٹبے کے نیچے اس چھوٹی سی سل پر پڑی جس پر وہ اپنا ایک پاؤں جمائے کھڑا تھا۔ وہاں ایک کاغذ پر لکھا تھا ”اس کے لئے جسے بھلانا ممکن نہیں“ اور نیچے مسیح کے دستخط تھے۔ التمش نے باواز بلند پڑھا گویا کوئی اہم دستاویز پڑھ رہے ہوں۔ کاکل نے خود ابھی تک وہ کاغذ وہاں چسپاں نہیں دیکھا تھا۔

”بہت قیمتی تحفہ ہے۔۔۔۔ اور شاید اتنا اہم بھی“ گو التمش نے اپنے لہجے کو سادہ بنانے کی کوشش کی لیکن وہ کانٹوں بھرا پیام کاکل کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ ”حیرت ہے مسیح نے واپس آکر مجھ سے ملنا ضروری نہیں سمجھا“۔۔۔ کاکل کہنا چاہتی تھی کہ مسیح کو آئے ہوئے ابھی چند گھنٹے ہی ہوئے تھے لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنا منہ کھولتی التمش جا چکے تھے۔

دو دن بے حد مصروف گذر گئے۔ اگر مسیح کی خاموش لیکن ٹھوس مدد شامل حال نہ ہوتی تو یہ دن کاکل کے لئے بہت کٹھن ہوتے لیکن وہ مسیح کی طرف سے فکر مند بھی تھی۔ اب مسیح وہ پہلا مسیح نہیں لگ رہا تھا۔ وہ اس سے کتراتا تھا۔ اس کے ساتھ رہتے ہوئے بھی وہ کہیں دور رہتا۔ لیکن باغات اور اس کے کام وہ اسی مستعدی سے کر رہا تھا جو اس کا معمول تھا۔

کاکل اس کی طرف سے فکر مند اس لئے تھی کہ وہاں بس وہی ایک تو تھا جسے وہ اپنا رفیق وہم نوا کہہ سکتی تھی جس سے بات کرنے میں اسے احتیاط برتنے کی ضرورت نہ تھی۔

”بی بی۔ ڈورا ایک بات بولتا۔“ ڈورانے اس وقت آکر کہا جب وہ التمش اور دوسرے ممبروں کے ساتھ سری رنگا پنٹم جانے کی تیاری کر رہی تھی مسیح نے بچوں کا ہوم ورک کرانے کی ذمہ داری لے لی تھی۔

”ہوں۔ کہو ڈورا“ کاکل نے اپنے اوور نائٹ بیگ میں ضروری سامان ڈالتے ہوئے کہا۔ اسے ابھی فرسٹ ایڈ کا سامان بھی ساتھ رکھنا تھا۔ محض ایک احتیاطی تدبیر تھی۔ ورنہ سری رنگا پنٹم کوئی جنگ کا میدان نہیں تھا۔ اور نہ ہی وہ فلورنس نائٹ انگیل تھی۔

”بی بی، مسیح کو اب تم اتچ بچا سکتا“ ڈورانے کہا اور کاکل کے ہاتھ سامان پیک کرتے ہوئے رک گئے۔ ”کیا کہہ رہی ہو ڈورا؟ کیا ہوا ہے مسیح کو اس نے حیران ہو کر فکر مندی سے پوچھا۔

ڈورا کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی عقابیت دکھ کے سایوں میں ڈھل گئی تھی۔

”وہ تم کو بھوت چاہتا بی بی۔ بھوت جیاد چاہتا“ ڈورانے گویا بے بسی سے کہا۔

”ڈورا میں بھی تو اسے بہت چاہتی ہوں“ اس نے دلاسا دینے کے انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”سچی؟“۔ ڈورا کی آنکھوں میں جان سی آگئی۔ ”تو پھر اس سے شادی بنالو نا؟“

”ڈورا! کاکل نے ششدر ہو کر کہا ”کہیں مسیح سے یہ بات نہ کہہنا وہ بہت خفا ہو گا۔ وہ پریسٹ بننے جا رہا ہے ڈورا۔“

”ڈورا اسے پادری نہیں بننے دیگا وہ پادری کیسا بن سکتا ہے؟“ ڈورا نے پاؤں پٹک کر کہا۔ ”وہ کیسا بن سکتا پادری؟“ ”وہ نہیں بن سکتا“ اس کی آنکھوں کی عقابیت لوٹ آئی تھی۔

ڈورا اب تم جاؤ پلےز۔ مجھے بہت کام ہے ”کاکل نے بے بسی سے کہا ”اور ہاں زینو اور شہزاد کا خیال رکھنا۔“ اسے چنداں یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ڈورا جب بھی متندرست رہتی حتیٰ الامکان کاکل کی مدد کرنے کی کوشش کرتی۔ لیکن اب عمر کے ساتھ وہ زیادہ سٹھیا رہی تھی۔ کاکل نے جھٹلا کر سوچا ڈورا نے کاکل سے کہا کہ مسیح کاکل سے پیار کرتا تھا تو اس میں نئی بات کیا تھی۔ مسیح سبھی سے پیار کرتا تھا۔ وہ پادری بننے جا رہا تھا۔ خدا کے بندوں سے پیار کرنا اس کا شیوہ تھا۔ اور یہ بیوقوف بڑھیا کاکل سے کہہ رہی تھی کہ وہ مسیح سے شادی کر لے کیونکہ وہ اس سے پیار کرتا تھا۔ کاکل نے جلدی جلدی دوائیں اکٹھی کرتے ہوئے لٹھ کر سوچا، اچھے بھلے مسیح کو یہ ایک دن پاگل کر کے چھوڑے گی۔ وہ بیگ اٹھا کر نیچے بھاگی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ دیر سے ہونچے اور آفتاب کے چہرے پر سواہیہ نشان دیکھے۔

اسے کیا خبر تھی کہ ڈورا جو کچھ کہہ رہی تھی سب سچ تھا۔ مسیح اپنے دل

کی بات کا کل سے نہیں کہہ پاتا تھا۔۔۔ وہ کسی اور سے بھی تو نہیں کہتا تھا۔ اس نے خود اپنی پوزیشن ایسی بنائی تھی کہ کا کل خود کو اس کے ساتھ بالکل محفوظ محسوس کرتی تھی۔ خدا کی دی ہوئی ساری خوبیوں کے باوجود سب کچھ تہہ کر اس نے خدمت خلق کا بیڑہ اٹھایا تھا۔

میور بنگلور ہائی وے سے کوئی دس میل ادھر سری رنگا پٹنم کا وہ تاریخی شہر ہے جس نے ہندوستان کے ایک عظیم سوراٹھیپو کو جنم دیا تھا۔ حب الوطنی سے سرشار ٹیپو سلطان نے انگریزوں کی عیاری کو محسوس کیا اور ان سے ٹکر لی۔ اگر کچھ بے حمیت ہم وطن فرمانرواؤں نے اس سے دغا نہیں کی ہوتی تو ہندوستان کی تاریخ انگریزوں کی غلامی سے داغدار نہ ہوتی جس نے ہمارے قومی کردار کو بھی انحطاط پذیر کر دیا۔ اس کمزوری کے نشان آزادی کے چار دہائیوں کے بعد بھی باقی ہیں۔

لیکن تاریخ کے تشدد کا بدلہ کسی آنے والی نسل سے نہیں لیا جاسکتا۔ اگر یہ بات سچ نہ ہوتی تو آر کیا لو جسٹوں کی اس ٹیم میں کیرن وارڈ موجود نہ ہوتی جس کے آبا و اجداد نے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے سربراہ تھے اور ٹیپو کے عظیم کردار کو مسخ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ حتیٰ کہ خود ایک انگریز مورخ جیمس مل نے اقرار کیا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں کو اصلی واقعات چھپانے میں یدِ طولیٰ حاصل ہے۔

ٹیپو جیسے دور بین اور دور رس فرمانروا کو بقول انگریز مورخ، ظالم اور متعصب کہہ کر رد نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لئے آج دنیا کے تین ہزار میوزیموں میں ٹیپو سے متعلق آثار موجود ہیں۔ جن میں پرتگال، اسپین، فرانس، نیدرلینڈ، انگلستان، آئرلینڈ اور ترکی شامل ہیں۔

وہ ٹیپو ہی تھا جس نے زراعت کو قوم کی شہ رگ قرار دیا تھا۔ اس نے ریشم کی صنعت کو فروغ دیا تھا۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ راکٹ کی

لہجہ ہے جو اس نے انگریزوں کے خلاف جنگ میں استعمال کئے۔۔۔ غالباً
انہی راکٹوں کی ٹکنالوجی کو پیش نظر رکھ کر۔۔۔ ۷۲ صدی بعد جرمی نے
راکت بنائے اور آج کے میزائل ICBM میں بھی انہی کا پرتو ہے۔

بس یہی باتیں معرض بحث تھیں جب فورڈ پک اپ الٹمش اور ان
کے ساتھیوں کو لئے آگے بڑھتی رہی۔ کیرن پہلے ہی ڈرائیو کرتے الٹمش کے
پہلو میں جا بیٹھی تھی۔ کاکل نے سب سے پچھلی سیٹ پر چاوزو کے برابر بیٹھنا
پسند کیا۔ اس کی دوسری جانب وردو نے اپنا اوٹھ جمالیا جبکہ درمیانی سیٹ پر
نیل اپنے کیرے سمیت بیٹھ گیا۔

”مجھے انڈیا سے عشق ہو گیا ہے“ کیرن نے الٹمش کے کندھے پر سر رکھا
کر کہا۔۔۔ کاکل نے دیکھا وہ الٹمش سے قربت کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے
نہیں دیتی تھی۔۔۔ وہ باہر دیکھنے لگی۔۔۔ ہر طرف ہری بھری زمین پتہ نہیں
کیوں اسے بالکل غراں رسیدہ اور بنجر نظر آنے لگی۔

”اس سے چوکنے رہو الٹمش“۔۔۔ وردو نے کہا ”دو سو سال پہلے اس
کے آباؤ اجداد نے بھی یہی کہا تھا“۔۔۔

”اور تم، نیولین کے وارث“۔۔۔ کیرن نے قہقہہ لگایا ”اپنے
دوست ٹیپو کا SOS ملنے پر بھی اس کی مدد کو نہیں پہنچے۔

”نہیں کیرن ایسے نہ کہو“۔۔۔ چاوزو نے بناوٹی سنجیدگی سے کہا
”اس وقت پانڈیچری کا فرانسیسی گورنر ڈوپلے زیادہ مقدس کام میں مصروف
تھا“۔۔۔

عجائب نہیں بلکہ ایک عظیم تاریخی دور کی یادگار ہیں۔

سہ منزلہ محل کے بے شمار کمروں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے ایک حصہ کو ہوٹل میں تبدیل کر دیا گیا تاکہ سیاحوں کو سہولت رہے۔ طے پایا کہ وہیں کھانا کھا کر آگے بڑھا جائے۔ وہاں مغلی، کانٹی نینٹل ہر طرح کے کھانے موجود تھے لیکن سب نے خالص جنوبی کے لذیذ کھانے کھائے۔

التمش سب کو کرشنا راج ساگر دکھانا چاہتے تھے جسے ہندوستانی انجنیئر و سولیشنر ایا کے فن کا معجزہ کہا جاتا ہے۔

برنداؤن گارڈن کے وسیع احاطے میں زور دروں سے ابلتے ہوئے فواروں، خوبصورت روشوں اور نگہداشت کئے پیدوں کے درمیان کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔ ہیرو، ہیروئن، پھدکتے، اچھلتے، پیدوں کے اطراف دوڑ لگاتے، کوئی گیت گارہے تھے۔ اور ایک خاردار جھاڑی کے چٹھے ویلن نتھنوں سے آگ اگلتا انہیں تاک رہا تھا۔ ہیرو بار بار ہیروئن کے بالوں میں گلاب کی کلی ٹھونسنے کی کوشش کرتا اور وہ بگٹ بھاگ نکلتی۔

”یہ رک کر اس کی بات سن کیوں نہیں لیتی؟“۔۔۔۔۔ کیرن نے اکتا کر کہا۔

”اس کے پاس ہو گا ہی نہیں کچھ کہنے کو سوائے I love you کے“۔۔۔۔۔ اتنی سی بات کہنے کو لوگ یہاں عمر گزار دیتے ہیں۔“

”تم بھی تو ہندوستانی ہو“۔۔۔۔۔ کیرن نے چوٹ چلی۔

”ہاں، کہوٹکا کسی دن“۔۔۔۔۔ کاکل کی طرف اپنی اٹھتی ہوئی

نظر کو پھیر کر انہوں نے کہا ”اور بھی کام ہیں دنیا میں محبت کے سوا“۔۔۔ اور کیرن کسی خوش آئند خیال سے مسکرائی تھی۔

نیل کرو کر تصویریں لینے میں مشغول تھا۔۔۔ کاکل، وردو اور چیاوزو کے ساتھ نکل گئی۔

”اس بار ایسا لگتا ہے التمش کیرن سے بچ نہیں سکے گا“۔۔۔ وردو نے کہا اور کاکل کی نظریں بلبلتے ہوئے فوارے پر جم گئیں۔

Hanadarna تم نہیں جانتیں“۔۔۔ چیاوزو بولا ”ان کا معاشرہ بہت پرانا ہے۔۔۔ کیرن کا یہاں ہمارے ساتھ چلا آنا ہی اس کا ثبوت ہے ورنہ کیرن اور آر کیا لوجی۔۔۔!“۔۔۔

کاکل کو بھی کیرن یا التمش سے کیا واسطہ تھا۔۔۔۔۔ وہ سینکڑوں محاشقے کرتے پھریں۔۔۔ اف! مگر یہ آنکھ میں تنکاسا کیا چلا گیا تھا!

”تو کیا کیرن آر کیا لوجسٹ نہیں ہے؟“ ناچلہتے ہوئے بھی اس نے

پوچھا

”کیرن بیا لوجسٹ ہے۔۔۔ اپنے فادر ایلیکس وارڈ کے ساتھ وہ ایک بار ایکسپڈیشن میں شامل ہوئی تھی۔ تبھی سے التمش کا جادو اس پر چلا ہوا ہے۔

اور التمش۔۔۔۔۔؟، وہ پوچھنا چاہ رہی تھی لیکن پوچھنا بیکار تھا۔ اس نے خود صاف التمش کی آواز سنی تھی کہ کسی دن وہ دل کی بات زبان پر لے آئیں گے۔۔۔ وہ کچھ دیر کے لئے وہیں فوارے کی دہلیز پر ٹک گئی۔۔۔ تکان صرف چلنے والوں کو نہیں ہوتی۔۔۔ ذہنی سفر بھی مڈحال کر دیتا ہے۔

دور، کاکل نے دیکھا کیرن بھی سنگ مرمر کے ایک چبوترے پر بیٹھ گئی تھی۔

”اچھا ہوا میں نے پیناڈرنا کو بتا دیا۔۔۔ چیاوزو، وردو کے ساتھ آگے بڑھ گیا تھا۔

”تم بہت سنگدل ہو اسٹون ایج آرکیالوجسٹ (Stone Age Archaeologist) وردو نے اسے کہنی مار کر کہا۔

”مجھے اس کی آنکھوں میں پلتا وہ خواب توڑنا ضروری تھا۔۔۔ اس سے پہلے کہ وہ التمش جیسے پتھر سے اپنا سر توڑے، میں نے اسے خبردار کر دیا کیا تم نے دیکھا نہیں کہ وہ بھی التمش سے پیار کرنے لگی ہے؟“۔۔۔

”ٹھیک کیا تم نے۔۔۔ وہ بہت معصوم ہے۔ اچھا ہی ہے جو اس کا بھرم ٹوٹ جائے۔۔۔ وردو نے بالاخر چیاوزو سے اتفاق کیا۔

”اب ہمیں چلنا چاہیے“۔۔۔ التمش نے کیرن کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔۔۔ کیرن نہ صرف التمش کا سہارا لیکر اٹھی بلکہ ان کے سینے سے بھی جا لگی جیسے سنبھلنے کی کوشش کر رہی ہو۔۔۔ کاکل کے تخیل میں کھنڈر کے وہ لمحات جگے جو اس نے التمش کی بانہوں میں گزارے تھے۔ گرتے ہوؤں کو سنبھال کر اور بھی زیادہ گہرائی میں پھینک دینا کیا ان کی عادت تھی! اس نے رندھے ہوئے گلے سے سوچا۔ ان لمحات نے التمش اور ان کی شخصیت کو ایک معمہ بنا دیا تھا۔ اور یہ معمہ پیچیدہ تر ہوتا جا رہا تھا۔ التمش نے کیرن کی دونوں بانہیں پکڑ کر اسے خود سے کچھ دور روک دیا تھا۔ شاید ان کی مشرقیت کھلے

عام عشق کے اظہار کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ بظاہر کیرن کو بھی ان کا یہ عمل بد اخلاقی نہیں لگا کیونکہ وہ اپنا ہاتھ التمش کی بانہ میں پھنسانے چلنے لگی تھی۔ یا پھر ان کا ربط اتنا مستحکم تھا کہ رسمی اخلاقی حدوں سے گزر کر بے تکلفی تک پہنچ گیا تھا جہاں ایسی چھوٹی موٹی باتوں کو درگزر کر دیا جاتا ہے۔

سلطان حیدر علی ۱۷۸۱ء میں انتقال کر گئے۔ ان کے بعد ان کا بیٹا ٹیپو تخت نشین ہوا۔ ٹیپو سلطان نے تہیہ کر لیا تھا کہ انگریزوں کی غلامی کا طوق اپنی مادر وطن کے گلے سے اتار پھینکے گا۔ ٹیپو سلطان نے افغانستان کے زماں خاں ابدالی اور فرانس کے شہنشاہ نپولین بونا پارٹ کو اپنی کاوش میں ساتھ دینے کے لئے پیغام بھیجا لیکن دونوں ہی ٹیپو کی مدد کو نہیں پہنچ پائے۔ زماں خاں ابدالی کو غداروں کی عیاری نے آدھے رستے سے ہی واپس لوٹا دیا جبکہ نپولین خود انگریزوں سے برسر پیکار تھا۔ لارڈ کارنوالس نے ۱۷۹۲ء میں سری رنگا پٹنم کا محاصرہ کیا۔ حیدر آباد کے نظام اور مرہٹوں نے ہم وطنوں کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیا۔ اس طرح میسور کی تیسری جنگ لڑی گئی۔ یکہ و تہا ٹیپو کمزور پڑ گئے۔ اور کارنوالس نے انہیں شکست دیدی۔

اس شکست کو ٹیپو بھلا نہ سکے کیونکہ اس شکست میں ذلت بھی شامل تھی۔۔۔۔۔ انگریزوں نے نہ صرف ان سے تین کروڑ روپے وصول کئے بلکہ ٹیپو کو اپنے دو بیٹے بھی انگریزوں کو بطوریر غمال دینے پڑے۔

سری رنگا پٹنم کو دریائے کادییری گویا اپنی باہنوں میں لئے ہوئے ہے دریا ایک مقام پر دو شاخوں میں بٹ جاتا ہے جو آگے چل کر دوبارہ مل جاتی ہیں۔۔۔۔۔ دریا کی دو باہنوں کا میل، یہی وہ سنگم ہے جس کے قریب ہی Sallyport Gate پر میسور کی چوتھی المناک جنگ لڑی گئی اور ۴۔ مئی ۱۷۹۹ء کو ٹیپو نے یہیں جامِ شہادت پیا اور تاریخ وفات نکلی۔

ٹیپو بوجہ دین محمد شہید شد

انتش نے اس نظم کا اردو ترجمہ اپنے ساتھیوں کو سنایا جو انہوں نے
میور میں دسہرے کے موقع پر منعقدہ ایک مشاعرے میں سنی تھی۔

گہر کی طرح سے پاکیزہ ہے سرنگا پٹم
جہاں بلند کیا تو نے حریت کا علم
یہ سرزمین ہے وہ جس کی پاک گردن میں
بڑی حیا سے حمائل ہے رود کاویری
یہ سچ ہے حور شمائل ہے رود کاویری

کہ جنگ گاہ میں جاتے ہیں جب بھی اے سلطان
جیلے تجھ سے ، جوانمرد اور جری تجھ سے
ہتھیلیوں پر سروں کے دیئے جلانے ہوئے
تو جنگ گاہ خود ان پر نثار ہوتی ہے

جو کوئی سن سکے ، سن سکتا ہے پکار اس کی
ہو بہا ہے جو سنگم پر سر فروشوں کا
یہ وہ ہو ہے جسے گنج شایگان کہیے

سحر کو جب تری شمشیر بے نیام ہوئی
حریف کے لئے بس زندگی کی شام ہوئی

دریاد دولت محل کی اندرونی اور بیرونی دیوار میں ستونوں پر کسی زمانے میں چاندی کا پتر چڑھا ہو گا جن پر طلائی نقوش ہونگے۔ البتہ اب بھی اس کی دیواروں پر چند نہایت ہی معنی خیز تصاویر موجود ہیں جو فن مصوری کا لاجواب نمونہ ہیں۔ ان میں بعض آر تھرولزی (ڈیوک آف ونگٹن) کی بنائی ہوئی ہیں ان میں ہندوستان کے اس وقت کے امراء وزراء اور ان کے طرز معاشرت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ان میں نانا فرنویس پیشوائے پونا۔ محمد علی والا جاہ۔ نظام الملک، بالیا بنو، نواب کڑپہ وغیرہ کی تصویریں ہیں۔

ایک پینٹنگ دیکھ کر کاکل ہی نہیں بلکہ کیرن بھی ملول ہو گئی۔ اس تصویر میں سلطان کے دونوں شہزادوں پرنس عبدالخالق اور پرنس محمدا الدین کو انگریزوں کے حوالے کیا جاتا دکھایا گیا ہے۔ ان دونوں شہزادوں کو میر غلام علی لنگڑہ کی معیت میں انگریز کیمپ میں بھجوا دیا گیا تھا۔

اس موقع پر التمش اور انکے تینوں ساتھیوں میں بحث سی چھڑ گئی نیل کا دعویٰ تھا کہ اس نے میدر براؤن کی بنائی ایک تصویر دیکھی تھی جس میں خود میپو نے ساتھ لجا کر شہزادوں کو انگریزوں کے حوالے کیا تھا۔ اور کاکل سوچ رہی تھی کہ تکنیکی باریکیوں میں لچھ کر کوئی یہ غور نہیں کر رہا تھا کہ اس وقت ایک غیور باپ کے دل کی کیا حالت ہوگی جو اپنے جگر گوشوں کو خود غنیم کو سوپنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ ان معصوم ناز و نعم میں پلے شہزادوں کی آنکھوں میں کیسی حیرانی اور کیسی خوف نہیں ہو گا کیا انہیں اس وقت اتنی سمجھ ہوگی کہ کیوں انہیں انسان نہیں بلکہ کسی جنس کی طرح بارٹر کیا جا رہا تھا

یہ سب سوالات تاریخ کی سفاکی کے آگے بے محل ہو جاتے ہیں جانے کتنی تہذیبیں آئیں۔۔۔ طاقتور حکمران اٹھے محلات بنے جو سب کھنڈروں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ آج کی نسلیں ان کا سراغ لگانے میں سرگردان ہیں۔ ہو سکتا ہے سینکڑوں سال بعد آنے والی نسلیں ان کا سراغ لگانے میں اپنے سر دھنیں جو آج مصروف کار ہیں۔ کون جانے تب کونسا کھنڈر کسکی کہانی کہے!

”چھنا ڈرنا میں کچھ تمھاری مدد کروں؟“ چیاوزو نے کاکل کے ہاتھوں سے بھاری گلدان لیتے ہوئے کہا۔ اسے اس پر اسرار لڑکی سے انس ہو گیا تھا۔ اسکی باریک بین نظروں نے کاکل کے دلی جذبات کو تاڑ لیا تھا۔ ساتھ ہی وہ اسکی متانت اور سنجیدگی کا مداح بھی تھا۔ جہاں تک عیاری کا سوال تھا، کیرن اور کاکل کو کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ چیاوزو سمجھ نہیں پارہا تھا کہ التمش نے کیرن میں ایسی کیا خوبی دیکھی جو کاکل پر اسے ترجیح دے رہے تھے۔ لیکن وہ کون ہوتا تھا کسی پر عدالت بیٹھانے والا! آج کی دوسروں کے مسائل سے لائق دنیا میں یہی کیا کم تھا کہ لسنے کاکل کو مستنبہ کر دیا تھا۔

لسنے کاکل کو بتایا کہ عرصہ پہلے لسنے اپنا وطن چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ امریکن شہری تھا۔ پھر بھی وطن کی یاد اسکے دل سے نہیں نکل پائی تھی۔ اسکا خیال تھا کہ یکشاگان کے جو مکھوٹے اس نے سری رنگا پٹنم میں دیکھے تھے انہوں نے + سے گھر کی یاد دلادی تھی۔ چین کے Lion Dancers بھی اسی طرح کے مکھوٹے پہنتے تھے اور رقص کے وقت انکے حرکات و سکنات میں بھی کافی مشابہت تھی۔

چیاوزو، کاکل کے ہاتھ سے ڈسٹر لیکر شوکیں میں رکھی چیزوں کو چمکا کر رکھتا جا رہا تھا۔ اسمیں کچھ ایسے سووینٹر تھے جنہیں التمش دنیا کے مختلف مقامات سے لے آئے تھے۔ ان میں شامل ایک بڑی نایاب چیز تھی جسے اسکی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی ایک موتی تھا جو سیپ میں اپنی تکمیل کو نہیں پہنچ پایا تھا۔

”دیکھو پینا ڈرنا۔“ چیاوزو نے کاکل کو متوجہ کیا۔ ”انسانی کردار بھی ایسا ہی ہوتا ہے، اپنی تکمیل کو نہیں پہنچ پاتا۔ یہ سچ ہے کہ مکمل صرف خدا کی ذات ہی ہے اور بس۔۔۔۔۔“

کاکل اسکے قریب پہنچ کر وہ موتی دیکھنے لگی۔ اس جہاندیدہ چینی کی ہر بات سے دعوتِ فکر دیتی تھی۔ کاش وہ کچھ دن اور وہاں ٹھہر پاتا لیکن ان سب کی واپسی کے دن قریب آرہے تھے۔ ایک طرح سے آج کا ڈنر و داعی ڈنر تھا۔ جس کا انتظام کاکل کے سر تھا۔

سیح کافی دنوں بعد واپس آیا تھا اور التمش اپنے ساتھیوں میں مصروف تھے۔ باغاں کے کئی مسائل رکے پڑے تھے۔ جنہیں پنڈانے میں سیح جٹ گیا تھا۔ سیح باغاں میں صرف مینیجر کا کام ہی نہیں دیکھتا تھا بلکہ وہاں کام کرنے والے ہر فرد اور اسکے خاندان کی بہبودی بھی اسکے پیش نظر رہتی تھی۔ یہ سلسلہ اختر بخت کے زمانے سے ہی چلا آ رہا تھا۔ عجیب عجیب مسائل اسکے سامنے آتے تھے جنہیں وہ حل کرنے کی کوشش کرتا۔ ان دنوں باغاں میں کام کرنے والے ایک کاہل شخص کی بے حسی نے اسے پریشان کیا ہوا تھا۔ چھ

بچوں اور ایک بیمار بیوی کے باوجود وہ کام سے کتراتا تھا۔ اور گھر میں فاقوں کی نوبت تھی۔ اسے کام سے عذر اس لئے تھا کہ اجرت بہت کم تھی۔ اور جب مسیح نے کسی بہانے اجرت زیادہ دینے کا وعدہ کیا تو کہنے لگا "اگر اجرت زیادہ دو گے کام بھی کمر توڑ لو گے"۔ اور مسیح کے اصول بغیر محنت کے پیسے دینے کے خلاف تھے۔ وہی شخص بار بار محنتی کارندوں کو بہکانے کی کوشش کرتا۔ اس نے پھر فتنہ مچایا ہوا تھا۔

رات کے ڈنر پر مسیح بھی موجود تھا۔ باغاں کی کھلی اور صحت مند ہوانے اسکا کھویا ہوا رنگ روپ واپس لوٹا دیا تھا۔ گہرے نیلے سوٹ میں اسکی آنکھوں کی نیلاہٹ اور بھی زیادہ بڑھ گئی تھی۔ کوئی وہاں مسیح کی موجودگی کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

"ہلو پڑوسی"۔ کاکل نے چپکے سے کہا "اتنے دن بعد نظر آئے ہو خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے؟"

"تمہاری کھنڈروں میں بھٹکتی روح کے لئے دعا کر رہا تھا"۔ مسیح کی خوش دلی واپس آگئی تھی۔

وقت مقررہ پر سبھی مہمان جمع ہو گئے۔ روشنی کی جگمگاہٹ نے ہال کی خوبصورتی کو چار چاند لگادئے تھے۔ آج نیل، چیا و زو اور وردو نے بھی موقع کا لحاظ کر کے اپنے لباس پر توجہ دی تھی۔ نیل کے گھنے گھنگھرا لے ہال جو ہمیشہ اسکے کانوں اور گردن کو ڈھکے رہتے تھے۔ آج سلیقے سے جے تھے۔ وردو نے اپنے کوٹ کے کالر میں خوش رنگ پیسزی سجایا ہوا تھا۔

التمش کو کاکل نے برآمدے کی نیم تاریکی میں پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ گہرے سرمئی سوٹ میں انکی مردانہ وجاہت خود اپنے آپ کو آئینہ دکھا رہی تھی۔ آج کاکل نے طے کر لیا تھا کہ ہال میں نظریں اٹھا کر بھی انکی طرف نہیں دیکھے گی۔ اسکی وجہ کیرن بھی تھی جو اپنے ہوش ربا حسن کے ساتھ انکا سایہ بنی ہوئی تھی۔ بسنے آج تیار ہونے میں بڑے اہتمام سے کام لیا تھا۔ سیاہ تافتے اور شیفان کے گاؤن میں بسنے اپنے شانے بالکل کھلے چھوڑ دئے تھے۔ کانوں میں یا قوت سے گوشتوارے اور گردن سے کچھ نیچے پہنچتا تہنیا قوت ہی کا ایک لاکٹ۔

کاکل نے جان بوجھ کر آج شوخ رنگ پہننے سے احتراز کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی کی توجہ کامرکز بنے۔ بسنے ہلکی آسمانی شیفان کی ساری پراکتھا کی جس پر کہیں کہیں مقیش کے ستارے چمک جاتے۔ اس پر بہت ہی خوش وضع چاندی کے بندے اور چاندی ہی کی زنجیر میں پڑا میچنگ لاکٹ۔ یہ سیٹ بسنے اوٹی ہی کی ایک دکان سے خریدا تھا جو اسے یحسد پسند آیا تھا اور دام بھی مناسب تھے۔ پھر بھی مجموعی طور پر اس سادگی کے باوجود اسکی شخصیت اتنی ابھرائی تھی کہ سبھی کی تعریفی نظریں اس پر اٹھ رہی تھیں۔ وہ اتنی توجہ کی عادی نہیں تھی۔ اسکی جبیں عرق آلود ہونے لگی۔

آج ڈور آنے بھی اپنا خاص لباس پہنا تھا۔ وہی سات گز کی سفید چادر جس کے آنچل پر ٹوڈاؤں کی مخصوص سیاہ اور سرخ ریشمی دھاگوں کی کڑھائی۔ ابھی کھانا چنے جانے میں وقت تھا۔ تب تک مشروبات، خشک

میوے اور ریشمی کباہوں کا دور چلتا رہا۔ سبھی جانتے تھے کہ مغرب میں عرصہ دراز تک رہنے کے باوجود التمش کو شراب سے رغبت نہیں تھی جبکہ وردو کے فرانس میں مارمنڈی کے قریب پشتوں سے چلے آرہے انگور کے باغ تھے جہاں شراب کشید کی جاتی جسکا دنیا کی بہترین شیمپین میں شمار ہوتا تھا۔ اسکا تاریخی سلسلہ پانچ سو سال سے بھی پرانا تھا۔ لیکن التمش کے جذبات کے احترام میں اسنے بھی کوٹھی میں کھلے عام شراب نہیں پی تھی۔ شراب کا جو اسٹاک وہ ساتھ لایا تھا وہ اسکے کمرے سے باہر کبھی نہیں آیا حالانکہ التمش کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ مئے نوشی میں اسکے دوسرے ساتھی اسکے کمرے میں ہی اسکا ساتھ دیتے۔ کبھی کبھی التمش بھی انکے ساتھ خوش گپیوں میں شامل ہو جاتے۔

دوسرے مہمانوں میں فادر پیٹنے ڈکٹ اور چیف کنزر ویٹر آف فاریسٹ مادھوراو مدھول بھی شامل تھے۔ فادر پیٹنے ڈکٹ نہ صرف عیسائیوں کے پیشوا تھے بلکہ انکی بڑی ہمہ جہتی شخصیت تھی۔ فلکیات و سماوات کے بارے میں انکا علم اور تجربہ قابل تحسین تھا۔ اور مجسمہ سازی کے میدان میں انکی تنقید اور تجربہ تو بڑی اہمیت کا حامل تھا۔

اسکے علاوہ ہر سال اوٹی کے "روز شو" میں انہی کے گلاب سر بلند رہتے تھے۔ وہ اسکول میں التمش کے پرنسپل رہ چکے تھے۔ اور اب سبکدوش ہونے کے بعد انہوں نے خود کو کلیسا کے لئے منحس کر دیا تھا۔ وہ مسیح کے بڑے قدردان تھے۔ کنفیشن باکس، میں دو تین بار مسیح کا "اقبال جرم" سننے کے

بعد جب انہوں نے کاکل کو دیکھا تو انکی سمجھ میں آگیا کہ مسیح جیسا متین و حلیم نوجوان کیوں اپنے ہوش گنوا بیٹھا۔ انہیں مسیح سے ہمدردی تھی۔ انہوں نے اسے بتایا بھی تھا کہ پادری بننا اسکے لئے لازم نہیں تھا وہ چاہتا تو اپنا ارادہ بدل سکتا تھا کیونکہ اسکے آخری مراحل ابھی باقی تھے۔ خود کاکل کے جذبات مسیح کے بارے میں کیا تھے وہ نہیں جانتے تھے۔ اس لڑکے نے خود کو بکھیرے میں پھنسا دیا ہے۔ وہ داؤنچی کی شہرہ آفاق پینٹنگ Last Supper کے روبرو کھڑے یہی سوچ رہے تھے کہ التمش انکے آگے بھونے ہوئے لیستوں کی پلیٹ لئے پہنچے۔ داؤنچی کی اس مشہور پینٹنگ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ انکی حواری بھی شریک طعام تھے۔ رومن فوجیوں کے ساتھ پہلے سے طے شدہ سازش کئے ہوئے غدار جو ڈازنے اٹھکر انکی جبین مقدس پر بوسہ نیت کیا اور اس طرح گویا مسیح کی شناخت کر دی۔ رومنوں نے فوراً مسیح کو گرفتار کر لیا اور صلیب پر چڑھا دیا۔

وہ خون ابن مریم جگمگا اٹھا صلیبوں پر
وہ زہر آلودہ بوسے دوستی کے رنگ لے آئے
التمش نے فادر کو شعر سنایا۔ فادر نہ صرف اردو بلکہ فارسی بھی اچھی طرح جانتے تھے۔

”حق کار استہ اکثر موت کی طرف جاتا ہے“ فادر التمش کی طرف متوجہ ہوئے ”سینٹ لارنس کو بھی آہنی چادروں پر بھون دیا گیا تھا۔“
”لیکن زندگی میں بعض موقع ایسے آتے ہیں فادر کہ حق و باطل کی تمیز

مٹ جاتی ہے۔ فیصلے مشکل ہو جاتے ہیں۔“ مسیح بولا۔

”فیصلے تو پھر بھی کرنے ہی پڑتے ہیں مسیح۔“ التمش نے کہا ”ورنہ سایوں کے پچھے دوڑ کر انسان کہیں نہیں پہنچتا۔“ کیا التمش اسے خبردار کر رہے تھے؟

”تمہارا خیال صحیح ہے تماش۔“ مسیح نے کہا ”لیکن زندگی میں ٹریجیڈی سے بھی تو مفر نہیں۔“

”میسجر ہمایوں کی بات کر رہے ہیں آپ؟“ چیف کنزرویٹرف فار سٹس مادھور اوگلاس تھامس وہاں چلے آئے۔ ”آدم خورشیر کے ہاتھوں انکی موت سچ سچ ایک بڑی ٹریجیڈی تھی۔“

آپ تو کہہ رہے تھے کہ وہی سچویشن پھر پیدا ہو گئی ہے؟“ فادر نے مادھور اوگلاس کے مطابق بات کا دھاراموڑا۔

”ٹھیک ہی تو ہے۔ مادھور اوگلاس نے یہ سب ان کجنت پوچروں کی وجہ سے ہے جو جانوروں کی کھالوں کے لئے انہیں مارتے ہیں۔ اکثر زخمی ہو کر بچ نکلنے والا شیر آدم خور بن جاتا ہے۔ یا پھر وہ بوڑھا ہو جائے اور اسکی چستی پھرتی میں کمی آجائے تو بھی وہ آدم خور بن جاتا ہے۔“

التمش اور مسیح غور سے مادھور اوگلاس کی بات سن رہے تھے۔ وہ جس سچویشن کی بات کر رہے تھے اسکا التمش کے خاندان سے بہت گہرا تعلق تھا۔ اسی ظالم المیہ نے انکی عزیز ترین بہن کو بیوہ، اسکے معصوم بچوں کو یتیم انکے والدین کو زندگی کا سب سے بڑا صدمہ اور انہیں خود اپنی طرز زندگی کا

دھاراموڑ نے پر مجبور کر دیا تھا۔

”ہم جلد ہی اخبار میں اسے مارنے والے کے لئے انعامی اشتہار نکالنے والے ہیں۔“ مادھورا بولے۔

”مسٹر مدھول اس کام کی اجازت اس بار آپ مجھے دیں“ التمش بولے سب خاموش ہو گئے اور مسیح نے چونک کر انہیں دیکھا۔ کیا التمش ایک اتفاقی حادثے کا بدلہ شیر کی ساری نسل سے لینا چاہتے تھے۔ یہ کس طرح کی تسکین تھی!۔ مسیح کو انکا عندیہ بالکل بچکانی لگا۔ وہ جانتا تھا کہ التمش کا نشانہ قابل تعریف کبھی نہیں رہا تھا۔

”پھر بھی“۔ مادھورا ”قاعدے کے مطابق اخبار میں اشتہار تو دینا ہی ہوگا“۔ انہیں بھی التمش کے آفریر حیرت ہوئی کیونکہ التمش جنگلی جانوروں کے تحفظ کی ایوسی ایشن کے ممبر تھے۔ خیر اسکا اطلاق آدم خور شیر پر نہیں ہوتا تھا۔ لیکن انکے فیصلے سے بپہ چلتا تھا کہ وہ اپنے خاندان کے لئے کو بھول نہیں پائے تھے۔

”ضرور اشتہار دیجئے گا“۔ التمش بولے ”لیکن اس سے پہلے مجھے ایک موقع ملنا چاہیے۔“ مادھورا مدھول التمش کا اٹل عندیہ دیکھ کر صرف شانے سکیر کر رہ گئے۔ اور مسیح نے سوچا کہ کہیں التمش نے آج پی تو نہیں رکھی ہے۔

ڈنر کے بعد چائے اور کافی کا دور چلا۔ دلچسپ باتوں کا سلسلہ ختم ہوا اور سارے مہمان رخصت ہوئے۔ نیل ور دو اور چیا و زونے خاصکر اپنے

کمرؤں میں جانے سے پہلے کا کل کا شکریہ ادا کیا۔

التمش اپنے مہمانوں کو خدا حافظ کہنے کے لئے کیرن کے ساتھ ہی باہر نکل گئے تھے۔ کا کل بھی نوکروں کو ضروری ہدایات دیکر اوپر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اس نے کپڑے تبدیل کئے، شب خوابی کا لباس پہنا لیکن تھکان کے باوجود نیند اسکی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس نے بتی بند کر کے پردے ہٹائے اور بالکونی میں نکل آئی۔ آسمان یوں بھی ابر آلود ہو رہا تھا اور ہوا بالکل بند تھی۔ پھر بھی ماحول میں ہلکی سی خنکی تھی جو اسے اچھی لگ رہی تھی۔

”میں ضرور چلتا تم سب کو خدا حافظ کہنے کے لئے۔“ التمش کہہ رہے تھے ”لیکن کل ہی میرے لیگل ایڈوائزر آنے والے ہیں۔“

”ایسا لگتا ہے میرے آنے سے تمہیں خوشی نہیں ہوئی“۔ کیرن بولی۔
”تمہارا آنا برا بھی تو نہیں لگا۔“

”التمش تم کس مٹی کے بنے ہو؟“ کیرن نے زچ ہو کر کہا۔

”ہندوستانی مٹی کا بنا ہوں کیرن“۔ انکا ملنے والا انداز کا کل خوب جان گئی تھی۔ ”اور یہی تو تمہیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔“

”ہندوستانی مرد کیا عورتوں میں دلچسپی نہیں لیتے؟“۔ سوال صاف اور

سیدھا تھا۔

”ہندوستانی مرد، عورت پن میں دلچسپی لیتے ہیں۔“ التمش نے قہقہہ

لگا کر کہا۔ گویا اب بھی انہیں گفتگو کی سنجیدگی منظور نہیں تھی۔

”تو کیا میں تمہیں عورت نہیں لگتی۔“

”تم عورت ہو کیرن۔ بہت زیادہ عورت ہو۔ لیکن میں عورت پن کی بات کر رہا تھا۔“ اس بار انہوں نے بات کو سنجیدگی سے دور رکھنے کی کوشش نہیں کی۔

”التمش اب وہ التمش نہیں ہو جوتھے۔“ کیرن نے شکایت کی۔

”میں وہی ہوں کیرن، تم بدل گئی ہو۔ تب تم شادی کو وبال سمجھتی تھیں جب بل تم سے شادی کرنا چاہتا تھا۔“
 ”بل، بل تھا تم نہیں تھے۔“

”پھر بھی تم نے بل کے ساتھ رہنا شروع کر دیا تھا۔“

میں نے تمہیں جلانے کے لئے کیا تھا۔ تب بھی اگر تم کہتے تو میں اسے چھوڑ کر واپس آ جاتی۔“

التمش نے برجستہ قہقہہ لگایا۔ مجھے جلانے کے لئے؟ میں نے تو تم سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میرا شادی کا کوئی ارادہ نہیں۔“

تم نے ڈیڈی کے مرتے وقت ان سے کہا تھا کہ تم میرا ساتھ دو گے۔“

”اسی لئے بچے دوست کی طرح رائے دے رہا ہوں کہ بل سے شادی کر لو۔“ التمش نے سمجھایا۔ ”وہ تمہیں بہت چاہتا ہے۔“

”اور۔۔۔ اور تم اپنی اس ہاوس کیپر کے ساتھ گل چھرے اڑاتے رہو گے۔“ کیرن نے پھر کہا۔ کاکل سکتے ہیں آگئی۔

”کیرن! التمش نے سختی سے ٹوکا ”اسے بیچ میں مت لاؤ“ کاکل نے چاہا

اندر چلی جائے۔ در پچے بند کر لے لیکن زمین نے گویا اسکے قدم جکڑ لئے تھے۔
 ”میں جانتی ہوں تم اسے پیار کرنے لگے ہو۔“ کیرن نے مصر ہو کر
 کہا۔

”اور کچھ؟“ التمش نے ہنس کر کہا جیسے کیرن کوئی ناممکن بات کر رہی
 ہو۔

اور، میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ بھی تمہیں چاہتی ہے
 پتہ نہیں تم اپنی انا میں اور کتنے دل ٹھکراو گے التمش۔“ کیرن نے
 ٹوٹتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مجھے ایک سگریٹ دو۔“
 کاکل نے سگریٹ جلانے کی آواز سنی۔
 ”گڈ بائی التمش۔“ کیرن نے اجازت لی۔
 ”چلو میں تمہیں تمہارے کمرے تک چھوڑ آؤں۔“
 ”نہیں ضرورت نہیں۔“ کیرن بولی ”ہاں کبھی تمہارا یہ مغرور سر کسی
 کی محبت کے آگے جھک جائے تو مجھے ضرور اطلاع دینا۔“
 التمش نے کیرن کو منانے کی کوشش نہیں کی۔ کاکل جہاں تھی
 وہیں دم سادھے کھڑی رہی حتیٰ کہ قدموں کی چاپ دور ہوتے ہوئے معدوم
 ہو گئی۔

لیکن جو قدم کاکل کے دل کے رستے پر بڑھ آئے تھے انکا کیا ہوگا۔ وہ
 نہیں جانتی تھی۔

مسیح التمش کے مہمانوں کو بنگور ہوائی اڈے سے روانہ کر کے واپس آیا تھا۔ جہاں سے وہ نیشنل آرکائیوز سے استفادہ کر نیکے لئے دہلی گئے تھے۔ انکی روانگی کے بعد التمش نے ہمنٹ راو کو بلوایا۔ شہزاد اور زینو کے لئے جو ٹرسٹ قائم کرنا تھا اسمیں کچھ پیچیدگیاں تھیں جنہیں سلجھانا تھا۔ اختر بخت کی وصیت میں ڈور اور مسیح کے نام بھی تھے۔ خیراتی اداروں اور ہسپتال کے لئے رقمیں منھس کی گئی تھی۔ التمش نے آرکیالوجیکل ٹیم کے آنے کی وجہ سے اس اہم کام کو کچھ دنوں کے لئے ملتوی کر دیا تھا جسے اب پایہ تکمیل کو پہنچانا تھا۔

اس بیچ ایک بار مسیح انہیں ہمنٹ راو کے ساتھ مصروف دیکھکر لوٹ گیا۔

انکی بار جو مسیح آیا تو وہ کمرے میں بندوقیں صاف کر رہے تھے۔
 "مس وارڈ لندن واپس ہو گئیں"۔ مسیح نے خود بھی ایک بندوق سنہالی اور صاف کرتے ہوئے بولا۔ "باقی تینوں دلی"۔
 "Good Show" التمش بولے، وہ بندوقوں میں گم تھے۔

بندوقوں میں ایک دو اتنی قدیم تھیں کہ انکی Antique Value تھی۔ کچھ بہت قدیم پستول بھی تھے جنہیں اختر بخت نے محاذ پر حاصل کیا تھا۔ انہیں سجا کر دیوار پر لگا دیا گیا تھا۔ اسکے علاوہ کچھ مروج بندوقیں اور پستول تھے جو اختر بخت کو عزیز تھے۔ یہ کمرہ ایک فوجی ہی کا ہو سکتا تھا۔

”تاش میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“ مسیح نے ۱۲ بولے۔ کاسیفنی کچھ کھول کر اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

”تمہیں کچھ کہنے کی اجازت کی ضرورت تو نہیں۔“ التمش بولے۔ انکا تعلق ہی ایسا تھا جہاں ان تکلفات کی ضرورت نہیں تھی۔

”آپ شیر کے شکار کا ارادہ دل سے نکال دیں۔“ مسیح نے بغیر تمہید کے کہا۔

التمش کام روک کر کچھ دیر مسیح کو دیکھتے رہے۔ پھر بولے۔

”تم جانتے ہو مسیح میں اپنے ارادے بدلا نہیں کرتا!“

”اس علاقے کے لوگوں میں اگر کوئی جانتا ہے تو اس خاندان کے لوگ جانتے ہیں کہ آدم خور شیر کا شکار کس حد تک خطرناک ہوتا ہے۔“ مسیح نے شاہ نور کے شوہر میجر ہمایوں کی موت کی طرف اشارہ کیا۔ آج وہ التمش کی بات سننے نہیں بلکہ اپنی سنانے آیا تھا۔

”آدم خور شیر کے لئے بندوق بھی تو خطرناک ہوتی ہے!“

”نشانہ چوک بھی تو سکتا ہے۔“ مسیح نے قدم جمائے۔

”میں نے شکار بیشک نہیں کیا لیکن شوٹنگ...“

”جانتا ہوں۔“ مسیح بولا ”آپ نشانہ بازی کے مقابلے جیتے ہیں لیکن

سلسلے مار گٹ پر نشانہ لگانا اور بات ہے اور جنگل میں آدم خور شیر کا سامنا کچھ

اور۔“

”کیا اسی لئے تم چاہ رہے ہو کہ میں اپنا ارادہ بدل دوں“

”ایک اور بات ہے۔“

”کیا۔“ التمش نے تیوری چرہا کر پوچھا۔

”مجھے ڈر ہے تماش کہیں تاریخ خود کو نہ دہرائے۔“ مسیح نے صاف

صاف کہا۔

”مسیح یہ تم وہی کب سے ہو گئے؟“ التمش نے مسیح کے خلوص پر

ذرا برابر شک نہیں تھا۔

”آپ جانتے ہیں نور مجھے کتنی عزیز تھی۔“ التمش مسیح کو غور سے سنتے

رہے۔ ”میں نہیں چاہتا وہ منحوس حالات پھر دہرائے جائیں۔ اور بخت

خاندان یوں ملیا میٹ ہو جائے۔“

”جس وجہ سے تم مجھے منع کر رہے ہو اسی وجہ نے مجھے شکار کا عزم

دیا ہے۔“ التمش اٹل تھے۔

”آپ ایک حیوان سے بدلہ لینا چاہتے ہیں؟“ مسیح نے تانت پوچھا۔

”میں نہیں چاہتا کہ ایک حیوان پھر کسی عورت کا سہاگ چھینے، پھر

کچھ معصوم بچوں کو اپنے آنسو اپنی ہی آستینوں سے پونچھنے پڑیں۔“ التمش نے

کہا۔

”یہ کام کوئی اور بھی تو کر سکتا ہے۔“ مسیح نے بحث کی۔

”وہ، کوئی اور اختر بخت کا بیٹا یا نور کا بھائی تو نہیں ہوگا۔“ انکے لہجے

میں کیلا پن تھا۔ مسیح انہیں غور سے دیکھتا رہا۔ وہ ان کی ضد سے واقف تھا

”تماش میں نے بچپن اور لڑکپن آپ کے ساتھ ہی گزارا ہے۔ آپ کی

خدا اچھی طرح جانتا ہوں۔ لیکن مجھے بھی کبھی اپنی ضد پوری کرنے کا حق ملنا چاہیے۔“

”کیا تمہارے حقوق اسی طرح باقی نہیں ہیں جو ڈیڈی نے دیئے تھے؟ مسیح کا بڑھتا ہوا اصرار التمش کے لئے نئی چیز تھی۔“

”آج ایک حق میں آپ سے حاصل کر کے رہونگا۔“ مسیح کی آنکھوں میں استقلال تھا۔ ”اگر آپ شکار پر جائیں گے تو میں بھی آپ کے ساتھ چلونگا۔“ اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا اور پلٹ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

مادھور اؤ مدھول نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اخبار میں اشتہار دینے سے پہلے التمش کو آدم خور شیر کو مارنے کی اجازت دیدی۔ اسکے لئے باقاعدہ اجازت نامہ جاری کیا کیونکہ عام شکار پر پابندی تھی۔

شیر کے بارے میں متعدد کہانیاں بچوں کو سنائی جاتی ہیں کہ شیر آیا اور اس نے میمنے کو چیر پھاڑ دیا۔ یا پھر کسی چھرنے شیر کو سبق پڑھایا۔ لیکن جب دو بدوشیر سے ملاقات ہوتی ہے تو اسکی ہیبت اور رعب سے سامنے والا پتھر بن جاتا ہے حتیٰ کہ سرکس کے رنگ میں بھی جب شیر داخل ہوتا ہے تو تماشا بینوں میں پل بھر کے لئے سکوت قائم ہو جاتا ہے۔

التمش نے لڑکپن میں کئی بار شیر کا شکار میں حصہ لیا تھا لیکن اب وہ وائلڈ لائف کے بقا کے حامیوں میں سے تھے۔ لیکن جہاں انسانی زندگیوں کو جانوروں سے خطرہ لاحق ہو جائے وہاں ضروری اور مناسب اقدام کی ضرورت ہوتی ہی ہے۔ کم از کم مہذب دنیا نے اپنی حفاظت کے یہی اصول بنائے ہیں

التمش نے مسیح کے انداز میں ملنے والی بات دیکھ لی تھی انہیں مسیح کی شرط ماننی پڑی کہ وہ تبھی شکار پر جاسکتے تھے جب وہ بھی ساتھ ہو۔ انکے شش و پنج کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ مسیح کی جان خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ مسیح بھی کوئی ماہر شکاری نہیں تھا۔ اسے شروع ہی سے جانوروں کو بلا وجہ مارنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ ویسے بدوق وہ چلا لیتا تھا اور اسکا نشانہ کم از کم التمش سے تو اچھا ہی تھا۔

مسیح نے التمش کی ذہنی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ وہ کسی بھی

قیمت پر اس درندے کو مارنا چاہتے تھے۔ شاید اپنی جان کی بازی لگانے پر آمادہ تھے۔ اسے تعجب تھا کہ التمش جیسا شخص جو ہر بات کو عقل کے پیمانے پر تولنے کا عادی تھا کس طرح اتنا جذبہ باقی ہو گیا کہ خود کو بلاوجہ خطرے میں جھونک دے۔ ہو سکتا ہے اسکا ذمہ دار انکا زخم خوردہ ضمیر ہو کہ جب انکے خاندان کو انکی ضرورت تھی وہ دنیا کے کسی دور دراز حصے میں اپنے شوق کی تکمیل کر رہے تھے جو اب انکا پیشہ بن چکا تھا۔ اور اب شاید شدت جذبات میں وہ ایک جانور کو اپنا رقیب سمجھنے لگے اور خود کو خطرے میں جھونک رہے تھے۔ اور مسیح ہی نہیں چاہتا تھا۔ حالانکہ میدان عشق میں التمش ہی اسکے تنہا رقیب تھے۔

شاید انکا بیچ نہ ہوتا تو وہ کاکل کی محبت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ کاکل اسے پسند کرتی تھی لیکن انس اور محبت کے درمیان کا فاصلہ کبھی پامنا نہیں گیا۔ اسکی شخصیت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوئے جا رہے تھے۔ اسکی لہجہ ہمت ہی نہیں ہوئی کہ حقیقت کی تلاش کرے۔ حقیقت کی تلاش اکثر ایسے مقام پر پہنچا دیتی ہے جہاں سے واپسی ممکن نہیں ہوتی۔ اب بھی یہ ممکن تھا کہ کاکل التمش کی طرف سے مایوس ہو کر اسکی محبت قبول کر لے مسیح نے اپنی کشتی تاراج نہیں ہونے دی تھی۔

دور مسیح کے التمش کے ساتھ جانے کی سخت خلاف تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اسکا اکلوتا بیٹا کسی اور کے لئے جان جو کھم میں ڈالے۔ وہ خواہ

التمش ہی کیوں نہ ہو۔

”آئی تم بھول جاتی ہو کہ برسوں تم نے بھی اسی خاندان کا ٹنک کھایا ہے۔“

میں نے سمجھایا۔ اے اس بات کا افسوس تھا کہ اسکی ماں کی وفاداری اور محبت تھی تو نور کے ساتھ یا پھر اپنے کٹم کے ساتھ۔ دوسروں کے ساتھ وہ صرف اپنا فرض نبھاتی تھی

”اے اپنے کھیسے سے مت نکالنا۔“ اس نے مسیح کو روکنے میں ناکام ہو کر بادل ناخواستہ اسکی جیب میں کوئی شے ڈال کر کہا۔ مسیح نے وہ چیز نکال کر دیکھی۔ وہ ایک دھات کا بنا بھینسے کا سر تھا۔ مسیح کو اس بات کا بھی افسوس تھا کہ اسکی ماں عیسائی ہونے کے باوجود اپنے قبیلائی توہمات میں الٹی رہتی تھی۔ پھر بھی وہ اسکے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا اسلئے اس نے خاموشی سے وہ تعویذ واپس اپنے جیب میں رکھ لیا۔ اور التمش کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ سوائے ڈور کے انکے ارادوں کو گھر میں کوئی نہیں جانتا تھا۔

التمش اطمینان اور سکون سے جیپ چلاتے رہے۔ انکے انداز سے ایسا لگتا تھا جیسے جنگل سیر کو جا رہے ہوں۔ البتہ ساتھ بھری ہوئی بندوقیں اور کار تو سوں کی پیٹی کوئی اور کہانی سناتی تھی۔ جنگل کے دامن میں مختصر دہاتی جھونپڑے خالی ہو چکے تھے۔ آدم خور شیر کا پٹروس کون پسند کرتا ہے؟

ابھی جنگل کا ابتدائی چھدراماحول ہی چل رہا تھا کہ کسی جانور کا نچا ہوا ڈھانچہ پگڈنڈی سے کچھ دور نظر آیا جو اس بات کی نشانی تھی پچھلی رات قریب

ہی کسی گاؤں سے شیر اپنا شکار اٹھالایا ہوگا۔ لیکن اس وقت اسکا وہاں موجود ہونا بعید از قیاس تھا۔ آدم خور شیر کی عادات و خصائل بدل جاتے ہیں۔ غالباً انسان کا خون چکھ لینے کے بعد اسکی سرشت میں بھی چالاکی اور کمینہ پن شامل ہو جاتا ہے وہ اتنی آسانی سے سامنے نہیں آتا۔ چمکے دیکر نکل جاتا اور پھر موقع دیکھ کر اپنا کمین گاہ سے شکار پر جھپٹ پڑتا ہے۔

اس جنگل کا چپہ چپہ التمش اور صبح کا جانا بوجھا تھا۔ گو اس پہچان کو عرصہ گزر گیا تھا پھر بھی شہروں کی طرح جنگل اپنے چہرے نہیں بدلا کرتے انکے لینڈ مارک انکی نشانیاں وہی باقی رہتی ہیں۔

جیپ کی بے پناہ رفتار گھنے ہوتے جنگل کے ساتھ ساتھ کم ہوتی جا رہی تھی۔ اچانک ایک گل دم بلبلی آکر جیپ کے بانیٹ پر بیٹھ گئی۔ التمش نے پل بھر کے لئے جیپ روک لی۔ کتنی عجیب بات ہے کہ جس جنگل میں خونخوار درندے بستے ہوں، وہیں قدرت نے ان بے ضرر معصوم پرندوں اور چوپایوں کو بھی بسایا ہے جو خود اپنی مدافعت نہیں کر سکتے۔ دنیا کے لئے بھی یہ امید افزا نشانی ہے۔ ہو سکتا ہے کبھی ایسا وقت بھی آئے جب دنیا میں مجبور کو طاقتور سے خطرہ نہ ہو

گلد م کے بارے میں مشہور ہے کہ نر اور مادہ دونوں مل کر اپنے بچوں کی نگہداشت کرتے ہیں جبکہ اور پرندوں میں مادہ ہی اپنے بچوں کی افزائش کی ذمہ داری سنبھالتی ہے۔ التمش نے گلد م کے استقبال میں جیپ روک رکھی گرم ریڈیئر کے باوجود گلد م بلبلی وہاں کچھ دیر ٹکی رہی۔ شاید وہ اپنے بچوں کے

لئے غذا تلاش کرتے کرتے تھک گئی تھی۔

گل دم کے اڑ جانے کے بعد وہ کچھ ہی دور گئے ہونگے کہ مسیح نے
التمش کے بازو پر ہاتھ رکھ کر آگے اشارہ کیا جہاں برسات سے گیلی زمین پر شیر
کے پنچوں کے نشان تازہ معلوم ہوتے تھے جو صاف اس بات کی نشانی تھے کہ
شیر ابھی ابھی وہاں سے ہو کر گزرا تھا۔ ساتھ ہی میزی آواز نے اور بھی انہیں
خبردار کر دیا کہتے ہیں جس جنگل میں شیر ہوں میزی چوہدار کا کام کرتی ہے با
ادب با ملاحظہ ہوشیار!

التمش اور صبح نے اپنی اپنی بندوقیں سنبھال لیں اور چوکنا ہو گئے۔
التمش دھیرے دھیرے جیب کو آگے بڑھاتے رہے تاکہ کسی ایسا مقام پر پہنچ جائیں جہاں شیر انکی زد میں رہے۔ ایک مقام پر انہوں نے جیب روک دی جہاں انکے پیچھے کافی اونچی چٹانیں تھیں اسلئے اس طرف شیر کا خطرہ نہیں تھا۔ لیکن کافی انتظار کے باوجود شیر کا نام و نشان نہیں تھا اور نہ ہی کوئی جانور عام کہاوت ہے کہ جس جگہ سے ہو کر جنگل کا بادشاہ شیر گزر جاتا ہے وہاں کی گھاس پر بھی منہ مارنے کی مجال کسی اور جانور کی نہیں ہوتی۔

شام ہونے لگی تھی۔ پرندوں کے جھنڈ، طرہ، حسینی پدہ، کستوری طوطے اپنی اپنی پناہ گاہوں کو لوٹ رہے تھے۔ جنگل کی دوسری آوازیں جاگنے لگیں وہ لاتینا ہی مدت تک اس جگہ شیر کے انتظار میں رہے نہیں رہ سکتے تھے انہوں نے تھرماس سے کافی نکال کر پی اور تازہ دم ہو کر آگے بڑھے۔

درختوں سے چھن چھن کر غروب ہوتے سورج کی قرمزی شعاعیں، زمین اور چٹانوں پر نیلے جڑی تھیں۔ انہوں نے اپنا لائحہ عمل بدلا۔ التمش نے صبح کو چٹانوں کے سلسلے کی طرف جانے کو کہا اور خود جیب کو ایک کنارے روک کر زمینی سطح پر بڑھے۔ انہیں یقین تھا کہ شیر ضرور اسی نواح میں موجود ہوگا کیونکہ آدم خور گھنے جنگل میں تو جاتا ہے لیکن خود کو بستی سے بہت دور نہیں یجاتا، خاص کر جب وہ بوڑھا اور کمزور ہونے لگے۔ کیچڑ میں پنچوں کے نشان بتاتے تھے کہ وہ آدم خور ضرور لنگڑا ہوگا کیونکہ چار پنچوں کے تسلسل میں ایک پنچے کا نشان مکمل نہیں بن رہا تھا۔ لہذا قرین قیاس تھا کہ

وہ چٹانوں کے مقابلے میں زمین اور پہاڑیوں کے غاروں میں سستانا پسند کریگا۔

التمش ہر غار نما کھوہ پر زیادہ چوکنے آگے بڑھتے رہے اور انکے ساتھ ساتھ چٹانیں پھلانگتا ہر طرف اپنی نظریں دوڑاتا مسیح۔ اس گھنے جنگل میں چھپے ہوئے شیر کی تلاش گھاس پھوس کے پہاڑ میں سوئی تلاش کرنے کے مصداق اور کیا سچہ کہ خود شیر کو انکی تلاش ہو! یہ تو وقت ہی بتا سکتا تھا۔

جھپٹنا ہو رہا تھا مگر جگنوؤں نے ابھی قمتے نہیں جلائے تھے۔ چشمر لگائے مسیح نے اپنی نظر کی صحت کو آزمانے کے لئے نشانہ لیکر دیکھا۔ اور چٹان سے نیچے زمین کے تنگ رستے پر التمش عین اسکی بندوق کی زد میں تھے۔ لیکن وہاں کچھ اور بھی تھا۔ عین التمش کے پچھے، بمشکل پچاس قدم کے فاصلے پر۔

”تامش!“ مسیح چلایا۔ لیکن اس سے پہلے کہ التمش پلٹ کر نشانہ لیتے شیر جست لینے کی پوزیشن میں آچکا تھا۔ مسیح کے لئے یہ بڑا آزمائش کا موقعہ تھا۔ وقت فیصلہ کن تھا۔ اسنے ایک چھلانگ لگائی اور بندوق کے ساتھ شیر پر کود پڑا۔ یہ سب کچھ چشم زدن میں ہو گیا۔ شاید وہ گولی داغتا بھی تو اس قدر جلد شیر تک نہ پہنچ پاتی۔ نشانہ لئے بغیر گولی داغنے کا مطلب التمش کی موت بھی ہو سکتی تھی۔

التمش نشانہ لے چکے تھے لیکن بھرا ہوا شیر مسیح کے ساتھ اس طرح گھتا ہوا تھا کہ انکا فائر کرنا مسیح کی جان لے سکتا تھا۔ مسیح مردانہ وار شیر سے اپنی مدافعت کر رہا تھا۔ اپنی بندوق کا بٹ شیر کے خونخوار جبڑے پر رسید

کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن ستم یہ ہوا کہ اسکا چشمہ چہرے سے جدا ہو کر دور جا گرا۔ التمش جانتے تھے کہ اسکی نظر کس حد تک کمزور تھی۔ بس چند ساعتوں کی بات تھی کہ شیر میسج کی گردن پکڑ کر بھنبھوڑ ڈالتا۔ التمش نے اپنے سارے حواس مجتمع کر کے بندوق کی لہلی بادی۔ انہیں وہ قدم اٹھانا ہی تھا ورنہ میسج کی جان سو فیصدی خطرے میں تھی۔ اب اسکے بچ جانے کی کم از کم پچاس فیصد امید تو کی جاسکتی تھی۔ انہوں نے نشانہ لیکر دوسرا فائر کیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ میسج کی خاک و خون میں تڑپتی لاش نہیں دیکھ سکتے تھے

کیا میسج سے دیرینہ رشتہ ختم ہو گیا؟۔ انہوں نے بو جھل دل سے

سوچا۔

وہ میسج اور کوٹھی میں اسکی موجودگی کے اس قدر عادی تھے کہ انہوں نے سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا کہ اسکی موجودگی وہاں کیا معنی رکھتی تھی۔ وہ پڑھا لکھا تھا۔ محنتی اور جفاکش تھا۔ لمانداری میں کوئی اسے چراغ نہیں دکھا سکتا تھا۔ جب التمش امریکہ میں تھے تو انھوں نے آفر دیا تھا کہ اگر وہ آنا چاہے امریکہ آسکتا ہے لیکن اس نے انکار کر دیا تھا۔ اسکی قناعت حیرت انگیز تھی۔ انہوں نے ہمیشہ ہی میسج کو ایک قابل بھروسہ دوست کا درجہ دیا تھا حالانکہ دونوں کے نظریوں میں بڑا فرق تھا۔ پھر کیا وجہ تھی کہ کچھ عرصے سے میسج کے تئیں انکے برتاو میں تبدیلی آرہی تھی۔ جسے میسج نے محسوس بھی کیا ہو گا تو خاموش رہا۔ اور اب وہ انکی خاطر موت سے لڑ گیا تو اپنے اندرونی تناؤ کی وجہ روز روشن کی طرح انکے سامنے آگئی۔ ہاں، اسکی ذمہ دار کاکل تھی۔ پہلی بار انہوں

نے اپنی کمزوری قبول کی۔ شروع میں جب انہوں نے مسیح کی نظروں کو تازیانہ تو طنزاً مسکرا پڑے تھے کہ اس لڑکی کے حسن نے مسیح کے پاؤں رہبانیت کی ڈگر سے اکھیر دئے تھے۔ لیکن وہ نہیں چانتے تھے کہ کاکل خود انکے پیراہن میں خوشبو بن کر سرایت کرتی جا رہی تھی۔ جس حقیقت سے وہ ابھی تک انکار کرتے رہے۔ کاکل میں اپنی بڑھتی دلچسپی کو محض گزرتے لمحوں کی چاپ اور عارضی دلی لگی سمجھتے رہے اب ایک تازیانہ بن کر انکے دل و دماغ پر پڑی تھی کیا وہ مسیح کو رقیب نہیں سمجھنے لگے تھے؟ کیا انہیں مسیح سے کاکل کی بے تکلفی ناگوار نہیں گزرتی تھی؟ انہوں نے مسیح اور کاکل کے آپسی میل ملاپ سے خود کو لاتعلق ثابت کرنے کا جو ڈھونگ رچایا تھا وہی اب انکا منہ چر رہا تھا کیا وفادار و نیک مسیح نے جان بوجھ کر خود کو انکے راستے سے ہٹا دیا تھا؟ مسیح خود سے بہت اونچا اٹھ گیا تھا۔

یہ سارے خیالات چشم زدن میں تصویریں بن کر انکے ذہن میں ابھر آئے۔ ذہن ایسی مشین ہے جو صدیوں کو لمحوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ التمش میں اب حقیقت سے انکار کی ہمت نہیں تھی۔ مسیح کا بے جان جسم انکے آگے پڑا تھا۔ یہ وقت کچھ اور سوچنے کا نہیں تھا۔ وہ مسیح اور شیر کی طرف لپکے۔ شیر اچھل کر دور جاگ رہا تھا۔ یہ پتہ چلانا مشکل تھا کہ مسیح مر چکا ہے یا شیر یا دونوں ہی ختم ہو گئے تھے۔ انکی ایک گولی شیر کو لگی تھی کیونکہ انہوں نے گھلتے ہوئے اندھیرے میں صاف اسکی دھاڑ سنی تھی اور اسے اچھل کر گرتا ہوا دیکھا تھا۔ ہو سکتا تھا دونوں ہی گولیاں شیر کے لگی ہوں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ

گویاں کھا کر گرنے سے پہلے شیر نے مسیح کا کام تمام کر دیا ہو۔ انہوں نے احتیاطاً شیر پر ایک گولی اور داغی۔ اسکے جسم میں تشخّص سا ہوا اور پھر وہ ساکت ہو گیا۔

مسیح کے خونیں جسم پر پہنچ کر انہوں نے اس کی نبض دیکھی اور اس کے دل کی حرکت سنی۔ ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی کیونکہ مسیح زندہ تھا۔ صرف خون بہہ جانے کی وجہ سے مہوش ہو گیا تھا۔ شیر کا حملہ اس کی پسلیوں پر ہوا تھا۔ سر میں بھی چوٹ تھی۔ اس کے کپڑے تار تار ہو رہے تھے اور بدن کے ہر حصے پر خراشیں تھیں۔

التمش نے سرعت سے مسیح کو اٹھا کر جیپ میں ڈالا۔ مردہ شیر کو فاریسٹ عملے کے لئے چھوڑا جو فائر کی آواز سن کر وہاں پہنچنے لگے تھے۔

مسیح کی زندگی اور موت کا سوال تھا۔ ہوا کے دوش پر سوار وہ مسیح کو لئے ہسپتال پہنچے جہاں ہر طرح کی سہولتیں میسر تھیں۔ اس وقت دنیا کا سب سے بڑا تحفہ ان کے لئے مسیح کی زندگی تھی۔ ہسپتال کی پوری مشنری حرکت میں آگئی۔ مسیح کے جسم سے بہت خون بہہ چکا تھا۔ لیکن خوش قسمتی سے وقت ضائع نہیں ہوا۔ کیونکہ اختر بخت جیسے ذمہ دار شخص نے گھر کے سبھی لوگوں کے خون کی جانچ کر وار کھی تھی۔ مسیح اور التمش کے خون یکساں نکلے اور التمش نے خود کو پیش کر دیا اس وقت تو مسیح کے لئے انہیں اپنی جان دینی ہوتی تو دریغ نہیں کرتے۔ خون دینے کے بعد کافی کا ایک پیالہ پی کر ڈاکٹر کے منع کرنے پر بھی وہ چل

پڑے۔ انہیں ڈورا اور کاکل کو خبر دینی تھی کہ مسیح اب خطرے سے باہر تھا
 مسیح مرد تھا۔۔۔ قوی تھا۔ تیزی سے رو بہ صحت ہونے لگا۔۔۔ اس
 نے پہلی بار جب آنکھیں کھولیں تو التمش کو سامنے زندہ سلامت دیکھ کر اس
 کی آنکھوں میں اطمینان و مسرت کی ہر دوڑ گئی۔ اور اس نے دوبارہ آنکھیں
 بند کر لیں۔

ڈورا اپنے پیٹے کو موت کے منہ سے واپس آتا دیکھ کر فوراً چرچ گئی۔
 جہاں اس نے صلیب کے آگے موم بتیاں جلائیں۔ ویسے اسے خوشی بھی تھی کہ
 اس نے بھینسے کا چھوٹا سادھات کا بنا سر مسیح کے جیب میں ڈال دیا تھا۔
 پھر بھی دل ہی دل میں اپنے پیٹے کی حالت زار کا ذمہ دار وہ التمش کو سمجھتی تھی
 اس کے دل و دماغ میں وبال سے اٹھ رہے تھے جس کا اظہار وہ کسی کے
 سامنے نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ ہر کوئی مسیح کی وفاداری کے ساتھ التمش کی
 فراخ دلی کو سراہ رہا تھا۔ التمش کے منع کرنے پر بھی مقامی اخباروں نے ان کی
 اور مسیح کی تصویروں کے ساتھ تفصیلی خبر نامہ چھاپا۔ انعامی رقم کو التمش کی
 درخواست پر جانوروں کے تحفظ کی مہم کے لئے دیدیا گیا۔

ابتدائی ہیجان کے بعد کوٹھی میں زندگی اپنے معمول پر آرہی تھی۔
 مسیح کی غیر حاضری کی وجہ سے التمش پر کام کا بوجھ بہت بڑھ گیا تھا۔ اسی لئے
 جب کاکل نے مدد کی پیشکش کی تو انہوں نے قبول کر لیا۔ مسیح سے ”باغاں“
 کے کام کی اونچ نیچ وہ بہت کچھ سمجھ چکی تھی چائے پود لگانے کا انتظام ہو چکا تھا
 لیکن مسیح کے حادثے کی وجہ سے فی الحال روک دیا گیا تھا۔ باغاں میں چائے

کے بیج بونے کی بجائے نرسری میں پنیری بنائی جاتی جسے بعد میں باغاں میں بکھیر دیا جاتا۔ اس کی بڑی حفاظت کی ضرورت تھی۔ پود کی جھاڑی بنتے تین سے سات سال لگ جاتے ہیں لیکن آنے والے سو سال تک یہ پودے اپنی بہار دیتے رہتے ہیں۔ ایسے سات ہزار پودے لگائے گئے تھے۔ جنہیں وقت آنے پر باغاں میں بکھیرنا تھا۔

ساری مصروفیات کے باوجود کاکل اپنی بنیادی ذمہ داری خوب نبھا رہی تھی۔ شہزاد اور زینو اب دل لگا کر پڑھ رہے تھے۔ پہلے جہاں وہ کامک رسالوں کی صرف تصویریں دیکھ کر خوش ہوتے تھے اب ان تصویروں سے متعلق کہانیاں خود ہی پڑھنے لگے تھے۔ کاکل نے ان کے معمول میں کوئی فرق نہیں آنے دیا تھا۔

بچوں سے نپٹ کر جب وہ لائبریری پہنچی تو التمش نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ایک خط اسکی طرف کھسکا دیا۔ پتے پر التمش کے توسط سے ”سینا ڈرنا“ لکھا تھا۔ ہاں، وہ چیاؤزوکا ہی خط تھا۔ اس نے التمش اور کاکل کا شکریہ ادا کیا تھا اور لکھا تھا کہ اگلے مہینے وہ اپنے وطن جانے والا تھا۔ کاکل کے لئے نیک تمنائیں بھیجی تھیں۔ وردو اور نیل کے بھی شکریہ کے خط آئے تھے جس میں انہوں نے ہندوستانیوں کے خلوص اور مہمان نوازی کو سراہا تھا وہ ہنوز اپنے مشاہدہ اور مواد کو موزوں شکل دینے میں مصروف تھے۔

وردو نے لکھا تھا کہ ہندستان میں ان کی توقع سے زیادہ مواد حاصل ہوا تھا۔ نیل کا خیال تھا کہ انڈیا میں فن تعمیر کا وہ خزانہ اور تحقیق کا سامان

موجود ہے کہ پیردھیاں گزر جائیں تو بھی یہ کام مکمل نہیں ہو سکتا۔ اس نے حیرت کا اظہار کیا تھا کہ اکثر ہندوستانی اپنے تہذیبی ورثے سے نابلدہ ہیں۔ وہ دلی میں نیشنل آرکائیوز کے

Microphotograph کا شکر گزار تھا جس نے اس کی بڑی مدد کی تھی۔

وہاں ایک خط اور بھی تھا۔

”کیرن نے شادی کر لی ہے“۔۔۔۔۔ التمش نے لاپرواہی سے خط کو ایک طرف ڈالتے ہوئے کہا۔

کاکل کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ خبر مبارکبادی کی مستحق تھی یا تاسف کی جہاں تک التمش کا تعلق تھا وہ جان گئی تھی کہ دلوں کو توڑنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ کیرن جیسے کتنے دل انہوں نے اپنی انا کی چوکھٹ پر روند کر پھینک دیئے ہونگے۔ خود وہ اپنی خودداری لئے کہاں کہاں جائے! کیسے اپنے جذبات کے اس آتش فشاں سے دامن بچائے جو اندر ہی اندر جیسے اسے سوختہ کئے جا رہا تھا۔

یونانی سیفو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُسے آتش فشاں کے دہانے میں چھلانگ لگادی تھی کیا کسی سے ناکام محبت نے ہی اسے یہ قدم اٹھانے پر مجبور کیا ہوگا؟ لیکن کاکل سیفو نہیں تھی کہ کسی کی محبت میں جل کر خاکستر ہو جانا ہی محبت کا انجام مطلق سمجھے۔ وہ سمجھتی تھی کہ کئی بار ڈمگ جانے کے باوجود اپنے جذبات پر قابو رکھنا ہی کردار کی عظمت ہے۔

نہ وہ سیفوتھی نہ کیرن۔۔۔

”سرکار“۔۔۔۔۔ خدمتگار نے اندر آکر کہا ”کوئی دو لوگ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

التمش کی تیوری چڑھ گئی۔۔۔ عام طور پر بغیر اپوائٹمنٹ کے کوئی ان سے ملنے نہیں چلا آتا تھا۔ خدمت گار ان کی چڑھی ہوئی تیوری کا مطلب سمجھ گیا

”میں نے پوچھا سرکار“۔۔۔۔۔ انہوں نے کہا وہ جو بھی ہوں آپ! نہیں دیکھ کر خوش ہو جائیں گے۔ ان کے ساتھ ایک بچہ بھی ہے۔۔۔۔۔ ملازم نے رک رک کر جملہ پورا کیا۔

”میں دیکھوں؟“۔۔۔۔۔ کاکل نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔ ”نہیں، تم ٹہرو میں دیکھتا ہوں“۔۔۔ پھر انہوں نے کچھ سوچ کر کہا ”تم بھی ساتھ آجاؤ“۔۔۔۔۔ کبھی کبھی باغاں میں کام کرنے والے لوگ کسی مدد کے لئے چلے آتے تھے لیکن مسیح انہیں پٹنایا کرتا تھا۔ التمش کو ان سے ملنے میں کوئی عار نہیں تھا کیونکہ ان کی یہودی راست ان کا فرض تھا۔ خدمت گار کے مطابق کوئی عورت بھی وہاں تھی جو اپنا بچہ لیکر آئی تھی۔ اسی لئے انہوں نے کاکل کو بھی ساتھ لے لیا۔

التمش اٹھ کر چلے اور ان کے پچھے کاکل بھی۔ کاریڈور سے نکل کر وہ ہال میں پہنچے۔

”بچی جان!“۔۔۔۔۔ التمش کے منہ سے نکلا اور کاکل سن سی رہ گئی۔ کیونکہ سامنے صوفیہ پر حور بانوی بیٹھی تھیں اور پاس اس کے والد قدا حسین

ایک شیر خوار بچے کو کندھے سے لگائے کھڑے تھے۔

تعارف کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ التمش خود ہی سمجھ گئے تھے۔
انہوں نے آگے بڑھ کر فدا حسین سے ہاتھ ملایا۔

کاکل نے حور بانو کو سلام کیا۔ اپنے والد سے ملتے ہوئے اسے ایسا لگا
جیسے کسی اجنبی سے مل رہی ہو۔

”یہ تمہارا بھائی فواد حسین ہے۔“ فدا حسین نے بڑی مسرت سے بچے
کو کاکل کی گود میں دیکر کہا۔ کاکل نے خجالت سے التمش کی طرف دیکھا۔ وہ
اسکی حالت زار سے اچھی طرح واقف زبان کو گال میں دبائے ہنسی روکے
ہوئے تھے۔

”سچی جان اپنے اپنے آنے کی خبر نہیں دی؟“۔ التمش کا لہجہ مٹھاس سے
بھرپور تھا۔

”اپنے ہی گھر جانا ہو تو خبر دینے کی کیا ضرورت ہے؟“۔ حور بانو نے
ٹھہسے سے گلوری منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”تم کیسی ہو؟“۔ اس بار انکا خطاب
کاکل سے تھا۔ وہ کاکل کا اوپر سے نیچے تک جائزہ لے رہی تھیں۔

کاکل دل ہی دل میں انکی ہمت کی قائل ہو گئی۔ جس صفائی سے
جھوٹ کہہ کر انہوں نے کاکل کو اوٹی پہنچایا اور التمش جیسے جہاندیدہ شخص کو
اپنی انگلیوں پر نچا دیا وہ انہی کا حصہ ہو سکتا تھا۔ اور اب وہ خود وہاں موجود
تھیں۔ بہ نفس نفیس۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

حور بانو کا ٹھہرے اب بھی وہی تھا البتہ بدن اب کچھ اور بھر گیا تھا۔ ناک نقشہ اسی طرح تیکھا اور خوبصورت تھا۔ لیکن ان خوبصورت آنکھوں میں اب غرور کا وہ شائبہ نہیں تھا جو کاکل نے پہلی ملاقات میں دیکھا تھا۔ اب ان کی آنکھوں میں ٹہراؤ اور چٹون میں سنجیدگی آگئی تھی۔ شاید جب عورت ماں بن جاتی ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ رتبہ فدا حسین نے انہیں سونپا تھا۔

کاکل نے دیکھا اسکے والد کی صحت اب پہلے سے کہیں اچھی تھی۔ ان کے رخساروں میں سرخیاں اتر آئی تھیں۔ بالوں میں اکا دکا سفید بال جھانک رہا تھا لیکن انکے انداز کی چستی اور آنکھوں کی چمک بتاتی تھی کہ وہ اپنی موجودہ زندگی سے خوش اور شاد ماں تھے۔ اچھے لباس کا انہیں ہمیشہ شوق رہا تھا چنانچہ اس وقت بھی وہ نیا اور بہترین سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ پہلے ان کی خوش لباسی کی ذمہ دار کاکل کی ماں تھی اور اب وہ سوٹ حور بانو کا مرہون منت تھا۔

ملازم نے جب دیکھا کہ مہمانوں کو قبول کر لیا گیا تو وہ حکم کا منتظر تھا کہ انکا سامان کن کمرے میں رکھا جائے۔ حور بانو نے خود ہی اسے وہ کمرہ بتا دیا جہاں پچھلی بار وہ ٹہری تھیں۔ انہیں خود پر زبردست اعتماد تھا۔ جب انہوں نے پہلی شادی کی تھی تو انکے عمر رسیدہ شوہر نے انہیں چمکنے والی بلبل کی طرح اپنی انگلی پر بٹھائے رکھا تھا۔ شوہر کے مرنے کے بعد گویا ان کے ہر بن موسے اپنی مدافعت کے لئے ہتھیار نکل آئے۔ تنہائی اور ہر اس کا مقابلہ وہ خود سیری اور خود پسندی سے کرتی رہیں۔ لیکن وہ اندر سے بودی تھیں۔ انہوں نے بہادری اور خود سری کا جو غلاف خود پر چڑھائے رکھا تھا اسے دیکھتے

ہوئے فدا حسین انہیں آئیڈیل شوہر کے روپ میں بھاگئے جو ہمیشہ ان کے احسانوں کے تلے ڈرے سہے اور ان کے حکم کے منتظر رہ سکتے تھے۔ وہ فدا حسین کی دائمی وفاداری خرید سکتی تھیں۔ کاکل کی ماں نے ان سے اندھی محبت کی تھی۔ ان کے لئے خود کو مسمار کر دیا تھا۔ لیکن حور بانو کی بات مختلف تھی۔ یہاں ان کا واسطہ ایک منجھی ہوئی عورت سے تھا جس نے اپنے والد ار بوڑھے شوہر سے میدان کا نظارہ کے سارے گن سیکھے تھے۔

فدا حسین کو حور بانو کے ساتھ بچے کو اٹھائے سیر دیاں چڑھتے دیکھ کر کاکل کی آنکھیں بھگی گئیں۔ کاش اسکی ماں نے بھی چند دن سکون اور راحت کے دیکھے ہوتے۔ بچپن سے جوانی تک بسنے اپنی ماں کو کشمکش میں مبتلا دیکھا تھا۔ کیا وہ اسکی ماں کا ہی قصور تھا جس نے اسکے والد کو احساس ذمہ داری سے محروم رکھا! مرنے والے کہاں اپنی صفائی پیش کر سکتے ہیں! یاد کا ایک طوفانی ہجوم تھا جو اسکے وجود پر حاوی ہو گیا۔

وہ بھول گئی کہ وہ کہاں کھڑی تھی۔ دھیرے سے ایک ہاتھ اسکے شانے پر آیا۔ وہ وہاں التمش کی موجودگی بھول گئی تھی۔ انہوں نے اسے پلٹا کر اپنے مقابل کیا۔ پتہ نہیں وہ کیسے اسکے دل کی بات جان لیتے تھے۔ ابھی چند لمحوں پہلے ان کے ہونٹوں پر تمسخرانہ مسکراہٹ تھی۔ اب وہ ہونٹ خاموش تھے اور ان اتھاہ آنکھوں میں ہمدردی اور احساس کی نرمی سمٹ آئی تھی۔ انہوں نے رخسار پر بہہ آئے اسکے آنسوؤں کو انگلی سے چھو کر جھٹک دیا اور جھول آئی لٹ کو کان کے پچھے کر کے کہا۔

”پینا ڈرنا، یہ موتی انمول ہیں انہیں ضائع نہ کرو۔“ کاکل کو ایسا لگا جیسے وقت ٹہر گیا ہو۔ وہ تنہا نہیں تھی۔ بسنے اپنا ماتھا دھیرے سے التمش کے سینے سے لٹکادیا اور آنکھیں بند کر لیں اسے بس ایک ایسے دم ساز کی ضرورت تھی جو اسکی دھڑکن سے اپنی دھڑکن ملا کر یقین دلاتا کہ وہ تنہا نہیں تھی۔ بعد میں التمش خواہ اسکی کمزوری کو اس کی شکست سمجھیں اسکا مذاق اڑائیں یا اس سے خفا ہو جائیں۔ اسے اب کسی بات کی پرواہ نہیں تھی۔

پہلی بار اسے اپنے باپ سے نفرت ہوئی۔ کیوں آئے تھے وہ وہاں اس نے تو اپنے ماضی کو دفن کر دیا تھا۔

”نہیں میں پینا ڈرنا نہیں ہوں تماش۔“ انکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان کے روبرو اس نے پہلی بار ان کا نام لیا۔ آج اس نے تکلف کی دیوار بھی توڑ دی۔

”کون ہو تم۔ مجھے اپنا پتہ دو۔ میں تھک رہا ہوں تمہیں کھوج کھوج کر۔“ التمش نے دونوں ہاتھوں میں اسکا چہرہ تھام کر کہا۔ ان کی آنکھوں میں تپش سی تھی جسکی لپٹیں کاکل تک پہنچ رہی تھیں۔ انکی آواز بالکل سرگوشی تھی کیونکہ وہ صرف اسکے لئے تھی۔ ”کون ہو تم؟“ انہوں نے کہا

”کس طرح پتہ دوں۔“ کاکل نے جیسے مادر اسے کہا ”میں خود کھو گئی

ہوں۔“

چہ پرسی از سرو سامانیم عمریست چوں کاکل
سیہ بنختم ، پریشان روزگارم ، خانہ بردشتم

اسے ہمیشہ یہ شعر اپنے حسب حال لگتا تھا۔ آج زبان پر آگیا۔ اے میرے جیب تو میرے اٹانے کے بارے میں کیا پوچھتا ہے۔ میں تجھے کیا بتاؤں کہ تیری حیات تو کاکل کی طرح ہے جس سے سیہ بختی، پریشاں روزگاری اور خانہ بدوشی جڑی ہے۔

التمش نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا برداشت کے مصمم ارادے کے باوجود خود غزیدگی کے وہ الفاظ اس کے منہ سے نہیں نکل رہے تھے جیسے کوئی اور طاقت اس سے یہ سب کہلوا رہی تھی۔ اس نے گھر چھوڑنے کے بعد جس ہمت واستقامت کا ثبوت دیا تھا۔ آج وہ سب برباد ہو گیا۔ وہ آج ایک ایسا سادیت پسند بچہ بن گئی تھی جو خود کو تازیانے لگا کر خود ہی اپنے آپ پر رحم کھا رہا ہو۔

”ابھی تم نے میرے سینے پر سر رکھا تھا“۔ التمش نے اس کا چہرہ اپنی طرف پھیر کر کہا ”کیا میرے دل نے تم سے کچھ نہیں کہا؟ یا تم سننا نہیں چاہتیں؟“ میں تمہیں اپنا ناچاہتا ہوں کاکل۔ ہمیشہ کے لئے اس بنجارہ زلف کو سنوارنے کا حق مجھے دے دو“۔ انہوں نے اس کی سرکش زلف کو نرمی سے چھو کر کہا۔ وہ زیر لب کہے جا رہے تھے۔ ان کے الفاظ کا سحر اس کے وجود پر چھانے لگا تھا اس کے آنسو خشک ہونے لگے۔ ساتھ ہی وہ دھیرے دھیرے ہوش کی دنیا میں واپس آئی۔ یہ سب کیا کہ رہے تھے التمش۔ کیا اس کی محرومی کا ماتم استیلا بڑھا کہ انہیں اس پر رحم آنے لگا۔ لسنے تو صرف عارضی دمسازی کی تمنا کی تھی۔ سلمے سراب کو کھڑا دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ التمش اس سے ایک بے رحم مذاق

کر رہے تھے۔ تب کیا ہو گا جب اسکی آنکھ کھلے گی۔ کیا تب وہ ان کی آنکھوں کا
 تمسخر، ہونٹوں کی پاگل کر دینے والی مسکراہٹ سہہ سکے گی؟۔ لیکن نہیں وہ
 اسکے ساتھ کھلوڑا نہیں کر رہے تھے۔ وہ بوجہ، آنکھوں میں وہ نرمی اسی وقت آتی
 ہے جب انسان دل کے ہاتھوں مجبور ہونے لگتا ہے۔ ہمدردی اور محبت میں
 بڑا فرق ہے۔ ہمدردی کا تعلق دماغ سے اور محبت کا دل سے ہوتا ہے۔ التمش
 جو کچھ کہہ رہے تھے وہ انکے دل کی آواز تھی۔ اسے لگا وہ کچے دھاگے کے ایسے
 جھولے پر بیٹھی تھی جو اسے کبھی شادمانی کی طرف لیجاتا تھا تو کبھی ناامیدی اور
 بربادی کی طرف۔ نہیں، اسے کچھ وقت چاہیے تھا۔ ان خوابناک باتوں کے
 تجزیے کے لئے جو نشہ آور شراب کی طرح اسکے رگ و پے میں سرایت کر رہی
 تھیں۔ یہی وقت تھا سنبھلنے کا، اسنے خود کو جھنجھوڑا التمش نے کئی بار اس سے
 بے ضرر فلرٹ کیا تھا لیکن آج انکے انداز کچھ اور ہی تھے جو اسکے لئے زندگی اور
 موت کا سوال بن سکتے تھے۔ اس نے آہستگی سے خود کو ان کی گرفت سے آزاد
 کیا اور یک بیک دوڑتی ہوئی سیدھیاں چڑھ گئی۔ التمش سیدھیوں کے
 پائیدان پر کھڑے اسکی ستلی کی طرح ہیولے کو معنی خیز مسکراہٹ سے دیکھتے
 رہے۔

”پینا ڈرنا!“ انہوں نے زیر لب کہا۔

اگلے دن التمش مدراس چلے گئے۔

”اسکا دوسرا بھائی کہاں ہے؟“ شہزاد نے چوپایوں کی طرح جھک کر

نواد حسین کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اسکے خیال میں ہر شہزاد کا کوئی زینو ہونا

ضروری تھا۔ اور زینو بھی اس سے متفق تھا۔

”چھپ گیا ہے۔“ زینو آنکھ مچولی کے لئے تیار ہوتا ہوا بولا۔ ”چلو ڈھونڈتے ہیں۔“

”مگر جب اسکے می ڈیڈی آئے تھے تو اسکا بھائی ساتھ نہیں تھا۔“ شہزاد نے جاسوسی دکھائی

”شاید وہ تماش کے ساتھ رات میں آیا ہوگا۔“ تم ادھر جاؤ میں ادھر جاتا ہوں۔“

اور دونوں فواد حسین کے جڑواں بھائی کی تلاش میں مصروف ہو گئے جسکا وجود ہی نہیں تھا۔

ادھر ادھر تلاش جب ناکام رہی تو شہزاد تخت کے پاس پہنچا جہاں فواد انگوٹھا چوسنے کا شغل کر رہا تھا۔

”مل گیا مل گیا۔“ شہزاد نے نعرہ لگایا ”دوسرا بھائی مل گیا۔“ اسکے نعرے نے فواد حسین کو دہلادیا اور وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر رونے لگا۔ حور بانو دوڑی آئیں۔ انہوں نے ابھی ابھی تو اسے نہلا کر اس کے کپڑے بدلے تھے۔ زینو بگٹ بھاگا آیا اور فواد کو دیکھ کر بولا۔ ”یہ تو دوسرا ہوا پھر پہلا کہاں گیا؟“ اور دونوں اسی انہماک سے پہلے بھائی کو ڈھونڈنے میں مصروف ہو گئے جو انکی دانست میں کہیں جا چکا تھا۔

کاکل نے لتنے میں آکر ان دونوں کو بتایا کہ کھیل ختم ہوا۔ اب انہیں بھی غسل کر کے کپڑے بدلنے ہیں۔ دونوں کشاں کشاں اسکے ساتھ

چلے گئے۔

کاکل نے اپنے والد اور حور بانو سے تعلقات بالکل رسمی رکھے تھے۔ پھر بھی وہ دونوں التمش کے مہمان تھے۔ بن بلائے ہی ہسی۔ نوکروں کو ان کے آرام کیلئے ضروری ہدایات دے کر اس نے اپنا فرض پورا کر لیا تھا۔ ویسے وہ انتظام نا بھی کرتی تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دو چار دن میں ہی حور بانو نے کوٹھی میں اپنا سکہ جما لیا تھا۔ وہ نوکروں سے اس طرح کام لے رہی تھیں جیسے چچی ہونے کے ناطے التمش کے گھر پر انکا پورا حق تھا۔ وہ آئی کیوں تھیں اور کب واپس ہونگی یہ کاکل نہیں جانتی تھی۔ نہ التمش نے ان سے ان کے آنے کا جواز مانگا تھا۔ خود حور بانو نے اپنی شاطرانہ چال کو یکسر بھلا دیا تھا جو کاکل کو اوٹی پہنچانے کی ذمہ دار تھی۔ کاکل کو حیرت اس بات کی تھی کہ حقیقت جاننے کے بعد بھی التمش کا برتاؤ دونوں سے نہایت مہذب اور بااخلاق تھا بلکہ وہ تو کبھی کبھی حور بانو سے مذاق بھی کر لیا کرتے۔ حور بانو زیادہ تر فواد کی دیکھ بھال میں مصروف رہتیں۔ بلکہ سیر کو جاتے ہوئے فدا حسین اور وہ شہزاد اور زینو کو بھی ہمراہ لیتے۔ اس نے تو شہزاد اور زینو میں جھگڑا ہوتے بھی دیکھا تھا کہ کون فواد کی پر ام دھکیلے گا۔

کاکل التمش کے جانے سے خوش نہیں تھی۔ وہ خود میں انکا سامنا کرنے کی ہمت نہیں کر پاتی تھی۔ تنہائی میں انکے الفاظ کی شیرینی کو پرکھنا چاہتی تھی۔ اپنی یکطرفہ محبت کا اقبال اور اس پر صبر بھی اس نے کر لیا تھا۔ اب التمش نے اسے ایک نئے اور مشکل تر امتحان سے دو چار کر دیا تھا۔ وہ ہرگز

نہیں چاہتی تھی کہ وہ مروت یا جذبہِ رحم سے اسے اپنانے کو تیار ہوں۔ وہ کسی بھکاری کا کشکول نہیں تھی جسے خیرات سے بھر دیا جائے۔

وہ ابھی ابھی شہزاد اور زینو کے ساتھ مسیح کو دیکھ کر آئی تھی۔ وہ اب روبصحت تھا۔ پسلیوں کے ہنجر پر پٹیاں اور پلاسٹر قمیص کے نیچے چھپا تھا ورنہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ شیر کا نوالہ بنتے بنتے رہ گیا۔ سر کی پٹی کھل چکی تھی۔ بایں کنپٹی پر زخم کا نشان اب بھی خونیں رنگ تھا۔ ڈاکٹر نے چلنے پھرنے سے منع تو نہیں کیا تھا لیکن احتیاط ضروری تھی۔ ڈور آنے دو بارہ اسکے زخموں کو چاندنی سونپی تھی۔

التمش روز مسیح کو دیکھنے کے لئے آتے رہے۔ ان کے مدر اس جانے کے بعد بھی ان کی ہدایت پر ان کی طرف سے پھولوں کا گلدستہ روز پابندی سے پہنچتا رہا۔

مسیح کے لئے کاکل کا مزاج پرسی کے لئے آنا، ہمیشہ ایک تازہ معطر ہوا کے جھونکے کی مانند ہوتا تھا۔ لیکن اب وہ کاکل کے ماتھے پر فکر کے آثار دیکھ کر بے چین تھا۔ وہ اسکے ماضی کو التمش سے زیادہ جانتا تھا۔ کوٹھی میں حور بانو اور فدا حسین کی آمد سے بھی واقف تھا ڈور اکاکل کے لئے اسے متفکر دیکھ کر خوش تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اسنے آدھی جنگ جیت لی۔

ہسپتال سے واپس آکر کاکل اپنے کمرے میں شہزاد اور زینو کا اگلے دن کا ہوم ورک تیار کر رہی تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہاں اسکے والد کھڑے تھے۔ آج ان کا بیٹا انکی گود میں نہیں تھا۔ اس نے طوعاً و کرہاً ہاتھ سے

بیاض رکھی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ یہ وہی خود غرض شخص تھا جس نے اس بھری دنیا میں اسے بے یار و مددگار چھوڑ دیا تھا۔ اسکی فرشتہ صفت ماں کا استحصال کیا تھا۔ خود کو بے حمیتی سے ایک مالدار عورت کے ہاتھوں بیچ دیا تھا اور اب جبکہ اس نے اپنے لئے ایک ٹھکانہ ڈھونڈ لیا تھا تو وبال بن کر وہ وہاں بھی آ پہنچا تھا۔

”میں جانتا ہوں بیٹی تم مجھ سے خفا ہو۔“ جب کاکل نے انہیں اندر آنے کے لئے نہیں کہا تو وہ خود اندر آتے ہوئے بولے۔ اس نے ان کی بات کا جواب نہیں دیا اسی طرح کرسی کی پشت تھاے دریچے سے باہر دیکھتی رہی۔

”میں۔۔ میں اب وہ نہیں رہا ہوں جو تھا۔“ انکے لہجے میں ڈھکی چھپی اپیل تھی گویا وہ کاکل سے معافی مانگ رہے تھے۔

”میں پیار کرتا تھا بیٹی تمہاری ماں کو بہت پیار کرتا تھا۔“ انہوں نے زمین پر نظریں گاڑے کہا

”آپکی محبت بنجر زمین تھی بابا جو کبھی سیراب نہیں ہوتی۔ میری ماں نے مٹا دیا خود کو آپ کہتے ہیں آپ بدل گئے ہیں۔ آپ بالکل نہیں بدلے بابا۔ آپ وہی ہیں۔ آپ نے پہلے ایک عورت کا استحصال کیا اب دوسری کا کر رہے ہیں۔“ الفاظ سخت تھے۔

”کاکل میں دوسری بار اس گناہ کا سزاوار نہیں ہوں۔“ فدا حسین بیڈ کے کنارے ٹپکتے ہوئے بولے۔

”پھر یہ نئے نئے قیمتی سوٹ، ہاتھ پر لگی مہنگی گھڑی۔۔۔“

”یہ سب میری اپنی کمائی کے ہیں بلکہ یہ کہتے ہوئے مجھے شرم نہیں آتی کہ یہ سب کچھ تمہاری ماں کا دیا ہوا ہے۔“

”میں سمجھی نہیں۔“ کاکل نے تیوری چرہا کر کہا۔ اسے اپنے باپ کی نااہلی کا یقین تھا لیکن وہ جھوٹے نہیں تھے۔

”میں تمہیں یہی تو بتانا چاہتا ہوں۔“ فدا حسین نے کہا۔ ”شاہدہ کی دمسازی اور قربانیوں نے جہاں مجھے بے حس بنا دیا تھا۔ وہاں حور بانو کے برتاؤ نے مجھے جھنجھوڑ دیا۔ شاہدہ جس نے میری ہر خواہش اور راحت کو اپنا مذہب بنایا ہوا تھا، وہاں حور بانو نے واضح کر دیا کہ میں ان کے ٹکڑوں پر پلنے والا نکٹھو شاعر ہوں۔“

”لیکن ابھی آپ نے بتایا کہ مرنے کے بعد بھی ممی کی مدد آپ کے شامل حال رہی۔“ کاکل نے انکی بات کو نظر انداز کر کے انکے بیان کا مطلب جاننا چاہا۔ ”ہمارے پاس تو کچھ نہیں بچا تھا بابا۔!“

”تمہاری ماں کے مرنے سے پہلے حکومت کے بٹھائے پے کمیشن نے سرکاری ملازموں کی تنخواہوں پر نظر ثانی کی تھی۔ اس پے کمیشن کی سفارشات سرکار نے منظور کر لی تھیں۔ تمہاری ماں کے انتقال کے بعد ان کی تنخواہ کا Fixation ہوا جسکے نتیجے کے طور پر مجھے کافی بقایا ملا۔“ کاکل انکی بات غور سے سن رہی تھی۔

”وہ پیسہ ٹھوکر کھانے کے بعد مجھے ملا تھا۔ کاکل میں اس موقعہ کو ضائع نہیں کر سکتا تھا۔“ انہوں نے اس شدت سے کہا جیسے کوئی انسان کھائی

میں گرتے گرتے آخری دم سنبھل گیا ہو۔" بجائے بیجا طور پر وہ پیسہ اڑانے کے میں نے اسے Real Estate میں لگا دیا۔ اب میں ایک باعزت پراپرٹی ڈیلر ہوں۔ اللہ کی عنایت سے مجھے کافی منافع ہو رہا ہے۔ ویسے میں حور بانو کا شوہر اور انکے بچے کا باپ ضرور ہوں۔ لیکن ان کے احسانوں تلے دبا انکے ٹکڑے توڑنے والا بے حمیت انسان نہیں ہوں جسکی کمزوریوں کو انہوں نے خرید ا تھا۔"

اپنے والد کے منہ سے ان الفاظ کو سن کر کاکل کو ایسا لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی تھی۔ جو معجزہ اسکی ماں کی خاموشی اور خدمت نے نہیں دکھایا تھا وہ حور بانو نے کر دکھایا۔ اور بدلے میں اسکے والد نے انہیں وہ نعمت دی جس سے وہ محروم رہی تھیں۔ اب وہ صاحب اولاد تھیں۔ اور اسکے والد ایک احساس ذمہ داری کے ساتھ انکی جائیداد کی دیکھ بھال کر رہے تھے جو ان کے خوشامدی دوست نماد شمنوں نے تباہی کے رستے پر ڈال دی تھی۔ اب وہ حویلی میں نہ وہ مشاعرے تھے نہ پر تکلف دعوتیں تھیں۔ فدا حسین اور حور بانو نے اپنی اپنی زندگیوں میں ملے دوسرے موقع سے فائدہ اٹھایا تھا۔

لیکن ان کے اوٹی آنے کی وجہ کیا تھی؟

"کاکل میں تجھے لیجانے کے لئے آیا ہوں بیٹی"۔ فدا حسین نے مکمل خود

اعتمادی سے کہا

"کہاں، حور بانو کی حویلی میں؟"۔ کاکل وہ دن کیسے بھول سکتی تھی

جب حور بانو کی حویلی میں اسکے لئے سر چھپانے کی جگہ نہیں تھی۔

”نہیں کاکل، میں حور بانو کے ساتھ نہیں رہتا۔“ اسکے والد بولے
 ”حور بانو میرے ساتھ رہتی ہیں۔“ وہ زعم سے بولے اور جانے کے لئے اٹھ
 کھڑے ہوئے۔ ”وہ حویلی کتب خانے میں تبدیل ہو گئی ہے۔ میں نے خود اپنا
 گھر بنالیا ہے۔“

کاکل نے اپنے والد کی نئی حاصل شدہ خوشیوں کو نیک تمناؤں سے
 نوازا۔ اور اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

مسیح ہسپتال سے واپس آچکا تھا۔ لیکن ڈاکٹر کی صلاح کے مطابق وہ
 زیادہ تھکادینے والا کام نہیں کر رہا تھا۔ کاکل ابھی ابھی پھولوں کا گلہ ستہ چھوڑ
 گئی تھی۔ جو ہنوز مسیح کے ہاتھ میں تھا۔ ڈور اس سے کئی بار کہتے کہتے رک گئی
 تھی۔ ابکی بار جب وہ اسے سوپ دینے کے لئے آئی تو مسیح نے کہا۔
 ”آئی پریشان کیوں ہو؟“

”تیرا ہی سوچ کر پریشان ہے آئی۔“

”کیوں، اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں!“ اس نے مسکرانے کی
 کوشش کی۔

”آئی پھر تم اسی بات پر اتر آئیں۔“ مسیح نے سوپ کے گھونٹ لے کر
 ہنستے ہوئے ڈوراکو ملنے کی کوشش کی۔

”ابی تو مسکری نہیں کر۔“ ڈوراکو نے کمر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”میں تو
 چھو کری بھی دیکھ لیا۔“

”کونسی لڑکی ڈھونڈھ لی ہے۔ کہاں ہے وہ؟“ مسیح نے ازراہ مذاق

کرسی کے نیچے اور کانس پر نظر دوڑائی۔

”آئی، بی بی کابات بولتا ہے۔“ ڈور ابولی اور مسیح نے سوپ کا کٹورا
پٹک دیا۔

”کیا کہہ رہی ہو آئی۔“ لسنے بھر کر کہا ”کہیں تم نے کاکل سے تو کچھ
نہیں کہا؟“

”بولا ہے۔“ ہیلی ڈورانے کہا ”وہ بی تو تیرے سے پیار کرتا ہے۔ وہ
کھد بولا ہے ڈوراکو۔“

مسیح سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ”کیا کہا تھا کاکل نے؟“ وہ تقریباً چلایا۔ اسکی
آواز اتنی اونچی تھی کہ کوارٹر کے باہر التمش تک جا پہنچی۔ وہ مدراس سے
واپس آچکے تھے اور اب تازہ دم ہونے کے بعد مسیح کی خیریت پوچھنے کے لئے
کوارٹر چلے آئے تھے۔ وہ ڈور اور مسیح کو مصروف دیکھ دخل انداز ہونا نہیں
چاہتے تھے۔ لیکن وہ جیسے ہی واپس پلٹے مسیح کے جملے نے انہیں چونکا دیا۔ اگر
کاکل کا نام نہ لیا جاتا تو وہ واپس چلے ہی گئے ہوتے یہ سوچ کر کہ ماں اور بیٹے
میں کچھ اختلاف رائے ہو رہا تھا۔ لیکن جس طرح للی کے سفید نازک پھول
بھینی بھینی خوشبو والے مسیح کا دامن نہیں چھوڑ رہے تھے۔ اسی طرح ایک
ہراتی ہوئی ریشمی زلف جو بار بار کسی رخسار پر جھول جاتی تھی التمش کے
تخیل کا ایک حصہ بن گئی۔

”آئی تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ میں عیسائی ہوں اور کاکل مسلمان
ہم کس طرح کر سکتے ہیں شادی۔ میری مشکلیں مت بڑھاؤ آئی۔ میں جا رہا ہوں

”ٹھیر جا۔ کدر جاتا ہے۔“ ڈور کی آواز آئی۔

”کیا ہے آئی“ مسیح نے دکھے دل سے پوچھا ”کیا ابھی اور کچھ باقی رہ گیا

ہے؟“

”ہاں، ہاں۔ وہ بات رہ گیا ہے جو میں کبھی کسی کو نہیں بولا۔“ ڈور ا کی آواز اونچی ہوتی گئی۔ اب بولے گا، جرور بولیگا۔ مسیح تم مسلمان ہے۔ تم اکھتر بکھت کا پٹا ہے۔“

”آئی۔!“ مسیح چلایا۔ اسکے ساتھ ہی دوسری قیامت آگئی۔ دروازہ زور سے کھلا اور التمش طوفان کی طرح داخل ہوئے۔

”بد نصیب عورت۔“ انکے لہجے میں شعلے لپک رہے تھے ”کیا بک رہی

ہے۔“

التمش کو وہاں دیکھ کر ڈور اساکت کھڑی ہو گئی۔ اسکے ہونٹوں کی دونوں جانب کھائیاں گہری ہو گئی تھیں۔ آنکھوں میں خوفناک چمک تھی۔ وہ التمش کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھور رہی تھی۔ مسیح کا سر جکرایا گیا اور وہ وہیں کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسے یقین تھا کہ اسکی ماں پاگل ہو گئی ہے۔

”نئیں ڈور پاگل نئیں ہے۔“ ڈور نے اپنے مخصوص انداز میں پاؤں

پٹک کر کہا ”برسوں سے سینے میں گھاؤ دبا کے رکھا تھا۔“ لسنے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”کسی کو نہیں بولا۔“

التمش پتہ نہیں کیا کر جاتے لیکن انہوں نے غیر معمولی تحمل سے کام

لیا۔ ڈور اکا الزام اتنا سخت تھا کہ غصہ و غضب سے مٹ نہیں سکتا تھا۔ لیکن انہی آنکھوں میں چختی چنگاریوں نے خود ڈور کی ہمت پست کر دی۔ اس نے ان کے سامنے گھٹنے ٹیک کر سر جھکا دیا۔

"چھوٹے سرکار ہم سچی بولتا۔" اسکی آواز لرز رہی تھی "مسیح تمہارا بھائی ہے۔"

اور پھر اس نے من و عن اپنی کہانی کہہ سنائی۔ وہ قسمیں کھا کر کہہ رہی تھی کہ جب بیگم کی بیماری میں اسے کوٹھی پر بلایا گیا تھا۔ تبھی وہ اختر بخت کی ہوس کا شکار ہوئی تھی۔ اختر بخت لاکھ اپنی بیوی کو پیار کرتے ہوں۔ پھر بھی مرد تھے۔ بیگم کی طویل علالت نے انہیں اپنا ضبط توڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔

التمش کی سرد نظر اور بھینچے ہوئے ہونٹ سپاہیہ تھے کہ ان کا ذہن کس بحران سے گزر رہا تھا۔ جب ڈور انے اپنی بات ختم کی اور سینے پر کمر اس بنایا تو وہ بغیر کہے پلٹے اور کورائر کے باہر چلے گئے۔

"آئی کیوں کہا۔ کیوں کہا تم نے یہ سب کچھ۔ کیوں کہا؟" مسیح نے یوں کہا جیسے اسکے بدن میں بس ایک رفق زندگی کی بچ گئی ہو۔

"جو بچ تھا وہ بولا۔" ڈور اکا سنگلاخ چہرہ اور بھی فولادی ہو گیا۔

"تو لو۔" مسیح نے اسکا ہاتھ اپنے سر پر رکھ کر کہا "اب کہو تم بچ کہہ رہی

ہو۔"

ڈور اکو غصہ آگیا کہ خود اسکا بیٹا اسکی بات کا یقین نہیں کر رہا تھا۔

سنے ایک جھٹکے سے مسیح کا ہاتھ دھکیل دیا۔ "ڈورا کو جھوٹ بولنے کا جبرورت نہیں ہے" اور اندر خلی گئی۔

مسیح کی صحت پر یہ تازیانہ گہرا تھا۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ چہرے پر کی سفیدی کاغذ کی سفیدی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اسے لگا جیسے گھٹنوں سے اس کی سکت جاتی رہی تھی۔ وہ بمشکل تمام اٹھا۔ پاس رکھے گلاس سے پانی پی کر لڑکھڑاتا ہوا باہر نکل گیا اور ڈورا اسے پکارتی رہ گئی۔

التمش اپنے والد کی شخصیت سے بہت متاثر تھے۔ ان کا دل کس طرح مان لیتا کہ ڈورا کا الزام سچ تھا۔ لیکن جہاں شک اپنا بیج بوتا ہے وہاں وہ وفادار درخت اگ آتے ہیں جو ذہن کے تلوے چھلنی کر دیتے ہیں۔ لیکن ڈورا کا الزام سچ تھا تو سارا سینیر ہو ہی بدل جاتا تھا۔ اپنے والد کے کردار پر زبردست ایقان کے باوجود نئے زمانے کا پروردہ ذہن منطقی طور پر سچائی تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کیا یہی وجہ تھی کہ انکے والد نے اپنی وصیت میں ڈورا اور مسیح کے لئے کافی دریا دلی کا ثبوت دیا تھا۔ کیا یہی وجہ تھی کہ ڈورا نور سے جتنا پیار کرتی تھی خود ان سے کھنچی رہتی تھی، کیوں کہ وہ سمجھتی تھی کہ التمش کی وجہ سے مسیح کا حق جائیداد میں مارا جائیگا۔

اپنی بیوی سے والہانہ محبت اور اپنے کڑے اصولوں کے باوجود اختر بخت بھی انسان تھے، مرد تھے، کیا انکی ایک وقت کی بھول کو اپنی بیوی سے بے وفائی سمجھا جاسکتا تھا۔ غیر جانبداری سے سوچنے کی کوشش کرتے ہوئے

بھی التمش کو لگا کہ اپنے والد کا جو مرقع انہوں نے اپنے ذہن میں بسا رکھا تھا اب ان سے نظریں چرا رہا تھا۔ اگر مسیح بھی ان ہی کی اولاد تھی تو انہوں نے جان بوجھ کر اسکے ساتھ ناانصافی کی تھی جو انکے کردار کی سب سے بڑی کمزوری ثابت ہوئی تھی۔ مسیح کے بچپن اور لڑکپن کو بھی التمش کی برابری نہیں دی گئی تھی کہ وہ احساس کمتری میں بدل کر اسکی فطرت کا جز بن گیا جسے وہ فراخ دلی سے چھپاتا رہا۔

ان کے سامنے رکھے ایش ٹرے میں بجھے ہوئے سگریٹوں کا انبار لگا تھا اور پیشانی پر گہری شکنیں تھیں۔ ڈورانے ایک ہی وار میں ان کے محل مسمار کر دیے تھے اور ان کھنڈروں میں کھڑے وہ اپنا مقام پہچاننے کی تگ و دو میں لگے تھے۔ لیکن انکی پریشانیوں کا پیالہ ابھی چھلکا نہیں تھا کہ ڈاک میں آئے ایک خط نے یہ کسر بھی پوری کر دی۔ اتفاق کی بات تھی کہ انکے ہر مسئلے کا سلسلہ جا کر کاگل سے ملتا تھا۔

مدراس جانے سے پہلے التمش کے اقرار محبت اور پھر فدا حسین میں خوشگوار تبدیلی نے کاگل کے دل سے غیر یقینی کے تکلیف دہ احساس کو مٹا دیا تھا۔ اس نے جہاں تک غور کیا اسے یقین ہوتا گیا کہ التمش نے جو کچھ کہا ہے دل سے کہا تھا۔

دل میں ارمانوں کا ایک ہجوم لئے وہ لائبریری میں داخل ہوئی۔
 ”کس کی تلاش میں آئی ہو؟“۔ انکا لہجہ برف کی مانند سرد تھا۔

وہ ہونق سی انہیں دیکھتی رہ گئی۔ ان کے بال بکھرے ہوئے تھے اور

آنکھوں میں یخ تھکان کے آثار۔ انہوں نے مائی کی گرہ ڈھیلی کر کے اسے یو نہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کیسی ذہنی دوزخ پار کر کے بیٹھے تھے۔ انکے لہجے میں سانپ کی پھنکار تھی۔

”کس کی تلاش میں آئی ہو۔“ ”انہوں نے اپنی خونیں نظریں اٹھا کر دوبارہ اس سے پوچھا اور اٹھ کر اسکے قریب چلے آئے۔“ ”میری!۔ میح کی یا تمپارے اس ناکام عاشق کی جس نے یہ خط لکھا ہے۔“ ”انہوں نے ایک خط اس پر دے مارا۔ وہ آنکھیں پھاڑے انہیں دیکھتی رہ گئی۔“

”اب تمہاری ان حیران آنکھوں کا جادو مجھ پر نہیں چلے گا کاکل فدا

حسین“

”کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“

”خط پڑھو! التمش کا لہجہ تحکمانہ تھا۔ اس لہجے میں کسی اور نے اس سے بات کی ہوتی تو وہی خط وہ اسکے منہ پر دے مارتی لیکن اسے بھی معاملے کے تہہ تک پہنچنا تھا۔ اس نے خط کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ خط التمش کے نام تھا۔ جوں جوں وہ پڑھتی گئی اسکے رونگٹے کھڑے ہوتے گئے کیونکہ وہ خط حفیظ کا تھا جسے کاکل نے دھتکار دیا تھا۔ خط میں حفیظ نے بہت ہی ناشائستہ الفاظ میں خود اپنے اور کاکل کے معاشرے کی داستان لکھی تھی اور انکشاف کیا تھا کہ جب کاکل کو حقیقت کا پتہ چلا کہ وہ غریب ہے تو اس نے اس سے شادی سے انکار کر دیا آگے لکھا تھا کہ اب وہ اپنی محنت اور جفاکشی سے استقامتا ہے کہ کاکل کو ہر آسائش مہیا کر سکتا ہے اور پھر حفیظ نے التمش سے التجا کی تھی کہ اسکی روٹھی

محبوبہ۔ کو نوکری سے درخواست کر دیں، کیونکہ اب اسے نوکری کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اسے واپس حفیظ کے پاس جانے پر آمادہ کریں۔

ظاہر ہے وہ خط حفیظ کی زخمی انا کا رد عمل تھا لیکن کاکل کے لئے پروانہ تباہی۔ التمش نے دیکھا خط کاکل کے ہاتھوں میں لرز رہا تھا۔
 "اور کتنوں کے ساتھ تم نے یہ کھیل کھیلا ہے؟" انکی آواز بڑی مسطح اور سنجیدہ تھی۔

"یہ۔۔۔۔۔ یہ جھوٹ ہے"۔ وہ اتنے قریب تھے کہ اپنی بات سنانے کے لئے اسے پچھے جھکنا پڑا۔

"کیا جھوٹ ہے؟ التمش نے جھک کر اس کی وحشت زدہ آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔" کیا مسیح کے نام تمہارا نوٹ جھوٹ ہے؟ کیا کیو پڈ کا وہ قیمتی مجسمہ جھوٹ ہے جو اس نے تمہیں تحفہ دیا۔ کیا اسکے ساتھ وہ سیر سپاٹے جھوٹ ہیں؟ کیا اس غریب حفیظ کی درخواست بھی جھوٹ ہے جو تمہاری بے وفائی کے باوجود تمہیں اپنا ناپا چاہتا ہے؟ کاکل تم ہمیشہ اپنے جذبات کو پیسے میں تولنے کی عادی ہو؟" انہوں نے خط کی طرف اشارہ کیا۔

"تم اسے ٹھکرا کر چچی جان کو بیوقوف بنا کر یہاں چلی آئیں۔

In search of greener pasture مسیح پر ڈورے ڈالے۔ اسکے نیک اور پار سادل کو بھٹکایا۔ ادھر معصومیت کا لبادہ اوڑھ کر مجھے دام میں پھانسنے کی کوشش کی۔

جرم کی ایک طویل فہرست تھی جس پر اسے اپنے اقبال جرم کی مہر ثبت کرنی تھی۔

”لیکن مس کاکل فدا حسین“۔ وہ اسکی طرف درشتگی سے جھکے۔ تم مجھے اتنا آسان شکار نہیں پاو گی۔“ انہوں نے ایک جھٹکے سے اسے ٹھکرا دیا۔

”تم نے مسیح کو اس لئے لٹھائے رکھا کہ تم جانتی تھیں وہ میری جائیداد میں آدمی کا وارث بن سکتا تھا۔“

کیا کہہ رہے تھے وہ کاکل سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ بالوں کے نیچے ان کی لمبی انگلیوں کا لمس اس کی گردن پر رینگ رہا تھا۔

”تم نے ایک تیر سے دو شکار کرنے چاہے۔ مسیح اپنی قسم نبھانے کے لئے پادری بن جاتا تو میں تو تھا ہی۔“ انکے لمبے کا گہرا طنز۔ گردن پر تنگ ہوتی گرفت اسکے اوسان خطا کر رہی تھی۔ اس نے جب خود کو انکی گرفت سے آزاد کرانا چاہا تو انہوں نے دوسرا ہاتھ اسکی کمر میں جمائل کر کے اسکی راہ فرار مسدود کر دی۔

”میں، میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ بمشکل بول پائی۔

”کیا تم نے ڈورا کے سامنے اقبال نہیں کیا تھا کہ تم مسیح کو چاہتی ہو؟“

انکی گرفت اسکی گردن پر تنگ ہوتی گئی۔ ”جواب دو۔“

”کہا تھا۔۔۔“ اس نے درد سے دوہری ہو کر کہا ”لیکن۔۔۔“ اس سے

پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی انہوں نے اسے ایک جھٹکے سے آزاد کر دیا۔ اگر اس نے کرسی کی پشت کا سہارا نہ لے لیا ہوتا تو انکے قدموں میں ڈھیر ہو جاتی۔

"اور یہ۔۔۔ یہ کون حفظ ہے جسکو تمہارا انتظار ہے۔" انہوں نے حقارت سے کہا "تم اپنے معصومیت کے بادلے میں ایسی مکار دہن ہو کا کل جسکے لئے تین سیبیں سچی ہیں۔" وہ سنبھلنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن التمش اسے سانس تک درست کرنے کا موقع نہیں دے رہے تھے۔ وہ تو اپنے اندھیرے دل میں کئی شمعیں جلائے وہاں آئی تھی جسے التمش نے ایک ہی پھونک میں بجھا دیا۔

"بس، بس التمش صاحب۔" کا کل جو انکے الزام پر الزام ہے جارہی تھی انکے آخری جملے پر چراغ پا ہو گئی۔ "میں آپ کو اپنے کردار پر حملہ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔" اس نے جھنجھلا کر کہا۔

"کردار! اجازت!" وہ خطرے کی طرح اسکی جانب بڑھے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی مدافعت کرتی اسکی کلائی انکے ہاتھ میں تھی۔ ایک جھٹکے سے انہوں نے اسے اپنی طرف کھینچا اور اپنی باہنوں میں محصور کر لیا۔

"تم کردار کی بات کرتی ہو؟ کیا تمہارا خو بصورت جسم میری باہنوں کی حرارت سے موم نہیں بن جاتا؟" میں چاہتا تو تم سے کیا کچھ نہ وصول کر سکتا تھا خواہ مخواہ میں نے اپنی شرافت کا ثبوت دیا۔" انہوں نے ٹھوکر لگا کر اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔

"لگر میں جانتا کہ تم اتنی تجربہ کار ہو تو میں بھی تمہیں ایک اور خوبصورت تجربہ دے سکتا تھا پینا ڈرنا۔ اب بھی کوئی دیر نہیں ہوئی۔" اس بار انکا پینا ڈرنا کہنا گالی کی طرح لگا۔

انہوں نے اسکے دونوں ہاتھ پشت پر اپنے ایک ہاتھ سے جکڑ رکھے تھے دوسرے ہاتھ سے انہوں نے گردن سے اوپر اس کا چہرہ ایسے تھاما ہوا تھا کہ وہ جنبش بھی نہیں کر سکتی تھی۔ شدت تکلیف سے اس کا جسم کمان بنتا جا رہا تھا لیکن انہیں اس پر رحم نہیں آیا۔ رحم کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا کیونکہ اس وقت انکے ذہن کی بیجانی کیفیت نے انہیں اور بھی زیادہ غضبناک بنا دیا تھا انکی آنکھوں میں چنگاریاں سی بھر گئی تھیں۔ وہ کاکل کی بے چارگی کا بھرپور مزہ لے رہے تھے۔ وہ جتنا ان سے آزاد ہونے کی کوشش کرتی انکی گرفت اتنی ہی تنگ ہوتی جاتی۔ کشمکش نے اسے تھکا دیا اور التمش سے چھٹکارا پانے کی کوشش ایک ناکام تمنا بن کر رہ گئی۔

کاکل کی حالت اس وقت ایک محصور ہرن کی تھی جسکے فرار کا ہر راستہ مسدود تھا۔ قوی جب کمزور کو پوری طرح اپنے بس میں کر لیتا ہے تو احساس فتح کے بعد اس میں جذبہ ترحم جاگتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ کاکل کی خوفزدہ آنکھوں میں دیکھتے دیکھتے انکی آنکھوں سے بے رحمی اور درشتی کا فور ہونے لگی۔ اسکے جگہ ایک اور کیفیت نے جنم لیا جسے کوئی نام نہیں دیا جاسکتا تھا۔

اتنی وحشت، اتنی وحشت صدقہ اچھی آنکھوں کے
تم نہ ہرن ہو میں نہ شکاری دور اتنا کیوں بھاگو ہو

انہوں نے شعر کو زیر لب، شرکی طرح پڑھا۔ اور ان حیران خوفزدہ آنکھوں میں دیکھتے ہوئے انکے لب کاکل کے لبوں سے پیوست ہو گئے۔

خطرے سے فرار کا ہر راستہ جب مسدود ہو جاتا ہے تو انسان بے بسی سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ یہی حال اس وقت کا کل کا تھا۔ اس کا دل دھونکنی بن گیا تھا۔ اسکے بال و پر میں زخمی پرندے کا تشخ تھا جس پر اس کا اختیار نہیں تھا۔ لب مہر بند تھے اور روح زخمی۔ لیکن یہ کیفیت دیر تک قائم نہیں رہی۔ کیونکہ جو عمل سزا کے طور پر شروع ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ وار فنگی میں بدل گیا۔ التمش کے مشاق لب اب کا کل کی بند آنکھوں، اسکے رخسار اور گردن کا طواف کر رہے تھا اور کا کل ایک بار پھر انکی باہنوں میں خود کو محفوظ محسوس کرنے لگی تھی۔ سدا ان باہنوں میں رہنے کی تمنائے سراٹھایا تھا۔ التمش کی گرفت ڈھیلی ہونے پر بھی وہ وہیں تھی جہاں کئی بار اسنے تصور میں خود کو پایا تھا۔ اب انکے دل ایک ساتھ دھڑک رہے تھے۔ یکسانیت سے جیسے دو ساز جگل بندی میں ایک دوسرے کا ساتھ دے رہے ہوں۔

”دیکھ لیانا“۔ التمش کے ہونٹوں نے گویا کا کل کے لبوں سے سرگوشی کی۔

”کا کل فدا حسین میں اب بھی تم پر مکمل دسترس رکھتا ہوں۔ کیا مسیح یا حفیظ نے بھی کبھی تمہیں بے خودی کا ایسا حسین تجربہ دیا تھا؟“۔

التمش کے یہ الفاظ کا کل کے پندار پر کاری زخم کی طرح لگے۔ وہ ایسے جاگی جیسے کسی نے اونچی پہاڑی سے اسے دھکا لگا دیا ہو۔ اسے انکی گرفت سے نکلنے کی زحمت نہیں کرنی پڑی کیونکہ انہوں نے خود اسے پرے ہٹا دیا تھا۔ انتہائی غصے کے عالم میں کا کل نے ہاتھ اٹھایا جو زوردار طمانچے کی شکل میں

التمش کے رخسار پر پڑا۔ اور وہ آندھی کی طرح دروازہ کھول کر نکل بھاگی۔
 وہ کیسے اس مغرور شخص کو باور کراتی کہ ان کے علاوہ کبھی کسی نے
 اسے چھونے کی جرات نہیں کی تھی۔ اور خود اسے کیا ہو گیا تھا؟ التمش کے
 سنگین الزامات کے باوجود ایک ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح اس نے خود کو انہیں
 سونپ دیا تھا۔ کیوں اسے ان پر بھروسہ تھا کہ وہ اسکی ناموس کو خجل نہیں
 کریں گے۔ انہوں نے تو کبھی اسے کوئی تیقن نہیں دیا تھا۔ پھر بھی کیوں انکی
 شخصیت نے کہرے کی طرح اسے اپنی پیٹ میں لے لیا تھا جہاں سوائے انکے
 اسے اور کچھ نظر نہیں آیا۔ احساس کا یہ غلبہ صرف التمش کے ساتھ کیوں جڑ
 ہوا تھا جبکہ وہ مسیح کے جذبات سے بالکل بے بہرہ تھی جنہیں التمش کی نظروں
 نے تاڑ لیا تھا۔ التمش کے توجہ دلانے کے بعد اسے ہر وہ موقعہ یاد آ رہا تھا جب
 مسیح کی نظریں بے لگام ہوتے ہوتے رک جاتیں تھیں۔ اسکی دمسازی جسے
 اس نے محض انس سمجھا تھا دراصل مسیح کی شریف النفسی کے لئے ایک امتحان
 تھا۔ وہ نادانستہ ہی مسیح کے ذہنی سکون کی بربادی کی ذمہ دار بن گئی تھی۔
 لیکن التمش کا یہ الزام سراسر جھوٹ تھا کہ وہ مسیح کو انکی جائیداد کا سا جھے دار
 سمجھتی تھی۔

بغرض محال جو کچھ التمش نے کہا ہو سچ بھی تھا تو اس سے انکا کیا تعلق
 تھا وہ انکے پاس نوکری کرنے آئی تھی غلامی نہیں۔ آخر وہ اپنے آپ کو سمجھتے
 کیا تھے! لیکن یہاں وہ خود ان سے آنکھ نہیں ملا سکتی تھی۔ اسکی جو درگت بنی
 اسکی ذمہ دار وہ خود تھی۔۔۔ التمش نے اسے کافی موقعہ دیا تھا

کوٹھی کا پر سکون ماحول میدان کارزار بن گیا تھا۔ لیکن جنگ یہاں فریقین کے مابین نہیں تھی۔ افراد خود اپنے آپ سے برسپیکار تھے۔ کوٹھی میں بس ایک ہی خوش دل و بے فکر جوڑا تھا، وہ تھے فدا حسین اور حور بانو جنہوں نے زندگی کے ضمیمے میں اپنے لئے خوشیاں فراہم کی تھیں۔

کاکل اپنے باپ کی نئی حاصل شدہ مطمئن زندگی سے خوش تھی۔ وہ اسے ساتھ لیجانا چاہتے تھے اور پریشان کن موقع تھا بھی ایسا ہی کہ اگر وہ انکے ساتھ واپس چلی جاتی تو چند ہی دنوں میں کوٹھی، اسکے مسائل اور وہاں کے باسی اسکے لئے قصہ پارسیہ بن جاتے۔ لیکن اب اسے اپنی جنگ آپ لڑنے کی عادت ہو گئی تھی دوسرے، وہ اپنے والد کی مسرور و شاداں زندگی میں ایک نیا عنصر بن کر تھلکہ نہیں مچانا چاہتی تھی۔ حالانکہ حور بانو نے بھی اسے خلوص دل سے ساتھ چلنے کی دعوت دی تھی۔ اسکے لئے یہی کافی تھا کہ اسکے والد اب طفیلی زندگی نہیں گزار رہے تھے۔ اب وہ خود ایک سایہ دار درخت تھے جو کسی اور کا سہارا بن سکتے تھے۔

کوٹھی کے بظاہر خاموش اور گہمیر ماحول کے بارے میں کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس سکون کے پچھے کتنے وبال اٹھ رہے ہونگے۔

التمش نے ہمنٹ راو کو بلایا تھا کہ اپنے والد کی وصیت پر نظر ثانی کریں انکی انصاف پسند طبیعت ہر گز مسیح کا حق مارنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ حفیظ کا خط ایک معمر بنا ہوا تھا اور انکے مہمان بھی وہیں سے آئے تھے۔

حالانکہ حور بانو کا رشتہ التمش سے، انکے تایا شاہ احمد حسین کے مرنے کے بعد
یوہنی سارہ گیا تھا لیکن انکی مہمان نوازی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی تھی۔
یہ تو اس کو ٹھی کا انداز ہی تھا لیکن حفیظ کا خط آنے کے بعد التمش کی نظر میں
فدا حسین اور حور بانو کا عندیہ مشکوک ہو گیا تھا۔ انہیں شک ہو گیا تھا کہ
انکی آمد حفیظ ہی کے خط کی ایک کڑی تھی۔ غالباً وہ سمجھا: کھا کر کاکل کو ساتھ
لیجانے کے لئے ہی آئے تھے۔ اور انکا شبہ یقین میں اس وقت بدل گیا جب فدا
حسین نے خم ٹھوک کر کاکل کو ساتھ لیجانے والی بات چھیزی۔ سارے
مہرے اپنی جگہ بیٹھتے نظر آئے۔ حفیظ کے خط نے آکر انکے اور مسیح کے مابین
خطوط متوازی کو مثلث میں تبدیل کر دیا تھا۔ جس لڑکی نے انکے سرکش دل
پر قبضہ کر لیا تھا کیا وہ اتنی فلرٹ ہو سکتی تھی کہ ڈال ڈال پات پات اپنے
مداحوں کو نچاتی پھرے اور وہ بھی دولت کی خاطر، انہیں یقین ہی نہیں آرہا تھا
لیکن حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ ہر محال بات پر انہیں یقین کرنا پڑ رہا تھا
التمش نے حفیظ کے خط کا ذکر کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا اور فدا حسین سے
کہہ دیا اگر وہ اپنی بیٹی کو ساتھ لیجانا چاہیں تو انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔
التمش نے طے کر لیا تھا کہ سارے مسائل ایک ایک کر کے پٹائیئنگے
انہیں میٹنگ کے لئے گوا جانا تھا۔ لیکن انکے کہنے پر میٹنگ کو چند دنوں کے
لئے ملتوی کر دیا گیا تھا۔

ڈور آنے جو مسئلہ اٹھایا تھا اسکے خلاف انکے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا
خود مسیح بھی اس پر روشنی نہیں ڈال سکتا تھا۔ مگر مسیح تھا کہاں؟ کیا اسکی

اچانک غیر حاضری اس بات کا ثبوت نہیں تھی کہ اسکی غیر حاضری میں سارے مسائل طے ہو جائیں
 کیلی مسکراہٹ سے سوچا کہ کس طرح عرصہ تک انسان کے نفس کی
 خباثت کھل کر سامنے نہیں آتی انہیں افسوس تھا کہ اپنے بچپن کا ساتھی جسے وہ
 اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح جانتے تھے وقت آنے پر اتنا مختلف ثابت ہو سکتا
 تھا۔

التمش نے ہمنٹ راو کی موجودگی میں ڈورا کو بلوا بھیجا۔ ڈورا اب
 انکے گھر کی پرانی خادمہ نہیں بلکہ کسی فاتح کی طرح آکر ٹیبل کے سامنے کھڑی
 ہو گئی۔ آج اسکے انداز میں ایک اٹل پن تھا۔ ایک خود اعتمادی جو انسان کو
 اسکی کامیابی ہی عطاء کر سکتی ہے لسنے کڑھی ہوئی نئی چادر پہنی تھی تانبے اینگ
 شانوں پر سیاہ لٹیں پام کے پتوں میں لپی جھول رہی تھیں۔ آج اسے سوم کی
 ساتھ ٹوڈا بستی جانا تھا۔ اسے اب کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں تھی۔

”ڈورا“ ہمنٹ راو نے گلا صاف کر کے کہا۔ ”تم جانتی ہو کتنا بڑا
 الزام لگا رہی ہو بریگیڈیر بخت پر؟“

”ڈورا جھوٹا الجام نہیں لگاتا“۔ لسنے راست ہمنٹ راو کی آنکھوں میں
 دیکھ کر کہا۔ اسکے انداز میں غضب کی بغاوت تھی۔

”اگر یہ بات سچ ہے تو تم اتنے دن خاموش کیوں رہیں؟ اپنا حق کیوں
 نہیں مانگا؟“ ہمنٹ راو نے جرح کی
 ”کو نسا حک۔ ڈورا کو بڑا سرکار سب کچھ دیا۔“

”اگر یہ بات تھی تو تم نے اب یہ بتانا کیوں ضروری سمجھا؟“۔

”جبروری ہو گیا۔“ ڈورانے زور دیکر کہا ”مسیح بی بی کو پیار کرتا وہ اس سے سادی نہیں بناتا کیونکہ بی بی مسلمان ہے۔ ہم کو بولنا پڑا مسیح بھی مسلمان ہے۔“ اپنی حد تک ڈورانے بات ختم کر دی۔

ہمنٹ راو نے التمش کی طرف دیکھا۔ انکا صاف مطلب تھا کہ ڈورا نے اپنی اولاد کی خاطر اپنا راز فاش کیا تھا ورنہ کوئی عورت اپنے ناجائز تعلقات یوں مشہر نہیں کرتی۔

”تم جاسکتی ہو ڈورا“۔ التمش ساری کاروائی خاموش بیٹھے سنتے رہے ڈورا اپنے عظیم جسنے کے ساتھ جانے کے لئے پلٹی لیکن اسی وقت دروازہ کھلا اور مسیح فادرینے ڈکٹ کے ساتھ داخل ہوا۔ مسیح کے سستے ہوئے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ زبردست ذہنی بحران کا شکار تھا۔ فادرینے ڈکٹ کو دیکھا تو ڈورا کسی ستون کی طرح ساکت کھڑی ہو گئی۔ اس نے جھک کر انکے ہاتھ کو بوسہ دینا چاہا لیکن فادر نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ اس سے خفا تھے۔

”ڈورا آج تم نے عیسائیوں کے نام پر کلنک لگا دیا“۔ فادر نے کہا۔
انکی غیر متوقع آمد پر التمش اور ہمنٹ راو تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے
یہیل کے پاس کرسیوں کی کمی تھی۔ وہ سب مسیح سمیت صوفوں پر بیٹھ گئے
مسیح کے چہرے کی رنگت بتاتی تھی کہ اس نے ڈاکٹر کی صلاح کے خلاف خود
کو بہت تھکا دیا تھا۔ سر کے زخم پر بندھی پٹی پر خون کا تازہ داغ تھا۔
ڈورا جانے لگی۔ وہاں اسکا کام ختم ہو چکا تھا۔

"نہیں آئی۔ ٹھیرو"۔ مسیح نے کہا۔
 ڈور اتد بذب میں رک گئی۔

"آئی مجھے معاف کرنا"۔ مسیح نے بڑے اعتماد سے کہنا شروع کیا۔
 "تمہاری ضد کی کہانی ایک ماں کی ضد کی کہانی ہے۔ تم شروع ہی سے نہیں
 چاہتی تھیں کہ میں پادری بنوں۔ لیکن تم اس حد تک بڑھ جاؤ گی کہ مجھے
 مسلمان ثابت کرنے کے لئے اختر بخت کا ناجائز بیٹا بنادو گی، میرے وہم
 و گمان میں بھی نہیں تھا۔"

"مسیح تو کیا بولتا ہے۔ ڈور اتیرا ماں ہے"۔ ڈور انے کچھ کہنے کی
 کوشش کی لیکن مسیح نے اسے ہاتھ سے روک دیا۔

"نہیں آئی مجھے کہنے دو۔ تم نے اسی ہاتھ کو کاٹنے کی کوشش کی جس
 نے تمہیں اور مجھے سہارا دیا۔" مسیح نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا جیسے
 اسے چکر آگئے ہوں۔ التمش نے ٹھنڈے پانی کا گلاس مسیح کے لبوں سے لگا دیا
 وہ بھی سچائی جاننے کے لئے بے چین تھے لیکن مسیح کے بیمار چہرے اور کلپتے
 ہوئے ہاتھوں کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ انہوں نے مسیح کا ہاتھ تھپتھا کر اسے
 آرام کرنے کے لئے کہا۔

"نہیں تامل مجھے کہنے دو۔" مسیح آگے بڑھا۔ "۔۔۔۔۔ میری غیرت نے
 گوارا نہیں کیا۔ میں سچائی جاننا چاہتا تھا۔ میں نے مقدس باپ فادر پینے
 ڈکٹ کا دامن تھاما۔ اور آئی اب مجھے تمہیں ماں کہتے شرم آتی ہے"۔ مسیح
 نڈھال ہو گیا۔

ہنسنت راو، التمش اور فادر پینے ڈکٹ مسیح کی باتوں کو غور سے سن رہے تھے۔ ادھر ڈوراکے لئے فرار کا راستہ بند تھا۔ جھوٹ کھلنے پر اسکی گردن شرم سے جھکی جا رہی تھی۔ اسکی آنکھوں کی وہ گستاخ چمک جو وہ لائبریری میں ساتھ لائی تھی اب مفقود تھی۔

”دو دن پہلے مسیح میرے پاس آیا۔“ فادر نے تفصیل بتائی۔ ”اے اپنی ماں کے بیان پر شک تھا۔ وہ چاہتا تو بڑی آسانی سے اس جھوٹ کا فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ اتنی بڑی جائیداد کا حصہ دار بن کر۔ وہ لڑکی اے حاصل ہو سکتی تھی جس سے پیار کا اقرار اسنے ایک سے زیادہ بار کنفیشن باکس میں کیا تھا۔ میں اسکا گواہ ہوں۔“

”فادر!“ مسیح نے بیچارگی سے فادر کو ٹوکا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسکا راز عام ہو اور کاکل کی جگہ ہنسائی ہو۔ یہ بات عیسائی اصولوں کے خلاف تھی

”میں جانتا ہوں کہ یہ بات ٹھیک نہیں ہے کہ میں تمہارا راز کھولوں۔“ فادر نے کہا ”لیکن ایک تباہ کن جھوٹ کا پردہ فاش کرنے کے لئے اس سے متعلق سچ کو عام کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔“ فادر نے کچھ توقف سے بات آگے بڑھائی۔

”مسیح ایک انگریز ڈاکٹر کا لڑکا ہے۔“ جو آج سے تیس سال پہلے مشن میں کام کرنے کے لئے آیا تھا۔ میں اسکا نام نہیں بتاؤنگا۔ میں نے ہی سفارش کر کے بیگم کی خدمت کے لئے مشن سے ڈوراکو بھیجوا یا تھا۔ کیونکہ وہ مستعد اور اچھا کام کرنے والی تھی۔ ڈوراجب بیگم کی خدمات کے لئے آئی تھی تبھی

ماں بننے والی تھی لیکن یہ بات کوئی نہیں جانتا تھا۔ صرف اسکا دوست سوم جانتا تھا جو ڈورا کو عیسائی ہونے پر بھی اپنانے تیار تھا۔ یا پھر یہ بات میرے اپنے علم میں تھی۔ فادر نے اپنی بات ختم کی۔ لائبریری میں ایسی خاموشی تھی جیسے سب کو سانپ نے سونگھ لیا ہو۔ ڈورا وہیں فرش پر گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی۔

”اب کہو آئی جو کچھ فادر نے کہا وہ سچ ہے یا نہیں؟“ مسیح نے ماں سے پوچھا۔

ڈورانے جب سراٹھایا تو اسکی آنکھوں میں پسائیت کے آنسو تھے۔ وہ فادر کے آگے گھٹنوں کے بل جھک گئی۔

”گاڈ اور ہولی گھوسٹ ڈورا کو معافی نہیں دیگا۔ مگر فادر آپ میرے کو معاف کر دے۔“ فادر نے ڈورا کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور وہ کھڑی ہو گئی۔ اس میں کسی سے آنکھیں چار کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ ممتا سے مجبور ہو کر جو جھوٹ اس نے کڑھاتا تھا اسکا پردہ یوں فاش ہو جایگا اور وہ بھی بیٹے کے ہاتھوں اس نے کبھی سوچا نہ تھا۔ وہ ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح لڑکھڑاتی لائبریری سے باہر نکل گئی۔

فادر اور مسیح کے ساتھ ہمنمت راو بھی اپنی فائلیں سمیٹے کھڑے ہو گئے معاملے کی تہ کو پہنچ کر وہ بھی اب مطمئن تھے ورنہ اختر بخت کی وصیت بے معنی ہو کر رہ جاتی اور انہیں سرے سے التمش کی جائیداد کا قانونی تجزیہ کرنا پڑتا۔

فادر کو خدا حافظ کہنے کے بعد جب التمش واپس لوٹے تو انہیں تنہائی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اختر بخت پر جو الزام ڈورانے لگایا تھا وہ التمش کے لئے ایک ناقابل برداشت دھکا تھا جس نے انکے ذہنی توازن کو بھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

جب وہ لائبریری میں واپس آئے تو مسیح بھی انکے ساتھ اندر چلا آیا۔ کچھ دیر تک وہ دونوں بالکل چپ چاپ بیٹھے رہے۔ التمش نے سگریٹ نکالا تو مسیح نے اٹھکر لائٹر سے اسے جلا دیا۔

وہ خاموشی بڑی بوجھل خاموشی تھی۔ شاید دونوں ہی کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن کہہ نہیں پا رہے تھے۔ آخر التمش اٹھے اور اپنے ٹیبل پر دراز سے کچھ نکال کر احتیاط سے مسیح کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ کوئیل اور کاکل کانوٹ تھا۔ کوئیل پریس ہو کر اور بھی خوبصورت لگتی تھی۔

مسیح اس کوئیل کو جانتا تھا جو غنچہ بننے سے پہلے ہی سوکھ گئی تھی۔ اس نے کاکل کانوٹ پڑھا۔ ایک اداس مسکراہٹ اسکے لبوں پر آئی۔ اس نے کوئیل مسل کر نوٹ چاک کر دیا۔

”اب اسکی ضرورت نہیں تماش۔ مجھے اپنا راستہ مل گیا ہے۔“ اسنے کہا ”میں جا رہا ہوں۔ لیکن جانے سے پہلے تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“ اسنے کچھ توقف کیا پھر بولا۔ ”وہ ہستی جسکا نام کاکل ہے۔ ہے ہی ایسی کہ کوئی اسے پیار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بھلے بھی کیا۔ اور جانتا ہوں تم نے بھی کیا۔ لیکن تمہارے اور میرے پیار میں فرق رہا۔ اس سے میرا پیار ایک کشمکش اور

تمہارا جیتی ہوئی بازی۔ کیونکہ اسنے بھی صرف تمہیں چاہا۔ جبکہ مجھے ایک اچھا دوست سمجھا۔ ہاں۔ میں نے کنفیشن باکس میں کئی بار کاکل سے محبت کا اقرار کیا ہے میں سخت آزمائش کے دور سے گذرا ہوں۔ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوئی اور صورت تھی بھی نہیں۔ اعتراف گناہ احساس گناہ کی شدت کو کم کر دیتا ہے۔

کاکل سے محبت کو تم گناہ سمجھتے تھے؟۔ التمش نے راکھ دان میں سگریٹ جھٹکتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔ تم سے بے وفائی میرا گناہ تھا۔ اپنے چنے ہوئے رستے سے بھٹک جانا گناہ تھا۔ تمہارے حق پر نظر ڈالنا گناہ تھا۔ کاکل شروع ہی سے تمہاری تھی تماش۔“

اب التمش اس سے کیا کہتے کہ صرف وہی نہیں کاکل کا دعویٰ دار کوئی اور بھی تھا۔ انہوں نے ٹیبل کا خانہ کھینچا اور اس میں سے حفیظ کا خط نکال کر مسیح کے حوالے کیا۔

مسیح جیسے جیسے وہ خط پڑھتا گیا اسکی تیوریاں چڑھتی گئیں۔

”اور تم نے اس خط پر یقین بھی کر لیا۔؟“۔ مسیح نے حیرت سے التمش سے پوچھا۔ ”میں کمیے یقین کر لوں تماش کہ تم اتنے سادہ لوح ہو یا پھر کاکل کی محبت نے تمہیں اتنا حساس بنا دیا ہے۔“

”التمش اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتے رہے۔“

مسیح حفیظ کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا۔ کاکل نے اپنی پھلی

ساری زندگی اسکے سامنے کھول کر رکھ دی تھی۔

”تمہیں زندگی میں کبھی کسی نے ٹھکرایا نہیں! ورنہ تم اس خط کا مطلب فوراً سمجھ جاتے کہ یہ خط حفیظ کی زخمی انا کی چیخ ہے۔“ التمش سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

”تامش اب تم اقرار کر لو کہ تم کاکل کو پیار کرتے ہو۔ یہ اسکا پیار ہی تھا کہ تم حسد کی آگ میں جلتے ہوئے اس مہودہ خط کا اعتبار کر بیٹھے۔“ مسیح نے بات ختم کی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”کہاں جا رہے ہو مسیح۔ کچھ دیر اور رک جاؤ۔“ مسیح کی باتوں نے التمش کے دل پر بوجھ سا ہٹا دیا تھا۔

”نہیں تامش مجھے جانا ہو گا۔ چرچ میں سب میرے منتظر ہونگے۔“

”تمہارا مطلب ہے تم ہمیشہ کے لئے چلے جاؤ گے؟“

”کیا تمہیں اس بات کی خوشی نہیں ہے کم از کم یہ فیصلہ میں نے خود کیا ہے۔“

مسیح نے مسکرا کر کہا ”ورنہ دوسرے ہی میرے لئے فیصلے کیا کرتے تھے۔“

التمش کو اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ انہوں نے اٹھ کر گرم

جوشی سے مسیح سے ہاتھ ملایا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ رکا اور بولا۔

”Wish you all the best“ تامش۔ ”اور باہر نکل گیا۔“

کاکل کے ذہن کو گویا چیونٹیاں چاٹ رہی تھیں۔ التمش سے آغری ملاقات پر اسکی برداشت کا پیالہ چھلک گیا تھا وہ اب اس کو ٹھہی میں پل بھر نہیں رہنا چاہتی تھی کیا پایا تھا اسنے وہاں آکر۔ دل بھی کھویا دل کا سکون بھی۔ اسکے باوجود وہ التمش سے نفرت نہیں کر پاتی تھی۔ جس سے پیار کیا اس سے نفرت کیسی۔ لیکن پیار کرنے والوں کو پیار کی عزت بھی رکھنی پڑتی ہے۔ اسکی خیریت اسی میں تھی کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کو ٹھہی چھوڑ دے۔ التمش کو وہ ہرگز اس خوش فہمی میں رہنے دینا نہیں چاہتی تھی کہ انکی حقارت کے باوجود وہ پامال بنی وہیں پڑی رہے۔ وہ تھک چکی تھی۔ اسے اب اس بات کی بھی پرواہ نہیں تھی کہ التمش کی رائے اسکے بارے میں بدلتی ہے یا نہیں۔ وہ خوشگوار لمحے جو اس نے التمش کے ساتھ گزارے بیشک اسکی متاع دل تھی جسے کوئی نہیں مٹا سکتا تھا۔

اسنے عزم مصمم کے ساتھ سیردھیاں طے کیں اور لائبریری میں پہنچی۔ لائبریری جو چند گھنٹوں پہلے میدان کارزار بنی ہوئی تھی۔ اس وقت بالکل پرسکون تھی جیسے اسکے درو دیوار نے حق و باطل جرم اور انصاف کے وہ منظر دیکھے ہی نہ ہوں۔ جو کچھ اس چار دیواری میں ہوا کاکل کے فرشتوں کو بھی اسکی خبر نہیں تھی۔

پتوں والی ڈائری ہمیشہ ٹیبل کے اوپر والے خانے میں رکھی ہوتی تھی اس نے ڈائری کھولی۔

”پیر پچا۔۔۔ پاو لو۔۔۔ پیریو۔“ اسکی انگلی مس پیریو کے پتے پر رک

گئی۔ وہی ایک لیڈی تھیں جنہیں وہ شہزاد اور زینو کی ذمہ داری سونپ سکتی تھی۔ کیونکہ ایک بار التمش نے بڑے بھروسے سے انہیں بلانے کی بات کی تھی۔ لسنے ٹائپ رائٹر پر کاغذ چڑھایا اور مس پیرو کے نام خط ٹائپ کیا۔

اس خط کا آج ہی جانا ضروری تھا۔ التمش نے مسیح کے بارے میں جو کچھ کہا ہو۔ وہ جانتی تھی کہ وہی اسکا سچا دوست تھا جس پر وہ بھروسہ کر سکتی تھی وہ مسیح سے خاص طور پر کہنا چاہتی تھی کہ اسکے جانے کے بعد التمش کو حفیظ کے بارے میں سب کچھ بتادے لیکن کچھ سوچ کر اپنا ارادہ بدل دیا۔ اگر وہ حفیظ کے بارے میں صداقت جان لیتے تو کیا فرق پڑتا۔ اس نے طے کیا کہ مسیح کو مس پیرو کا خط دیکر واپس ہو جائیگی۔

ڈوراکا صاف ستھرا گھر آج بکھر پڑا تھا۔ آج وہاں سوم کی موجودگی نے اسے بوکھلایا نہیں۔ وہ اسے کئی بار دیکھ چکی تھی۔

بی بی مریم کے مجسمے کے آگے رکھے گلدان خالی تھے آج ڈورانے ان میں پھول نہیں سجائے تھے۔ کاکل نے ماحول کے بو جھل پن کو محسوس کیا لیکن کچھ پوچھا نہیں کیونکہ وہ خود ایک تلاطم اپنے دل میں لیتے آئی تھی۔

”مسیح کہاں ہے؟“۔ لسنے سوم سے پوچھا کیونکہ ڈورانے اسکی طرف بالکل توجہ نہیں دی۔

”کیوں پوچھتا ہے بی بی؟“۔ سوم نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا

”ڈاک نکلنے سے پہلے مجھے یہ خط اسے دینا ہے۔“

”لاؤ مجھے دیدو“ سوم نے کاکل کے ہاتھ سے خط لے لیا۔ ”ہم ڈال دیگا“

”کیا بات ہے سوم۔ ڈورا کچھ بولتی کیوں نہیں؟“۔ کاکل نے ڈورا کو ٹرنک میں کپڑے رکھتے دیکھ کر پوچھا۔

”ڈورا ٹوڈا ہے بی بی۔“ سوم کے لہجے میں غرور تھا۔ وہ اردو اچھی خاصی بول لیتا تھا۔ ”ڈورا اپنے کٹم واپس جا رہا ہے۔“

”کب واپس آو گی ڈورا؟“۔ کاکل نے پوچھا۔

ڈورا نے اسکی بات سنی اور نفی میں سر ہلا دیا۔ اسکی آنکھیں شکست خوردہ تھیں۔ اپنے ذیل ڈول کے باوجود پہلی بار وہ کاکل کو بوڑھی لگی۔ وہ ڈورا سے پوچھنا چاہتی تھی کیا اس نے الشمس سے اجازت لے لی تھی۔ لیکن جب وہ خود ہی کوٹھی کو خیر باد کہہ رہی تھی تو اسے کیا کوئی رہے یا جائے۔ اس نے سوچا مسیح کے انتظار میں رک جائے لیکن کوارٹر کے غیر دوستانہ ماحول میں اسکا رکنا مناسب نہیں تھا۔

ڈورا جا رہی تھی۔ بسنے اپنی جڑیں کبھی نیلگری کی ان اودی اودی پہاڑیوں سے نہیں اکھیری تھیں۔ بسنے وہاں جنم لیا تھا، اسکا سب کچھ وہیں تھا۔ اسکا اعتقاد، اسکے ریت رواج کنکو دور اور مٹی در، وہ نصف دائروی شکل کے جھونپڑے۔ وہ سب کچھ اپنے تھے جہاں جانے کا فیصلہ اس نے کر لیا تھا۔

سوما اب بھی اسکا وفادار تھا۔

لیکن مسیح کہاں تھا۔ وہ اس سے ملے بغیر اوٹی کیسے چھوڑ سکتی تھی؟

وہ اسی ادھیڑ بن میں کوٹھی کی طرف واپس ہو رہی تھی کہ خود مسیح عین اسکے سامنے اکھڑا ہوا۔

”مسیح! اسنے خوشی سے کہا۔

”میں تمہاری ہی طرف آرہا تھا۔“ مسیح نے کہا۔ اسکی میلی سنجیدہ

آنکھیں آج اور بھی زیادہ بردبار لگ رہی تھیں ان میں ایک طمانیت تھی جسے کوئی بہت ہی مشکل عقدے کا حل نکلانے کے بعد محسوس کرتا ہے۔

”باغات میں چلوگی میرے ساتھ۔“ مسیح نے کہا اور وہ ٹہلتے ہوئے

باغات میں نکل آئے۔ کتنے ہی دلچسپ اور ہم آہنگ لمحے گزارے تھے انہوں

نے وہاں۔ اسے مسیح کی خاموش دم سازی پر دنیا بھر کا بھروسہ تھا۔ جسے التمش

گھناؤنا رنگ دے رہے تھے۔

”نہیں کا کل، التمش بالکل ٹھیک کہہ رہے تھے۔“ مسیح نے اسکے

مقابل ہوتے ہوئے کہا ”میں نے کبھی تمہیں محض دوست نہیں سمجھا۔ تم پہلے

ہی دن سے میری ساری ہستی پر چھانے لگی تھیں۔“

”مسیح! کا کل نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”ہاں اب میں تم سے سب کچھ کہہ سکتا ہوں۔ ہر وہ سچائی جس نے

پادری بننے کے میرے ارادے کو ڈنگا دیا تھا۔ میں بزدل تھا کا کل جو کبھی تم

پر اپنی محبت کا اظہار نہ کر سکا۔ لیکن اب میں بزدل نہیں ہوں۔ میرے دماغ

میں سے وہ دھند مٹ چکی ہے اور اپنا راستہ۔ صحیح راستہ مجھے صاف نظر آرہا ہے

اس وجہ سے نہیں کہ میں تمہیں اپنا نہیں سکتا بلکہ اس تمنا کی پابجائی میں جو

لڑکپن ہی سے میرے دل میں گھر کر چکی تھی۔

کا کل اسے کیا جواب دیتی جو اسے بہت عزیز تھا۔ اسکے احسان کا شکریہ

کس طرح ادا کرتی جو مسیح نے اس پر اپنی محبت کا اظہار نہ کر کے کیا تھا۔ ورنہ وہ اپنے وہاں قیام کے دوران ایک پر خلوص دوست سے محروم ہو جاتی۔

"کب جا رہے ہو مسیح؟" اس نے بھرائی آواز میں پوچھا۔

"کبھی کے چلا گیا ہوتا۔ لیکن تم سے ملے بغیر کیسے جاتا۔"

"میں بھی تمہیں دیکھے، تم سے ملے بغیر کیسے جاسکتی تھی!" کا کل بولی۔

"تو کیا تم بھی جا رہی ہو؟" مسیح نے حیرت سے پوچھا۔

"جا رہی ہوں مسیح۔ یہی میرے لئے بہتر ہے۔"

"اور تاش۔ انکا کیا ہوگا؟"

"تاش کو کسی کی ضرورت نہیں مسیح۔ پتھروں پر پھول نہیں اگا کرتے" ماضی قریب میں لائبریری میں وقوع پذیر ہوئے سین سے ناواقف کا کل نے کہا۔

"کا کل میری بات سنو۔ رک جاؤ، تاش کے واپس آنے تک رک

جاؤ۔"

"تو کیا تاش بنگلور چلے گئے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔ "شاید یہ

پہلا موقع تھا کہ التمش اسے بتائے بغیر میٹنگ میں چلے گئے تھے۔ انکا یہ عمل

کا کل کو بہت کچھ کہہ گیا کہ اسکا کوٹھی چھوڑ جانے کا فیصلہ صحیح تھا۔

"چند دن اور رک جاؤ کا کل"۔ مسیح نے زور دیا۔

"نہیں مسیح اب تمہارے جانے کے بعد اور بھی تنہا ہو جاؤ گی"۔ اس

نے قطعیت سے کہا۔

”God Bless You“ کا کل۔“ مسیح جانے کے لئے تیار ہوا۔

”پھر کبھی نہیں ملو گے؟“۔ کا کل نے پوچھا۔

”انسان چھوڑی ہوئی منزل پر کوئی کھوئی ہوئی چیز ڈھونڈنے جاتا ہے۔

میں نے کچھ کھویا نہیں کا کل۔ میں نے جو کچھ چاہا تھا سب کچھ پایا۔ اب مجھے نئی منزلوں کی طرف بڑھنا ہے۔“

کا کل نے اسکی طرف ہاتھ بڑھایا جسے مسیح نے گرم جوشی سے تھام لیا۔

وہ دیر تک ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ جذبات جن میں کہیں بھی دوستی اور خیر سگالی کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ کا کل کی آنکھیں لبریز تھیں۔

مسیح نے ہاتھ چھوڑا اور پلٹ کر پگڈنڈیوں پر ہو لیا وہ اسکی چال کی

استقامت، ہلکی ہوا میں اڑتے اسکے بال اور چوڑے شانوں کو دور تک دیکھتی

رہی۔

مس پرورد آپکی تھی۔

کاکل کے والد اور حور بانو جاچکے تھے جاتے ہوئے حور بانو نے بہ اصرار اسے ساتھ چلنے کے لئے کہا لیکن کاکل نے تو طے کر لیا تھا کہ اپنی جنگ خود لڑیگی۔ جب وہ ٹیکسی میں بیٹھنے لگے تو شہزاد اور زینو مصر ہو گئے کہ فواد حسین کو چھوڑ جائیں۔ اب انہیں پتہ چل گیا تھا کہ دنیا میں کبھی جڑواں نہیں تنہا بچے بھی آتے ہیں۔ اور تنہا چلے بھی جاتے ہیں۔

مس پرورد ایک خوشگوار عمر رسیدہ خاتون تھیں۔ جنہیں برسوں کا تجربہ تھا۔ انہیں بچوں کو اپنا کر دیدہ بنالینا آتا تھا۔ شہزاد اور زینو نے انہیں بھی حرفہ مکرر کی طرح قبول کر لیا تھا۔ کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے کہ کاکل ہمیشہ کے لئے انہیں چھوڑ کر جا رہی ہے۔ انہیں چھوڑنا خود کاکل کے لئے سوہان روح تھا لیکن زندگی میں کبھی تکلیف دہ فیصلے کرنے ہی پڑتے ہیں۔ اسنے مس پرورد کو بچوں کے بارے میں ہر چھوٹی بڑی تفصیل بتائی۔ انکے عادات و اطوار سے واقف کروایا اور ایسا کرتے کئی بار اسکی آنکھیں ڈبڈبائیں۔

"تم بچوں سے بہت پیار کرتی ہو۔ کیوں جا رہی ہو۔" مس پرورد نے ہمدردی سے پوچھا۔

"مجھے دوسری نوکری مل گئی ہے۔" وہ انہیں سچ کیوں بتاتی۔ اسکے کھوئے ہوئے انداز سے مس پرورد کو اسکی بات کا یقین نہیں آیا۔ وہ جہاندیدہ تھیں پھر بھی انہوں نے زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔

کاکل نے حسب معمول بچوں کو کھانا کھلایا انکے لباس تبدیل کئے اور

”شب بخیر“ کہہ کر پیار کیا۔ حسب معمول دونوں نے اسکے گلے میں باہیں حمائل کر کے اسکے پیار کا جواب دیا۔ کمرے میں واپس آکر لسنے اپنا مختصر سامان پیک کیا جسمیں مسیح کا دیا ہوا کیو پڈ کا مجسمہ بھی تھا۔ محبت کے اس دیوتا نے اپنے سارے ہی تیر اسکے دل میں پیوست کر دیئے تھے اور اب مسکرا رہا تھا۔

صبح سویرے اس نے فون کر کے ٹیکسی منگائی۔ وہ جانے سے پہلے شہزاد اور زینو کو گلے لگانا چاہتی تھی لیکن ڈر گئی کہ کہیں اسکا جانے کا ارادہ نہ بدل جائے۔

اس نے مس پریرو کو خدا حافظ کہا اور ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ اسے چھک چھک ٹرین سے ہی میٹو پلائم جانا تھا۔

ٹیکسی سے وقت کم لگتا لیکن وہ زیادہ مہنگی ہوتی۔ اسے میور جانا تھا جسے لسنے دیکھا بھالا تھا۔ وہ اسی ہوٹل میں ٹھہر سکتی تھی جہاں وہ دہرے کے موقع پر الٹمش اور بچوں کے ساتھ ٹھہری تھی۔ وہ ہوٹل گو مہنگی تھی لیکن وہاں ایک اکیلی لڑکی کے لئے خطرہ نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ کوشش کرنے پر میور میں اسے کوئی نوکری مل سکتی تھی۔

وہ صبح غیر معمولی خوشگوار تھی جبکہ اسکا دل رو رہا تھا۔ وہ سب کچھ جو وہ اوٹی میں چھوڑ آئی تھی۔ اسکے قدم بہ قدم چل رہا تھا۔ کھٹا کھٹ، کھٹا کھٹ ٹرین آگے بڑھتی رہی اور اسکے دل میں ایک ایک تصویر ابھرتی رہی۔ ہرے بھرے چائے کے باغاں۔ شہزاد، زینو مسیح۔ ایک چہرہ اور بھی تھا جو کبھی اتنا قریب آجاتا کہ وہ اسکے تنفس کی گرمی محسوس کرتی اور کبھی اتنی دور چلا جاتا

کہ اسکی پہنچ سے باہر ہو جاتا۔

ریلوے ٹریک کے ساتھ ساتھ چلتے منگلے سیاحوں کی کاریں تیز رفتا سے گزرتی رہیں۔ بادلوں کی ٹولیاں اٹھکھلیاں کرتی رہیں، یو کلبٹس کی مہک نے بھی اسے روکا لیکن وہ ان سب سے دامن چھڑا کر چلی آئی تھی ایک نظر بھ ان پر نہیں ڈالی۔ دل کی ویرانیوں کا بھرم بھی تو اسے رکھنا تھا!

ٹرین رکی۔ وہ خاموشی سے اپنا سوٹ کیس لئے میٹو پلاٹم کے چھو۔ سے اسٹیشن پر اتر آئی۔ سوٹ کیس لینے کے لئے ایک قلی آگے بڑھا لیکن اس نے انکار کر دیا اور چل پڑی۔

کچھ دیر بعد ایک اور ہاتھ بڑھا جس نے سوٹ کیس اسکے ہاتھ سے۔ ہی لیا۔ سنے گھبرا کر پچھے دیکھا۔ وہ وہی چہرہ تھا جس نے راستہ بھر اسکا سامنا نہیں چھوڑا تھا۔ ہونٹوں پر وہی پاگل کر دینے والی مسکراہٹ اور آنکھوں میں ہزار محبت کے پیغام لئے اسے دیکھ رہا تھا کاکل کے لب کھلے لیکن آواز نہ ساتھ چھوڑ دیا۔

”چلو پیٹا ڈرنا۔ گھر چلو“۔ التمش نے اسکا ہاتھ پکڑ کر کہا۔